پی کے 713... ایمرجنسی لینڈنگ سے پہلے کپتان کے "آخری" الفاظ کیا تھے؟

اُردو ڈائجسٹ

جون ۲۰۲۰ء

www.urdudigest.pk urdudigest.pk

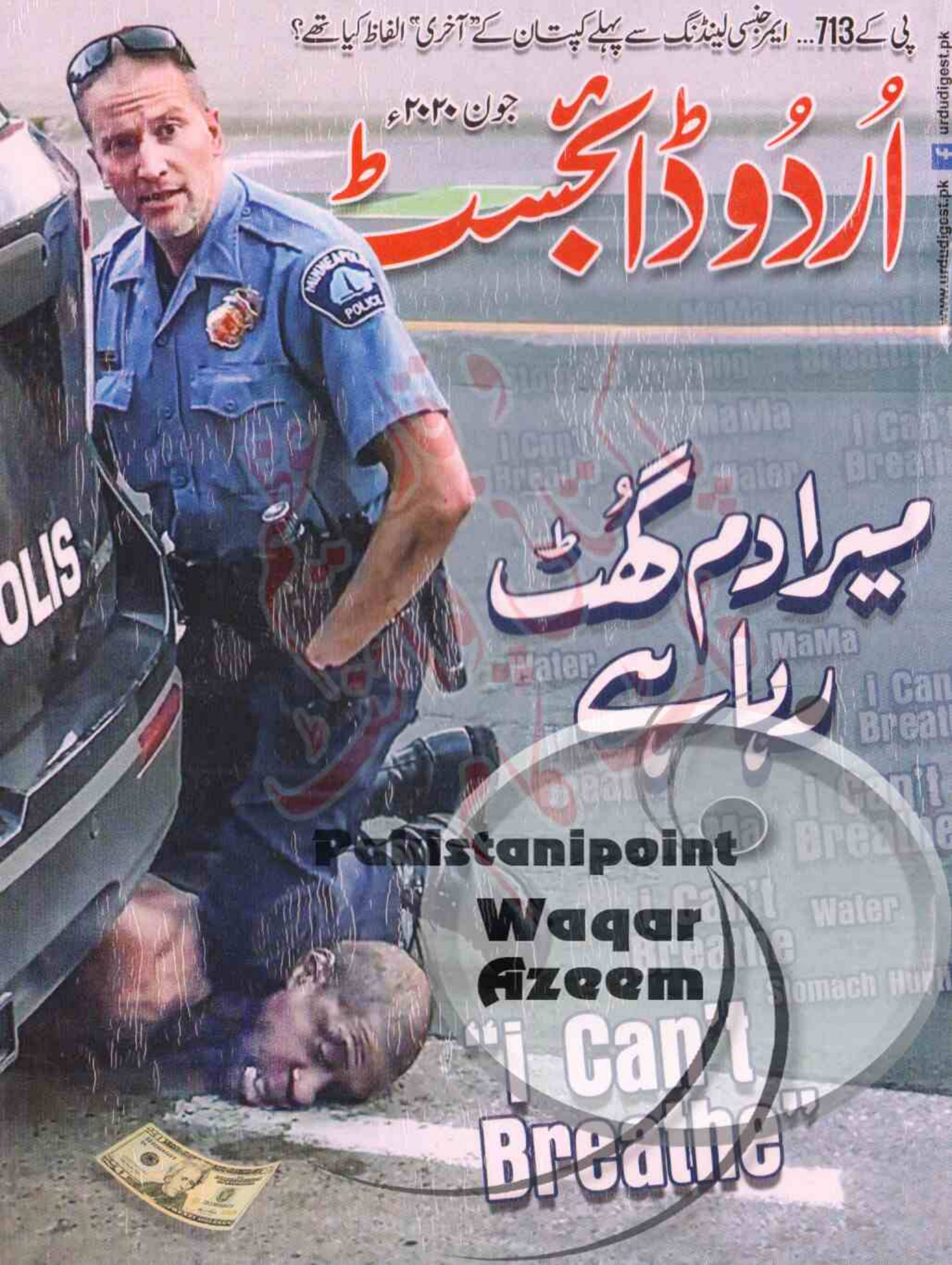

میرا دم گھٹ رہا ہے

Pakistanipoint

Waqar Azeem

"i Can't Breathe"

اُردو ڈائجسٹ

جون 2020ء
شوال المکرم 1441ھ
جلد نمبر 60 شمارہ نمبر 6

urdudigest.pk   www.urdudigest.pk

صدر مجلس: ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی
مدیر اعلیٰ: الطاف حسن قریشی
ایگزیکٹو ایڈیٹر: طیب اعجاز قریشی
اسسٹنٹ ایڈیٹر: عافیہ مقبول جہانگیر
مجلس تحریر: سیّد عاصم محمود، ڈاکٹر آصف محمود جاہ، سلمیٰ اعوان
مہتمم طباعت: فاروق اعجاز قریشی
انچارج کمیونیکیشن: افنان کامران قریشی
ڈیزائنر: کاشف شہزاد
کمپوزر: رانا محمد سلیم

مارکیٹنگ

ڈائریکٹر: ذکی اعجاز قریشی 0300-8460093

اشتہارات

advertisement@urdudigest.pk
منیجر ایڈورٹائزمنٹ: 0320-4437564
کاشرہ کرم: 0307-0060707

سالانہ خریداری 740 روپے کی بچت کے ساتھ

subscription@urdudigest.pk خریداری کے لیے رابطہ
فون: +92-42-35290707
پاکستان 2115 کے بجائے 1375 روپے میں
بیرون ملک ~~100~~ 80 امریکی ڈالر
اُردو ڈائجسٹ گھر بیٹھے حاصل کیجیے
اندرون و بیرون ملک کے خریدار اپنی رقم بذریعہ بینک ڈرافٹ درج ذیل اکاؤنٹ نمبر پر ارسال کریں

URDU DIGEST Current A/C No.
PK34 BPUN 6010 0527 0140 0011
Bank of Punjab (Samanabad, Lahore.)
Branch Code No. 110

ادارتی آفس

اپنی تحریریں اس پتے پر بھیجیں

G-III,325 جوہر ٹاؤن، لاہور
فون نمبر: +92-42-35290738 ◆ فیکس: +92-42-35290731
ای میل: editor@urdudigest.pk

قیمت: 130 روپے

طابع و ناشر الطاف حسن قریشی نے اردو ڈائجسٹ پرنٹرز 24۔ سرکلر روڈ سے چھپوا کر حسن آباد لاہور سے شائع کیا

بِل گیٹس...

یکتا سماجی راہنما یا مہا فراڈیا؟

فہرست

جون 2020ء

کچھ اپنی زبان میں
09 عدالت عظمیٰ کے گراں قدر ارشادات...

پاکستانیات
12 پی کے 713 کا سفر...
جب کپتان نے مسافروں کی ہر خواہش آخری سمجھ کر پوری کی

ہم کہاں کھڑے ہیں
25 عوامی طاقت کے سامنے بے بس ہوتی سپر پاور...

انکشافات
36 بل گیٹس... یکتا سماجی راہنما یا مہا فراڈیا؟...
لالچی انسان جس نے مکاری سے مالی فوائد حاصل کیے

اسلامی شخصیت
69 اندلس کا غیرت مند جرنیل...
ماضی میں مسلم سپر پاور کے اعلیٰ راہنما کا سبق آموز قصہ حیات

اسلامی معلومات
67 ہر وبا کی دوا... نماز...
یہی کلیہ ہمیں بحیثیت مسلمان ہر ڈپریشن سے بچاتا ہے

سفرنامہ
73 حصول علم کا سفر...
مشہور ادیب کے سنہرے دور کی انمول یادیں

خصوصی رپورٹ
95 اگر زندہ رہے...
وطن عزیز میں اولڈ ہومز کا ہونا باعث شرم ہے

رُوداد
81 زارا...
ایسی باہمت لڑکی جس نے پہاڑ جیسے مسائل بھی ہنس کر سہے

ڈائری
89 قرطبہ اور میرے شب و روز...
فرصت کے لمحات کو ترسنے والی مصنفہ جب بوکھلا گئیں

حیوانیات
110 انسانی صفات کا پرندہ... بوئر برڈ...
جس کی بے شمار عادات اشرف المخلوقات جیسی ہیں

افسانے/کہانیاں
105 شہر خرابات...
بڑے شہر نے جب ایک معصوم دیہاتی کو اپنا لیا

12 پی کے 713... کپتان کے "آخری" الفاظ کیا تھے؟

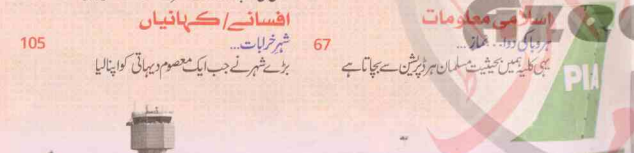

Pakistanipoint
Waqar Azeem

حریص... ایک خودمختار باپ کی دُوراندیشی نے اسے مشکوک بنا ڈالا 126
شہزادہ... کون کہتا ہے کہ احساسات صرف انسانوں میں ہوتے ہیں 137
میں شاعر تو نہیں... شوہر کے نظریاتی رویوں سے تنگ آئی ایک بیوی کا ماجرا 177

اُردو ادب

بھاگو کا "کونٹین"... طاعون کی وبا میں دوسروں کی جان بچاتے خاکروب کی کہانی 113
شرارت... اس راز سے کبھی پردہ نہ اُٹھ سکا کہ آخر تایا جی 'کون' تھے؟ 153

اخلاقیات

انسانیت کہاں ہے؟... بےکس و مجبور کا فائدہ اُٹھانے والے کیا اشرف المخلوقات ہیں 132

طنز و مزاح

میں ایک میاں ہوں... اپنے پیر پر کلہاڑی مارنے والے شوہر کی حالت کا قہقہہ بار تذکرہ 121
وہ جائیں ہمارے گھر سے... بِن بلائے مہمان وبالِ جاں بن جائیں تو میزبان کیا کرے 128

انشائیہ

گدھم جی پدھم جی کی خدمت میں... بحالتِ مجبوری لکھے گئے کچھ طنزیہ خطوط کے مسکراتے نشتر 169

ناقابلِ فراموش

بلی کا انتقام... ایسی دلخراش کہانی جو آپ کے رونگٹے کھڑے کر دے گی 140

تعلیم و تربیت

ڈیجیٹل دنیا... برائی اور اچھائی ہمارے اندر ہوتی ہے، بات انتخاب کی ہے 151

غذائیات

امرود کے چٹخارے... 161
سدابہار پھل کی لذت دار اور مزیدار معلومات

لمحۂ فکریہ

معاشرے کا ناسُور... 165
کیا ہم اپنی زندگیاں محض امرا کے پیچھے بھاگنے میں گزاریں گے

فکاہیہ

ہم فیس بُکیے ہوئے... 182
پرانے خیالات کی ایک لڑکی نے جب سوشل ہونا چاہا

مکمل ناول

عشق جنوں پیشہ... 201
روایتی دشمنیوں کے اسیر قبائل جب دوستی پر مجبور ہو گئے

گوشۂ خواتین

خریداری... عقل کی متقاضی... 215
دکاندار اور خریدار دونوں ایک دوسرے کو بیوقوف بناتے ہیں

مستقل سلسلے

تبصرہ کتب... 191
چمنِ خیال... 185

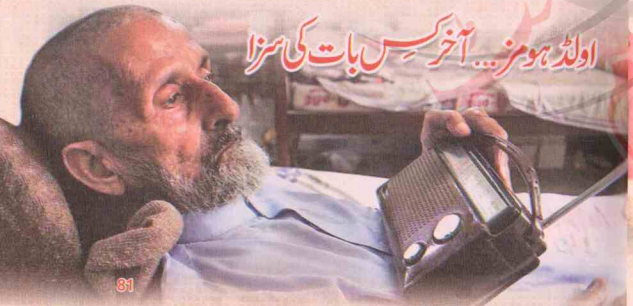

Pakistanipoint
Waqar Azeem

CHCSPK

@DRASIF JAH

کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی

Customs Health Care Society

پاکستان اور دُنیا بھر کے غریبوں، مریضوں، ناداروں، آفت زدوں اور مہاجرین کی مدد کرنے والا غیر سرکاری، غیر منافع بخش، فلاحی ادارہ

زیرِ سرپرستی: ڈاکٹر آصف محمود جاہ (ستارہ امتیاز)

پانی پلانا بہترین صدقہ ہے۔

اَفضَلُ الصَّدقَةِ سَقیُ المَاءِ

پیاسے تھر کو میٹھے پانی کے کنوؤں سے سیراب کریں

آیئے! تھر کے صحرا کو سرسبز بنائیں

آپ کے عطیہ سے بنا ہوا کم از کم 50 سال تک تھر کے قحط زدہ انسانوں اور جانوروں کی پیاس بجھاتا رہے گا۔

- (سولر پینل) کنوئیں کے لیے روپے 275,000/-
- زرعی فارم روپے 300,000/-
- تھر میں ڈسپنسری کا قیام روپے 200.000
- تھر میں اسکول کا قیام روپے 200.000
- تھر/چترال میں مسجد کا قیام روپے 100.0000
- بلوچستان میں ہینڈ پمپ روپے 15,000
- تھر میں عورتوں کے لیے بکری پال سکیم 20.000

اپنے عطیات "کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی" کے آن لائن اکاؤنٹ میں جمع کروائیں

National Bank of Pakistan, Moon Market Branch, Allama Iqbal Town, Lahorel

Swift Code	IBAN	Account #
NBPAPKKA02L	PK76NBPA1887004011311614	(1887)4011311614

CHCSPK

@DRASIF JAH

رابطہ برائے
ڈاکٹر محمد اویس 0313-2440007
محمد اشفاق 0300-9417290
ظفر اقبال 0300-6043877

کسٹمز ہیلتھ کیئر سوسائٹی

Customs Health Care Society

www.customshealthcaresociety.org.pk

اللہ کا قرآن

☆جس نے ایک انسان کو (ناحق) قتل کیا گویا اس نے ساری انسانیت کو قتل کیا (سورہ مائدہ، آیت-32)

☆یقیناً جن لوگوں نے انکار کی روش اختیار کیے رکھی اور ظلم کرتے رہے، ممکن نہیں کہ مملکت ان کو معاف کر دے، اور نہ ہی ان کو کوئی راستہ دکھائے گا۔ (سورہ نساء، آیت-168)

☆اور جب بھی آپ کا رب کسی ظالم بستی کو پکڑتا ہے تو اس کی گرفت ایسی ہی سخت ہوتی ہے بے شک اللہ تعالیٰ کی پکڑ سخت اور دردناک ہے۔ (سورۃ الاعراف ۱۱: آیت ۱۰۲)

رسول اللہ ﷺ کا فرمان

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ظلم قیامت کے دن اندھیرے ہوں گے۔ (جامع ترمذی جلد اول 2030، بخاری، جلد اول 2283)

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے معاویہ رضی اللہ عنہ کو یمن کی طرف بھیجا اور فرمایا دیکھ مظلوم کی بد دعا سے بچے رہنا کیونکہ اس کو اللہ تک پہنچنے میں کوئی روک نہیں۔ (بخاری، جلد اول حدیث نمبر:2285)

عدالتِ عظمیٰ کے گراں قدر ارشادات

صورتحال

☆☆☆

الطاف حسن قریشی

تحریک انصاف فاضل چیف جسٹس جناب گلزار احمد کی سربراہی میں پانچ رکنی بینچ کے ان ارشادات اور فیصلوں پر بغلیں بجا رہی ہے جو کورونا وائرس ازخود نوٹس کیس کے دورانِ سماعت 18 اور 19 مئی کو سامنے آئے تھے۔ اس کے قائدین کی خوشی کا سبب یہ ہے کہ اس عدالتی فیصلے میں جناب وزیراعظم کے اس موقف کی بھرپور تائید نظر آتی ہے جو انھوں نے کورونا وائرس کے آغاز ہی میں اپنایا تھا کہ لاک ڈاؤن سے لاکھوں گھرانے بے روزگار ہو جائیں گے اور ملکی معیشت کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچے گا۔ پاکستان کی سب سے بڑی عدالت نے اُن کے وژن کو بے پناہ تقویت پہنچائی ہے اور ایس او پیز کے دائرے میں رہتے ہوئے تمام دکانیں، مارکیٹیں اور شاپنگ مالز کھولنے کے احکام جاری کر دیے ہیں۔

دو روز سماعت پر مبنی عدالتی فیصلہ غیرمعمولی اہمیت کا حامل ہے، کیونکہ یہ ایک ایسے وقت میں آیا ہے جب مرکزی اور صوبائی حکومتیں الجھاؤ کا شکار اور قوتِ فیصلہ سے محروم ہوتی جا رہی تھیں۔ اس کے علاوہ پالیسی ساز اداروں میں کنفیوژن بڑھتا جا رہا تھا اور ایک بے جان سا لاک ڈاؤن نافذ تھا جس کے خلاف جناب وزیراعظم آئے دن بیان جاری کرتے رہتے تھے، چنانچہ بازاروں اور سڑکوں پر شہریوں کا ہجوم بڑھتا جا رہا تھا جو ایس او پیز کی بندشوں سے بڑی حد تک آزاد تھے۔ دیہاڑی دار، چھوٹے دکاندار اور متوسط کاروباری طبقے معاشی مشکلات میں گھر چکے تھے اور ان کے لیے اپنے اہل و عیال کا پیٹ پالنا دشوار ہوتا جا رہا تھا جبکہ حکومت کا

ریلیف پیکیج نامعلوم راستوں کی طرف رواں دواں تھا۔ اس نازک موقع پر فاضل عدالت نے بیک جنبشِ قلم لاک ڈاؤن کے خاتمے کا راستہ ہموار کر دیا، شہریوں کے آئینی حقوق کا علم بلند کیا، حکومتوں اور اداروں کی غیر تسلی بخش کارکردگی کا سختی سے جائزہ لیا اور مستقبل کا ایک لائحہ عمل بھی پیش کر دیا اور یہ فیصلہ بھی صادر کر دیا کہ معیشت اور صحتِ عامہ پر اثر انداز ہونے والی صورت میں صوبوں کو وفاقی ایگزیکٹو اتھارٹی کا احترام کرنا اور اس کی ہدایات کو عملی جامہ پہنانا ہوگا۔

18 مئی کا عدالتی فیصلہ اس اساس پر قائم ہے کہ کورونا وائرس پاکستان میں وبا کی شکل اختیار نہیں کر سکا اس لیے اس کے سدِ باب پر اربوں روپے خرچ کرنے اور معمولاتِ زندگی بڑی حد تک مفلوج کرنے کا کوئی جواز نہیں۔ فاضل جج صاحبان کا استدلال یہ تھا کہ اگر معیشت لمبے عرصے تک بند رہتی ہے، تو لوگ بھوک سے مرنے لگیں گے اور سڑکوں پر نکل آئیں گے جن کو قابو میں رکھنا حکومت کے بس میں نہیں ہوگا۔ یہ خطرہ بھی پیدا ہو سکتا ہے کہ ناموافق حالات میں صنعتکار اور سرمایہ دار پاکستان سے باہر منتقل ہو جائیں۔ تب ہماری لڑکھڑاتی معیشت بالکل بیٹھ جائے گی جس کی بحالی ایک بہت بڑا چیلنج ثابت ہوگا۔ ان خدشات کے پیشِ نظر فاضل عدالت اس نتیجے پر پہنچی کہ عید کے دنوں میں ساری مارکیٹیں ساتوں روز کھلی رہنی چاہئیں تاکہ وہ لاکھوں خاندان خریداری کر سکیں جو صرف عید پر نئے کپڑے پہننے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ اس موقع پر وفاقی سیکرٹری صحت نے یہ رپورٹ فاضل بینچ کے روبرو پیش کی کہ 5 مئی کو نیشنل کوآرڈی نیشن کمیٹی کا اجلاس وزیرِ اعظم کی صدارت میں منعقد ہوا جس میں فیصلہ ہوا تھا کہ ہفتے اور اتوار کو تمام دکانیں اور مارکیٹیں بند رہیں گی۔ اس فیصلے کے بارے میں فاضل چیف جسٹس نے غالباً طنزیہ لہجے میں پوچھا کہ کیا کورونا وائرس نے حکومتوں سے یہ وعدہ کر رکھا ہے کہ وہ ہفتے اور اتوار کو ضرور آئے گا، آیا حکومتیں ان دنوں تھک جاتی ہیں۔

اس استفسار کے بعد فاضل چیف جسٹس نے ارشاد فرمایا کہ نیشنل کوآرڈی نیشن کمیٹی کا فیصلہ آئین کی متعدد شقوں کے منافی ہے جسے برقرار نہیں رکھا جا سکتا۔ دراصل حکومتوں نے عوام کو اپنا غلام سمجھ لیا ہے جس کی آئین اجازت نہیں دیتا۔ دوسرے روز نیشنل ڈیزاسٹر مینجمنٹ اتھارٹی کے چیئرمین فاضل بینچ کے سامنے پیش ہوئے

جنھوں نے تفصیل سے بتایا کہ کورونا وائرس کی روک تھام کے لیے ان کا ادارہ کس قدر مستعدی سے کام کر رہا ہے۔ فاضل چیف جسٹس نے ان کی 'شبانہ روز' کاوشوں کو سراہتے ہوئے حالات کا دوسرا رخ پیش کیا کہ انفراسٹرکچر کی تعمیر پر اربوں خرچ کیے جا چکے ہیں مگر کچھ ہوتا نظر نہیں آ رہا۔ تمام حفاظتی سامان چین کی ایک ہی کمپنی سے خریدا جا رہا ہے جو انتہائی غیر معیاری ہے۔ قرنطینہ مراکز کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ لوگ پیسے پیسے کھیل رہے ہیں اور کسی کو انسانوں کی فکر نہیں۔ سرکاری فنڈز غیر متعلقہ افراد کے ہاتھ میں ہیں جو اپنے مفادات پر بے دریغ لٹا رہے ہیں۔ سرکاری وسائل صرف دو فیصد مخصوص کلاس کے بجائے عوام کی فلاح و بہبود پر خرچ کیے جانے چاہئیں۔ آخر میں فاضل چیف جسٹس نے فرمایا کہ ہماری معیشت افغانستان اور صومالیہ جیسی جبکہ ہمارا طرزِ زندگی بادشاہوں جیسا ہے۔

اسی روز اٹارنی جنرل پاکستان بھی عدالت میں پیش ہوئے۔ انھوں نے اس اہم پہلو کی طرف نشاندہی کی کہ فاضل بینچ کے گزشتہ روز کے فیصلے سے یہ تاثر پیدا ہوا ہے کہ کورونا وائرس ایک معمولی سی بیماری ہے، چنانچہ کاروبار کھلتے ہی ہر مقام پر ایس او پیز کی کھلم کھلا خلاف ورزیاں دیکھنے میں آ رہی ہیں۔ ان کی طرف سے یہ تجویز بھی دی گئی کہ عالمی واقعات نے ثابت کر دیا ہے کہ کورونا وائرس انتہائی تیز رفتاری سے پھیلنے والا انفیکشن ہے اور جن ملکوں نے اسے مذاق کا ہدف بنایا وہاں بڑی تباہی پھیلی ہے، اس لیے فاضل بنچ کے لیے یہ مناسب ہوگا کہ مشاورت کے لیے طبی ماہرین کی ایک کمیٹی تشکیل دی جائے۔ فاضل چیف جسٹس نے ان کی یہ تجویز مسترد کر دی، تاہم ذی شعور طبقے شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ طبی ماہرین کی ائے اور تجاویز کو بنیادی اہمیت دینی چاہیے تاکہ عدالتی فیصلوں میں کوئی بڑا سقم نہ در آئے۔ ماضی میں عدالتِ عظمیٰ کی طرف سے پاکستان اسٹیل ملز کی نجکاری اور ریکوڈک معاہدے کی تنسیخ کے منفی اثرات آج تک ہماری معیشت کو پنپنے ہی نہیں دے رہے۔ جج صاحبان کو آج کے حالات میں اس عظیم حقیقت پر نگاہ رکھنا ہوگی کہ ہمارا دستور جہاں ہر فرد کو جائز کاروبار کرنے کی آزادی فراہم کرتا ہے وہاں انسانی جان کے تحفظ کو سب سے زیادہ اہمیت دیتا ہے۔ ◆◆◆

الطاف حسن قریشی

پی آئی اے کے 713 کا سفر

ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی

کراچی میں 24 جون 1967ء کی صبح غیر معمولی طور پر خوشگوار تھی..... نسیم بحری کے خنک جھونکوں نے جون کی روایتی حدت ختم کر دی تھی۔ کراچی کے خوبصورت بین الاقوامی ہوائی اڈّے میں حسبِ معمول کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ملکی اور غیر ملکی مردوں، عورتوں اور بچوں کا ایک جمِ غفیر پی آئی اے کے دیو قامت طیارے بوئنگ 707 کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ابھی ابھی لاؤڈ اسپیکر پر اعلان ہوا تھا کہ پی آئی اے کی لندن جانے والی پرواز تیار ہے۔ مسافر تیزی سے طیارے کی طرف جا رہے تھے۔ سیڑھیاں چڑھتے ہوئے بیشتر پیچھے مُڑ کر دیکھتے اور ہاتھ ہلا ہلا کر اپنے عزیز و اقارب اور دوست احباب کو الوداع کہتے۔ پی آئی اے کا یہ طیارہ تہران، ماسکو اور فرینکفرٹ کے راستے لندن جانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

اس پرواز میں نشست حاصل کرنے کے خواہش مند وں کی تعداد بہت زیادہ تھی۔ انتظار یہ فہرست پر دو غیر ملکی مسافروں کے نام بھی تھے جو اس پرواز سے ماسکو جانے پر مُصر تھے۔ ان کی شدید خواہش کے پیشِ نظر کپتان نے عملے کے دو افراد انجینئر اور رُوسی مترجم کو طیارے کی عین روانگی کے وقت جہاز سے واپس بھیج دیا اور ان دو غیر ملکیوں کو نشستیں دے دی گئیں۔ اس طیارے میں عملے سمیت 135 افراد تھے، 40 غیر مُلکی تھے جن میں زیادہ تر روسی، برطانوی اور امریکی شامل تھے۔ شیر خوار بچوں اور عورتوں کی تعداد 14 تھی۔

پی آئی اے کا یہ بوئنگ طیارہ جو اپنے لندن کے سفر پر صبح آٹھ بجے روانہ ہونے والا تھا، گزشتہ رات کراچی پہنچا تھا۔ یہاں عملے نے اس کی ضروری دیکھ بھال کی اور زمینی انجینئر، طیارے کا پوری طرح معائنہ کرنے کے بعد پرزنگی کا پروانہ دے چکے تھے۔ طیارے کی کمان کپتان حامد حسین کے ہاتھ میں تھی۔

حامد حسین گزشتہ اٹھارہ سال سے پاکستان کی مختلف فضائی کمپنیوں میں کام کر چکے ہیں۔ ڈکوٹا سے بوئنگ تک ہر قسم کے طیارے اُڑانے کا اُنھیں 14 ہزار گھنٹے سے زائد بے داغ تجربہ ہے۔ وہ چار سال تک راولپنڈی سے گلگت اور سکردو کے پُرخطر، پیچیدہ اور پہاڑی راستوں پر غیر یقینی موسم میں نہایت کامیابی سے پرواز کرتے رہے۔ قاہرہ کی بدقسمت افتتاحی پرواز کے بعد جو دوسری پرواز ایئر مارشل نور خاں کو لے کر قاہرہ گئی تھی اس میں وہ معاون کپتان تھے۔ کپتان حسین طویل قامت اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک ہیں، کنپٹیوں پر چند سفید بال پختہ عمری کے غماز، آنکھیں اعتماد کی روشنی سے چمکتیں اور نہایت سلجھے ہوئے، ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک ہیں۔ جس پرواز کا ہم ذکر کر رہے، اس میں کپتان حسین کے ساتھ معاون کی حیثیت سے کپتان باقر بھی تھے۔ طیارے کے انجن اسٹارٹ ہوئے اور طیارہ آہستہ آہستہ رن وے کی طرف روانہ ہوا۔ مسافروں کے کیبن میں لاؤڈ اسپیکر پر ایک نسوانی آواز اُبھری۔ میزبانی کی انچارج مس گلشن انگریزی میں کہہ رہی تھیں:

''خواتین و حضرات، میں پی آئی اے، کپتان حامد حسین اور عملے کی جانب سے آپ کا خیر مقدم کرتی ہوں۔ ہمارا طیارہ، تہران، ماسکو اور فرینکفرٹ سے ہوتا ہوا لندن پہنچے گا۔ مقامی وقت کے مطابق ہم نو بج کر پینتالیس منٹ پر تہران کے بین الاقوامی ہوائی اڈّے پر اُتریں گے۔ آپ سے درخواست ہے کہ اپنی حفاظتی پٹی باندھ لیں اور تمبا کو نوشی سے پرہیز کریں۔ ہمیں اُمید ہے آپ کا یہ سفر خوشگوار رہے گا۔''

چند لمحے بعد اس اعلان کا اُردو ترجمہ بھی نشر کیا گیا۔

مسافروں نے حسبِ معمول خیر مقدم کے اس اعلان کو نہایت بے توجہی سے سنا؛ تاہم اُنھوں نے اپنی حفاظتی پٹیاں باندھ لیں اور تمبا کو نوشی کی پابندی کو بھی طوعاً و کرہاً قبول کر لیا۔ کچھ دیر تک رن وے پر دوڑنے کے بعد طیارہ فضا میں بلند ہو گیا۔ کپتان حسین نے طیارے کے باہر نکلے ہوئے پہیے اندر لانے کے لیے خود کار ہینڈل اُوپر اُٹھایا، پہیے آہستہ آہستہ پوزیشن میں آ گئے، ان میں قفل لگ گیا اور دروازے بند ہو گئے۔ لاؤڈ اسپیکر سے انگریزی زبان میں یہ اعلان سنائی دیا:

''آپ کا کپتان حسین آپ سے مخاطب ہے۔ میں اپنی، عملے اور پی آئی اے کی جانب سے پرواز پی کے 713 پر خوش آمدید کہتا ہوں۔ ہم اس وقت 35,000 فٹ کی بلندی پر ہیں، رفتار 600 میل فی گھنٹہ ہے اور ہم دو گھنٹے پندرہ منٹ کے بعد مقامی وقت کے مطابق نو بج کر پینتالیس منٹ پر تہران کے ہوائی اڈّے پر اُتریں گے۔ اس وقت تہران کا موسم صاف ہے۔ مجھے اُمید ہے آپ پی آئی اے کی مہمان نوازی سے لُطف اندوز ہوں گے۔ میری دُعا ہے کہ آپ کا سفر خوشگوار ہو۔''

یہ اعلان سُن کر مسافروں نے حفاظتی پٹیاں کھول دیں اور تمبا کو نوشی کے شوقین حضرات نے فوراً سگریٹ جلا لیے۔

زیرِ نظر تحریر ڈاکٹر اعجاز حسن قریشی کے قلم سے شمارہ مارچ ۱۹۶۹ء میں لکھی گئی جب ہمارا قومی ادارہ پی آئی اے دنیا کے لیے ایک مثال کی حیثیت رکھتا تھا اور جو ممالک آج ترقی یافتہ کہلاتے ہیں انھوں نے ہمارے ماہر اور مشاق ہوابازوں کی زیرِ تربیت اپنی ایئر لائینز کے عملے کو تربیت دلوائی۔

آج جب پی آئی اے کو کوئی حادثہ درپیش ہوتا ہے تو وہ ہمیں ماضی کی اس شان و شوکت اور عزت کی یاد دلاتا ہے جو کبھی ہماری قومی ایئر لائن کا نصیب تھی۔

سُورج کی روشنی دشتِ لوط کے سُراب کو دلفریب بنا کر پیش کر رہی تھی۔ طیارہ، حاجی بابا اصفہانی کے تاریخی شہر اصفہان کی دائیں جانب سے گزرا اور لاؤڈ اسپیکر کے ذریعے مسافروں کو اس امر کی اطلاع دی گئی، تو ان مسافروں کے ذہنوں میں جو آثارِ قدیمہ اور تاریخ سے دلچسپی رکھتے تھے، علی قاپو کے محل، مسجد شاہ اور مسجد شاہ لطف اللہ کے مناظر گھومنے لگے۔ علی قاپو کے محل سے صفوی بادشاہ، شیر اور سانڈ کی لڑائی اور قاپو کا کھیل دیکھا کرتے تھے۔ اس محل کے قریب ہی دائیں جانب مسجد شاہ ہے جو اسلامی ایرانی فن تعمیر کا عمدہ نمونہ ہے۔ مسجد شاہ لطف اللہ گنبد کی موزونیت اور فنی خوبصورتی کے لیے مشہور ہے۔ اسے صفوی خاندان کے گلِ سرسبد شاہ عباس نے تعمیر کرایا تھا۔

اصفہان سے گزرتے ہی تہران کے ہوائی اڈّے پر اُترنے کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔ ''حفاظتی پیٹی باندھ لیجیے'' کا اشارہ روشن ہو گیا، پھر مس گلشن نے لاؤڈ اسپیکر پر مسافروں سے درخواست کی کہ آپ حفاظتی پیٹیاں باندھ لیں، کیونکہ ہم تہران کے ہوائی اڈّے مہر آباد اُترنے والے ہیں۔

☆☆☆

طیارے کی رفتار مسلسل کم ہو رہی تھی۔ تہران کا ہوائی اڈّا 20 میل دُور رہ گیا تھا۔ کنٹرول ٹاور سے رابطہ قائم ہو چکا تھا۔ تہران میں مطلع صاف تھا اور سورج چمک رہا تھا۔ کپتان حسین، تہران کے ارد گرد صحرا میں اُبھرے ہوئے ریت کے اُونچے اُونچے ٹیلوں سے پوری طرح باخبر اور پُورے اعتماد سے طیارہ اُتارنے کی تیاری کر رہے تھے۔ بلندی ظاہر کرنے والا میٹر مسلسل گھوم رہا تھا اور طیارے کی سطح زمین سے اُونچائی

تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ طیارہ 35 ہزار فٹ کی بلندی سے دس ہزار فٹ کی بلندی پر آ گیا تھا۔ کپتان حسین جس سمت سے ہوائی اڈّے کی طرف آ رہے تھے، اس سمت سے براہِ راست رن وے پر اُترا جا سکتا تھا؛ لہٰذا رن وے پر اُترنے سے قبل ہوائی اڈّے کے گرد چکر لگانے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔

کپتان نے کنٹرول ٹاور سے بائیں جانب سے رن وے نمبر 29 پر براہِ راست اُترنے کی اجازت چاہی جو فوراً ہی مل گئی۔ طیارے کو رن وے پر اُتارنے کا آخری مرحلہ باقی تھا۔ اب جہاز کے تین پہیوں کو باہر نکالنا تھا جو کراچی سے روانگی کے

بعد واپس اپنی پوزیشن پر چلے گئے تھے اور ان میں قُفل لگ گیا تھا۔ یہ پہیے ایک خودکار آلے سے باہر نکلتے ہیں جو کاک پٹ میں لگے ہینڈل سے حرکت میں آتا ہے۔ یہ ہینڈل ایک بورڈ کے درمیان نصب ہوتا ہے جس کے گرد سبز اور سُرخ روشنیوں کے بلب ہوتے ہیں۔ پہیے باہر نکالنے کے لیے جونہی ہینڈل دبایا جاتا ہے، سبز اور سُرخ روشنیاں نمودار ہو جاتی ہیں۔ ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دروازے کُھل گئے ہیں اور پہیے قُفل سے نکل کر باہر کی طرف آ رہے ہیں۔ جب پہیے باہر کر سیدھے ہو جائیں اور ان میں خودکار قُفل لگ جائیں، تو سُرخ روشنیاں بجھ جاتی ہیں اور سبز روشنیاں باقی رہ جاتی ہیں، اگر کوئی دروازہ نہ کھلے یا دروازہ کُھل جائے، لیکن پہیہ قُفل والی پوزیشن سے باہر نہ نکلے یا باہر نکل کر اُس میں قُفل نہ لگے، تو اس پہیے کو ظاہر کرنے والی سُرخ روشنی بدستور موجود رہتی ہے۔ اسے خطرے کی علامت تصور کیا جاتا ہے۔

کپتان نے پُورے اعتماد کے ساتھ حسبِ عادت میکانکی انداز میں ہینڈل نیچے دبایا۔ دونوں سُرخ روشنیاں نمودار ہوئیں۔ چند ہی سیکنڈ میں دائیں اور بائیں اطراف کی سُرخ روشنیاں بُجھ گئیں اور سبز بلب جل اُٹھے، لیکن اگلے پہیے کو ظاہر کرنے والی سُرخ روشنی بدستور جلتی رہی۔ ''اُف! میرے اللہ، کیا ماجرا ہے؟'' کپتان بڑبڑائے، انھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے فوراً ہینڈل اُوپر لے جا کر نیچے گرایا۔ سُرخ روشنی بدستور جلتی رہی۔ کپتان کو کاک پٹ سے اگلا پہیہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ انھوں نے فلائٹ انجینئر کو ہدایت کی کہ وہ اگلے پہیے کا معائنہ کرے۔ فلائٹ انجینئر نے تعمیل کی اور فوراً ہی واپس آ کر یہ رپورٹ پیش کی:

''جناب، اگلا دروازہ کُھلا ہے، لیکن پہیہ باہر نہیں نکلا۔''

طیارہ بلندی سے پستی کی طرف تیزی سے آ رہا تھا۔ مہر آباد (تہران) کا ہوائی اڈّا بالکل قریب آ گیا تھا۔ کپتان نے فوراً طیارے کی نیچے اُترنے کی رفتار سنبھالی اور ہوائی اڈّے کے کنٹرول ٹاور کو پیغام دیا:

''ہمیں اگلے پہیے کے سلسلے میں کچھ مشکل پیش آ رہی ہے، لہٰذا کچھ دیر تک ہوائی اڈّے کے اُوپر چکر لگانے پڑیں گے۔''

خودکار ہائیڈرولک نظام کے ذریعے جب اگلے پہیے کو باہر نکالنے میں ناکامی ہوئی، تو کپتان حسین نے کاک پٹ میں لگے ہوئے ایک دستی کرینک کی مدد سے پہیہ باہر نکالنے والے آلے کو جنبش دی، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا؛ البتہ دروازہ کُھل گیا لیکن اگلا پہیہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہ ہوا۔ اتفاق سے اس طیارے میں ایک زائد کپتان، چیف فلائٹ انجینئر اور دو زمینی انجینئر موجود تھے۔ اُن سے مدد کی درخواست کی گئی۔ سب نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ آخری ہنگامی چارۂ کار کے طور پر جانسن بار JOHSON BAR کے ذریعے اگلے پہیے کو گرایا جائے۔ اس غرض کے لیے یہ لوگ طیارے کے نچلے خانے نمبر 41 میں گئے اور خاصا وقت صرف کیا، لیکن اگلے پہیے کا قُفل کھولنے میں کامیابی نہ ہوئی۔ یہ سب کوششیں ناکام ہو گئیں، تو کپتان نے اگلے پہیے کے بغیر طیارہ اُتارنے کا فیصلہ کیا۔

کیبن میں میزبان عملہ اور مسافر بڑی بے چینی سے اپنی گھڑیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ طیارہ اُترنے کے اعلان کو خاصا وقت گزر چکا تھا۔ عام طور پر حفاظتی پیٹی باندھنے کے اعلان کے چند منٹ بعد سگریٹ نوشی سے پرہیز کا دوسرا اعلان ہوتا ہے۔ یہ اعلان ابھی تک نہیں ہوا تھا۔ طیارے کی کھڑکیوں سے تہران کے سرسبز خیابان، انسانوں کا رواں دواں سیلاب اور سربفلک عمارات صاف نظر آ رہی تھیں۔ جوں جوں تاخیر ہوتی جا رہی تھی، ہر مسافر کے چہرے پر ایک سوالیہ نشان اُبھر رہا تھا۔ مسافر استفہامیہ نظروں سے جہاز کے عملے کی طرف دیکھتے اور میزبان عملہ آنکھیں چُرا کر اپنی گھڑیوں پر نظر ڈالتا۔ ان میں سے کسی کو بھی صحیح صُورتِ حال کا علم نہ تھا۔ دفعتاً

ان ہدایات پر سختی سے عمل کریں۔ پرسر گلشن کو بلا کر تاکید کردی کہ اس نازک صورت حال کے پیش نظر سب مسافروں کو ہنگامی حالت میں اُترنے کے لیے تیار کرے۔

چند لمحے بعد پرسر گلشن نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا:

''خواتین و حضرات، جیسا کہ آپ کو کپتان کے اعلان سے معلوم ہو چکا ہمارا طیارہ اگلے پہیے کے بغیر اُترے گا، اس لیے آپ صاحبان اپنے سامنے سیٹ کی دراز میں رکھی ہوئی ان ہدایات کو بغور پڑھ لیں جو ہنگامی حالات کے تحت اُترنے والے مسافروں کے لیے ضروری قرار دی گئی ہیں۔ اپنے جوتے اُتار دیجیے۔ عینک، گھڑی، ٹائی پن، چاقو، چابیاں اور کوئی نوکدار چیز جو آپ کے پاس ہو، تو اسے ہمارے حوالے کر دیجیے۔ اپنی حفاظتی پیٹیاں کس کر باندھ لیجیے، گھٹنوں پر تکیے رکھیے۔ طیارہ رن وے پر اُترے، تو آپ لوگ اپنے سر تکیے پر رکھ دیں تاکہ جھٹکا لگنے کی صورت میں کوئی گزند نہ پہنچے۔''

مسافروں نے یہ ہدایات غور سے سُنیں۔ ان میں سے چند خواتین پریشان ہو گئی تھیں۔ میزبان عملے نے انھیں تسلی دی اور اپنے سامنے ہدایات کی مشق کرائی، پھر کیبن کے سب مسافروں کو ریہرسل کرائی گئی۔ بعض پاکستانی خواتین نے زیور پہن رکھا تھا، وہ ان سے اُتروا کر حفاظت سے ایک اٹیچی کیس میں بند کر دیا گیا۔ اُوپر بریکٹوں میں جو چھوٹا موٹا سامان رکھا تھا، اسے بھی ہٹا لیا گیا۔ عملے نے یہ سامان بیت الخلا میں بھر دیا۔

اس کارروائی میں نصف گھنٹے سے بھی کم وقت صرف ہوا۔ ایک مسافر نے گھنٹی بجائی اور میزبان خاتون سے کچھ کہا۔

خاتون کپتان کے پاس پہنچی۔ ''ایک مسافر کھانا طلب کر رہا ہے۔'' خاتون نے جواب طلب لہجے میں پوچھا۔

''اسے کھانا دے دو۔ شاید یہ اس کی زندگی کا آخری کھانا ہو۔'' کپتان نے جواب دیا...... اتنے میں ایک دوسری میزبان خاتون آ پہنچی۔ ''کپتان، ایک مسافر وہسکی طلب کر رہا ہے۔'' مسلمان میزبان خاتون زندگی و موت کی کشمکش میں حرام شے پیش کرتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔

''مسافر جو کچھ طلب کرے، اسے فوراً دو۔'' کپتان نے فوراً عمومی ہدایت دی۔ میزبان خواتین مسافروں کی خواہش کے مطابق مشروبات اور کھانے پیش کرنے لگیں۔ اگر کوئی مسافر رنجیدہ یا متفکر نظر آتا، تو وہ اس کے پاس جاتیں اور اسے تسلی دیتیں۔ رفتہ رفتہ کیبن کا ماحول پُرسکون ہو گیا اور مسافر ان لمحات کا انتظار کرنے لگے جب طیارہ ایک پہیے کے بغیر رن وے پر اُترنے والا تھا۔

☆☆☆

کاک پٹ میں کپتان نصابی ہدایات کو کئی بار پڑھ چکے تھے اور اب بڑی بے تابی سے پٹرول ختم ہونے کے منتظر تھے۔ فرصت کے ان لمحات میں ان کا ذہن گزشتہ اٹھارہ سال میں پیش آنے والے ان اہم واقعات کا جائزہ لینے لگا جن سے گزر کر وہ اعتماد اور یقین کی اس دولت سے مالا مال ہوئے تھے۔ سب سے پہلا واقعہ جو ان کے ذہن کے پردے پر نمودار ہوا، 1951ء میں پیش آیا تھا۔ انھیں اورینٹ ایئرویز میں شامل ہوئے صرف دو سال ہوئے تھے اور وہ اپنی پہلی پرواز پر معاون ہواباز کی حیثیت سے چٹاگانگ سے کلکتہ جا رہے تھے۔ ابھی کلکتے سے دور تھے کہ طیارے کے ایک انجن میں آگ لگ گئی۔ کپتان ہواباز اس آگ سے بالکل بے خبر تھا۔ اتفاق سے کپتان حسین کی نگاہ اس آلے پر پڑ گئی جو ان کے سر کے اُوپر لگا ہوا تھا اور آتش زدگی کے خطرے کو ظاہر کر رہا تھا۔ انھوں نے فوراً کپتان کو مطلع کر دیا۔

کپتان کوشش کے باوجود آگ نہ بجھا سکا۔ حامد حسین نے درخواست کی کہ آپ جہاز کا چارج مجھے دے دیں۔ کپتان نے مایوس ہو کر ان کی خواہش پوری کر دی۔ حامد حسین

نے اپنی خداداد صلاحیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس آگ کو چند سیکنڈ میں بجھا دیا، لیکن آگ بجھتے ہی وہ انجن بے کار ہو گیا جس میں آگ لگی تھی۔ اب اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ ایک انجن کے ذریعے طیارے کو کلکتے کے ہوائی اڈّے تک لے جایا جائے۔ چنانچہ حامد حسین نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنی کمان میں ڈکوٹا جہاز کو ایک انجن پر اُتارا۔ مسافروں کو اس واقعے کا بالکل علم نہ ہو سکا۔ کلکتہ پہنچنے کے بعد انھیں بتایا گیا کہ وہ ایک انجن کے جہاز پر سفر کرتے رہے اور اسی ایک انجن کے ذریعے جہاز نیچے اُترا، تو ان میں سے بیشتر نے یہ تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

دوسرا اہم واقعہ 1959ء میں پیش آیا۔ وہ ایک عرصے سے راولپنڈی میں چیف پائلٹ کی حیثیت سے مقیم تھے۔ طیاروں کی پرواز اکثر دن کے وقت ہوتی تھی۔ عام طور پر ڈکوٹا جہاز زیرِ استعمال تھے۔ ایک روز انھیں شوق چرایا کہ رات کو طیارہ اُڑانے کی مشق تازہ کریں! چنانچہ وہ ایک ڈکوٹا جہاز لے کر کراچی سے راولپنڈی کے لیے روانہ ہوئے۔ کراچی کا موسم معمول کے مطابق تھا۔ ابھی وہ کراچی سے تھوڑی دُور ہی گئے تھے کہ ایک زبردست طوفان نے آ لیا۔ ان ایام میں ڈکوٹا جہاز میں راڈار موجود نہ تھا! چنانچہ فاصلے سے کسی طوفان کا پتہ چلانا ممکن نہ تھا۔ کپتان حسین نے طوفان سے بچنے کے لیے طیارہ ایک طرف موڑا۔ طیارہ کیا مُڑا، قیامت ہی آ گئی۔ طوفان کے ایک زبردست تھپیڑے نے طیارے کے اُٹھتے ہوئے بازو پر اس زور سے دباؤ ڈالا کہ طیارہ بے قابو ہو گیا اور چکر کاٹتا ہوا نہایت تیزی سے نیچے آنے لگا۔ جونہی کپتان حسین کی نظر رفتار کے میٹر پر پڑی، وہ خوفزدہ ہو گئے۔ طیارہ دس ہزار فٹ کی بلندی سے گر کر تین ہزار کی بلندی تک پہنچ گیا تھا اور میٹر کی سوئی اتنی تیزی سے گھوم رہی تھی کہ خطرہ تھا اگر جہاز پر چند سیکنڈ اور قابو نہ پایا گیا، تو زمین سے ٹکرا جائے گا۔ کپتان حسین نے طیارے کو کنٹرول میں لانے کے لیے ہر ممکن کوشش کی، مگر کامیابی نہ ہوئی۔ موت آنکھوں کے سامنے ناچنے لگی۔ ہر طرف نااُمیدی کی تاریکی چھا گئی تھی۔ کپتان حسین نے اس حالت میں اپنے رب کو پکارا: ''یا پروردگار! میرے بچے چھوٹے چھوٹے ہیں۔ تو ہی ان پر رحم کرنے والا ہے۔''

خُدا نے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی اس پُکار کو سُنا اور اس کی رحمت جوش میں آ گئی۔ کپتان نے اندازے سے ایک لیور (RUDDER) کو پاؤں سے دبایا اور یہ ایک معجزہ ہی تھا کہ تیزی سے نیچے آتا جہاز ایک دم سیدھا ہو گیا اور ہموار پرواز کرنے لگا۔ طیارہ بخیر و خوبی واپس کراچی پہنچ گیا اور کپتان حسین نے خدا کا شکر ادا کیا۔

تیسرا اہم واقعہ جو انھیں یاد آیا، جون 1961ء میں پیش آیا۔ وہ لاہور سے کانسٹیلیشن طیارہ اُڑا کر ڈھاکا لے جا رہے تھے۔ بھارت کے دارالحکومت پر سے گزر چکے تھے کہ اچانک طیارے کے دو انجنوں میں خرابی پیدا ہو گئی۔ خرابی کی نوعیت ایسی تھی کہ پرواز کے دوران میں اسے درست کرنا ممکن نہ تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ کسی قریبی ہوائی اڈّے پر اُتر کر انجنوں کی مرمت کی جائے۔ قریب تین ہوائی اڈّے دہلی اور لاہور تھے۔ لاہور پہنچنے کے لیے دہلی کے مقابلے میں 5 منٹ زائد درکار تھے۔ انھوں نے وقت بچانے کے لیے دہلی کے ہوائی اڈّے پر اُترنے کا فیصلہ کیا۔ بروقت صحیح فیصلے کی وجہ سے چند منٹ کے اندر اندر وہ بخیریت دہلی کے ہوائی اڈّے پر اتر گئے۔

آخر میں ان کے ذہن کے پردے پر ایک اور واقعہ اُبھرا۔ پی۔ آئی۔ اے کی قاہرہ کے لیے افتتاحی پرواز کے بعد دوسری تحقیقاتی پرواز پر وہ معاون کپتان کی حیثیت سے متعین کیے گئے۔ افتتاحی پرواز کی تباہی کے بعد دوسری پرواز کی روانگی کے وقت ہر پاکستانی کے دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور اہل ملک اس پرواز کے بخیریت قاہرہ پہنچنے کی خبر

سننے کے لیے بے تاب تھے۔ اس پرواز میں پی۔آئی۔اے کے سربراہ مارشل نور خاں اور دیگر فنی ماہرین بھی ہمراہ تھے۔ طیارہ صبح چار بجے جونہی قاہرہ کے قریب پہنچا، ائیر مارشل نور خاں نے کپتان کو ہدایت کی کہ وہ طیارے کو ٹھیک اسی طریقے سے اُتارے جس طرح پہلی پرواز کا طیارہ اُترا تھا۔ طیارے کے کپتان اور معاون کے لیے یہ مرحلہ بہت نازک تھا، لیکن تائیدِ ایزدی سے چند سیکنڈ میں وہ طیارے کو صحیح سلامت رن وے پر اُتارنے میں کامیاب ہوگئے۔

☆☆☆

اور اب کپتان حسین کو ایک اور چیلنج درپیش تھا۔ 135 افراد کی ذمہ داری اور 4 کروڑ روپے کی مالیت کا طیارہ ان کی تحویل میں تھا۔ اس سے قبل بوئنگ کے اس نوعیت کے 12 حادثات ہو چکے تھے۔ کپتان حسین ان حادثات سے آگاہ تھے۔ ہر حادثے میں انسانی جانیں بھی تلف ہوئی تھیں اور طیارے کو ناقابل تلافی نقصان بھی پہنچا تھا۔ چند ماہ پہلے مارچ میں بیروت کے اڈّے پر ایک بوئنگ اسی نوعیت کی فنی خرابی کی وجہ سے ہنگامی حالت میں اُترا تھا۔ اس کے مسافر تو بچ گئے تھے، مگر رن وے سے رگڑ کھاتے ہی جہاز کو آگ لگ گئی اور ہوائی اڈّے کے فائر بریگیڈ ئیر کی انتہائی کوشش کے باوجود طیارہ جل کر راکھ ہوگیا۔ حالانکہ اس کے پٹرول کی ٹینکی آگ لگنے سے محفوظ رہی تھی۔ کپتان حسین کو یہ بھی احساس تھا کہ بوئنگ طیارے کے ان دونوں بازوؤں کی لچک جن میں انجن لگے ہوئے ہیں، 21 فٹ ہے۔ شدید جھٹکے کی صورت میں وہ 11 فٹ بلندی کی طرف اور 10 فٹ نیچے کی طرف لچک کھاتے ہیں۔ سامنے کے پہیے کے بغیر اُترنے کی صورت میں انجنوں کا فاصلہ رن وے سے صرف آٹھ انچ رہ جاتا ہے۔ اگر رن وے پر اُترتے وقت جھٹکا لگا، تو اس بات کا شدید خطرہ ہے کہ بازو کے اندرونی انجن، رن وے سے ٹکرا جائیں اور انھیں شدید نقصان پہنچے۔ اس امر کا بھی خدشہ تھا کہ طیارہ اگلی نوک پر رن وے پر اُترے، تو کم از کم رفتار 50 میل فی گھنٹہ ہوگی۔ جونہی طیارے کا اگلا حصہ رن وے کے پختہ فرش سے رگڑ کھائے گا، ایک شعلہ پیدا ہوگا، اس سے طیارے میں آگ لگنے کا احتمال تھا؛ چنانچہ کپتان حسین نے میزبان کو مناسب ہدایات دیں اور انھوں نے یہ ہدایات بکمالِ خوبی طیارے کے مسافروں تک پہنچا دیں۔ مسافروں سے کہا گیا کہ طیارہ ٹھہرتے ہی وہ ہنگامی دروازوں سے یکے بعد دیگرے نیچے پھسل جائیں...... رن وے پر اتنی جلدی سیڑھیاں تو مل نہیں سکتیں، لیکن اس ہنگامی حالت میں ''پھسلنے والے'' دروازوں کو استعمال کیا جاتا ہے۔ سب مسافروں کو بتا دیا گیا کہ انھیں کس کس دروازے سے نکلنا ہے اور تاکید کر دی گئی کہ ہدایات پر عمل کریں۔ ایسا نہ ہو کہ افراتفری مچ جائے اور ہر شخص پہلے نکلنے کی کوشش میں دوسروں کا راستہ روک لے۔ مسافروں کو اس خوبی سے ریہرسل کرائی گئی کہ اب وہ سب ایک منٹ میں جہاز سے نکل سکتے تھے۔

ایک گھنٹہ پینتالیس منٹ تک پی۔آئی۔اے کا یہ طیارہ تہران کے اُوپر چکر لگاتا رہا۔ اہل تہران کو ریڈیو کے ذریعے اطلاع مل گئی تھی کہ پی۔آئی۔اے کا طیارہ فنی خرابی کی وجہ سے ہنگامی حالت میں اُترنے والا ہے اور پٹرول ختم کرنے کے لیے چکر کاٹ رہا ہے۔ ان کی نگاہیں طیارے کی طرف لگی ہوئی تھیں، وہ دل ہی دل میں پاکستانی طیارے کی سلامتی کے لیے دعائیں مانگ رہے تھے۔ اخبارات کے نمائندے، ٹیلی ویژن کے کیمرا مین اور پاکستان کی محبت سے سرشار منچلے نوجوان ہوائی اڈّے کی طرف لپکے۔ یہاں تک کہ پولیس نے عام ٹریفک کے لیے اڈّے کو جانے والی سڑک بند کر دی، کیونکہ ہنگامی حالات کے تحت شہر سے فائر بریگیڈ کا عملہ طلب کیا گیا تھا اور خدشہ تھا کہ بھیڑ کی وجہ سے فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کو راستہ نہ ملے گا۔ شہری ہوابازی کے ہیلی کاپٹر بھی حرکت میں آ گئے تھے اور پاکستانی طیارے کے ساتھ ساتھ

چکر کاٹ رہے تھے۔ تہران کے اڈّے پر پی۔آئی۔اے کے عملے نے ریڈیو ٹیلی فون کے ذریعے کراچی سے رابطہ قائم کر رکھا تھا اور طیارے سے آنے والے پیغامات کراچی تک پہنچا رہا تھا اور کراچی سے فنی ہدایات زمینی عملے تک پہنچائی جا رہی تھیں جو انھیں کپتان حسین کو بھیج رہا تھا۔

☆☆☆

اب جہاز میں صرف اتنا پٹرول باقی تھا کہ پندرہ منٹ تک پرواز کی جا سکتی تھی۔ کپتان حسین نے نیچے اُترنے کا فیصلہ کیا اور معاون کپتان اور انجینئر سے آخری دفعہ پوچھ لیا کہ انھیں اب کسی امر کی وضاحت کی ضرورت تو باقی نہیں رہی۔ ان کے اطمینان دلانے پر کپتان نے مسافروں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا:

''خواتین و حضرات، ہم ہنگامی حالت میں اُتر رہے ہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ ان ہدایات پر سختی سے عمل کریں جو ہم نے آپ کو بتائی ہیں۔ انشاءاللہ ہم بخیر و خوبی رن وے پر اُتریں گے۔ میں خدا سے آپ کی سلامتی کی دعا کرتا ہوں۔''

اعلان کے بعد کپتان حسین نے کتابی ہدایات کے مطابق طیارے کو نیچے اُتارنے کا گیئر دبایا۔ وہ آہستہ آہستہ طیارے کو اُتارتے اور پھر پچھلا گیئر لگا کر اسے تیزی سے نیچے اُترنے سے روک لیتے۔ تھوڑا سا نیچے لاتے اور پھر روک لیتے۔ یہ عمل انھوں نے بار بار دہرایا۔ یہاں تک کہ طیارہ، رن وے کے بالکل قریب آ گیا اور اب طیارے کا مزید رُکنا اور ٹھہرنا ناممکن ہوگیا، کیونکہ اس میں ارتعاش پیدا ہونے لگا تھا۔ کپتان حسین نے اللہ کا نام لے کر طیارے کو رن وے پر اُتار دیا۔ اس وقت طیارے کی رفتار 52 میل فی گھنٹہ تھی۔ طیارے نے معمولی جھٹکے سے رن وے کو چھوا اور اس کا اگلا حصہ پختہ فرش پر رگڑ کھاتا ہوا تھوڑی دور جا کر ٹھہر گیا۔ اس رگڑ سے شعلہ پیدا ہوا اور جہاز کا اگلا حصہ دھڑا دھڑ جلنے لگا۔

رن وے کو چھوتے ہی ایک امریکی مسافر کھڑکی کے پاس بیٹھے ہوئے کپتان خان سے مخاطب ہوا:

''آپ لوگوں نے ہمیں دو گھنٹے سے تذبذب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ طیارہ تو اگلے پہیے پر اُترا ہے''۔

کپتان خان نے کھڑکی میں سے اشارہ کرتے ہوئے کہا:

''ذرا اس شعلے کو دیکھیے، ہم اگلے پہیے کے بغیر اُترے ہیں۔ یہ کپتان حسین کا کارنامہ ہے کہ آپ لوگوں کو اس بات کا احساس تک نہ ہوا''۔

امریکی بولا:

''اگر یہ سچ ہے، تو میں کپتان حسین کو مبارکباد پیش کرتا ہوں''۔

کپتان حسین نے واقعی اس مہارت سے کام لیا تھا کہ بیشتر مسافروں کو یہ احساس تک نہ ہوا کہ طیارہ غیر معمولی حالات میں اُترا ہے۔ شروع میں جب پہیہ نہ کھلنے کی خبر سنی تھی، تو ہر مسافر سب سے پہلے طیارے سے اُترنے کا خواہش مند تھا، لیکن طیارہ اس خوبی سے اُترا کہ ہر شخص اپنی اپنی اشیاء تلاش کرنے لگا۔ کوشش کے باوجود مسافروں کا کیبن خالی کرانے میں ایک کے بجائے دو منٹ صرف ہوگئے۔ سب مسافر ہنگامی دروازوں کے ذریعے پھسل پھسل کر باہر آ گئے۔ ادھر فائر بریگیڈ کے عملے نے جہاز کے نچلے حصے میں لگی ہوئی آگ بجھا دی۔ اگلے حصے میں آگ لگنے کے باوجود کپتان حسین نے اُس وقت تک طیارہ نہ چھوڑا جب تک سب مسافر صحیح سلامت نا اُتر گئے۔ جب طیارے میں ایک متنفس بھی باقی نہ رہا، تو کپتان حسین مُسکراتے ہوئے باہر نکلے۔ لاؤنج میں پہنچ کر انھیں ایک ماہ قبل کا خواب یاد آ گیا: وہ ایک نامعلوم وادی میں حیران و پریشان کھڑے ہیں۔ اردگرد اُونچے اُونچے پہاڑ ہیں اور وادی سے نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا۔ اس خواب کے یاد آتے ہی انھیں فوراً احساس ہوا کہ تہران کے قرب و

جوار کا علاقہ خواب میں دیکھے ہوئے علاقے سے کتنی مشابہت رکھتا ہے۔

☆☆☆

ٹھیک سوا گیارہ بجے کپتان حسین کے گھر ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ بیگم حسین ابھی ابھی جائے نماز سے اُٹھ کر پلنگ پر دراز ہوئی تھیں۔ اُن کے بے چین دل کو قدرے سکون آ گیا تھا۔ انھوں نے پورے اعتماد کے ساتھ ریسیور اُٹھایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی:

''میں پی آئی اے سے بول رہا ہوں۔ بھابی مبارک ہو، کپتان حسین اگلے پہیوں کے بغیر بخیر وخوبی تہران کے ہوائی اڈے پر اُتر گئے ہیں۔ مسافر، عملہ اور طیارہ صحیح سلامت ہیں۔ آپ کے شوہر بین الاقوامی ہوابازی میں پاکستان کا نام بلند کر چکے ہیں۔ ہمیں ان پر فخر ہے۔''

بیگم حسین نے فوراً اپنے رب کے حضور سجدۂ شکر ادا کیا۔ ربِّ کریم نے ان کی دعائیں سن لی تھیں۔

☆☆☆

اِس عظیم الشان کارنامے پر کپتان حسین کو پی آئی اے کے فلائٹ آپریشن ڈیپارٹمنٹ کے وائس پریزیڈنٹ کی طرف سے ان کے پرسنل اسسٹنٹ کے دستخطوں سے ایک رسمی سا خط ملا جس کی عبارت چند حروف پر مشتمل تھی اور جس میں وائس پریزیڈنٹ کی طرف سے پہیوں کے بغیر طیارے کو صحیح سلامت اُتارنے کی خبر سُن کر مسرت کا اظہار کیا گیا تھا۔

☆☆☆

آج اگر تمام حالات کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات عیاں ہوتی ہے کہ ہمارے ہواباز آج بھی وہی ہمت وحوصلہ رکھتے ہیں۔ ان میں جذبہ اور جرات بھی وہی ہے اور ہنر وفن میں ہم آج بھی یکتا ہیں۔ اس کی روشن مثال ہمارے فوجی ہواباز ہیں۔ جہاں تک کسی ادارے کے ہوابازوں کا تعلق ہے، انھیں ٹریننگ دینے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جاتی اور کوئی ادارہ نہیں چاہے گا کہ اس کی کسی کوتاہی کی وجہ سے اس کے ادارے یا وطن کی عزت پر کوئی حرف آئے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات کسی مشکل کا سامنا کرنے کے لیے جس حاضر دماغ، ہوشیاری اور بہادری کا مظاہرہ کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، اس میں کبھی کبھی انسان اُمیدوں پر پورا نہیں اُترتا۔

ہر حادثہ اپنے پیچھے ایک کہانی ایک سوال اور لاکھوں منتظر نگاہیں چھوڑتا ہے جن کے جوابات تلاش کرنے میں ایک عرصہ درکار ہوتا ہے۔ قومی ایئر لائن کے طیارے کو پیش آنے والا حالیہ حادثہ بھی بہت سی ان کہی داستانیں سُناتا ہے۔ کوئی اس کی ذمہ داری ہوابازوں پر ڈال رہا تو کوئی ادارے کی کوتاہی اور ناکارہ پرانے طیارے ابھی تک استعمال میں رکھنے پر ادارے کو سوال وجواب کے کٹہرے میں کھڑا کر رہا۔

ذمہ دار کوئی بھی ہو، وجوہ کوئی بھی ہوں، ہر حادثہ ہم سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ ہم ان تمام حالات وواقعات کا جائزہ لیں جن کے سبب حادثہ رونما ہونے کے امکانات زیادہ واضح تھے اور بجائے لعن طعن کے، ان نقائص کو سنجیدگی کے ساتھ حل کرنے کی کوشش کریں تاکہ ایسے دلدوز واقعات سے حتی الامکان بچا جا سکے۔

☆☆☆

گزشتہ کچھ دن پہلے ایک رپورٹ نظروں کے سامنے سے گزری جس میں پاکستانی اداکار، گلوکار، میزبان اور اب ہواباز فخر عالم نے اس حادثے کا تجزیہ پیش کرتے ہوئے پاکستان سول ایوی ایشن اتھارٹی کی لاپروائی اور کوتاہیوں کو پروازوں کی ناکامی اور حوادث کی بنیادی وجوہ قرار دیا۔ جن کی رُو سے وہ اس ادارے کو ہی اس حادثے کا ذمہ دار مانتے ہیں۔ اُن کے مطابق:

☆ سی اے اے خطے میں سب سے زیادہ معاوضہ وصول کرنے والا وہ ادارہ ہے جو ہوائی اڈے پر کم سے کم خدمات فراہم کرتا ہے۔

☆ اس ادارے کی زیادہ تر آمدنی غیر ضروری اور مہنگے منصوبوں پر خرچ ہوتی ہے۔ کسی حادثے کی صورت میں ان کے پاس ایسا کوئی انتظام نہیں جس کی مدد سے گمشدہ طیارے کی تلاش یا اسے کسی آفت سے بچاؤ کا کوئی سیٹ اپ بنایا گیا ہو۔

☆ امیر اور خرچ کرنے کی اہلیت رکھنے اور خطے کا سب سے بڑا فلائٹ آپریشن ہونے کے باوجود اس کے پاس سوائے لاہور، اور کسی ہوائی اڈے پر انسٹرومنٹ لینڈنگ سسٹم کی سہولت نہیں جو سخت موسمی صورتحال میں فلائٹ سیفٹی کے لیے انتہائی ضروری ہوتی ہے۔

☆ چاررن وے یو ای ٹی، ایل ایچ ای، ایل وائی پی اور جل کو سالوں سے بحالی کی ضرورت ہے۔ جس کی وجہ سے حفاظت کو شدید خطرہ لاحق ہے۔ کوویڈ 19 کی وجہ سے پروازوں میں وقفہ آنا ایک سنہری موقع تھا جس میں بغیر کسی رکاوٹ کے مرمت کا کام بخوبی ہو سکتا تھا لیکن کچھ نہیں کیا گیا۔

☆ آبادی کے ساتھ اسکائیو بنجر پرندوں کا خطرہ لاحق ہوتا ہے، جو ہوائی اڈے کے آس پاس اور رن وے کے علاقے میں ریوڑ کی شکل اُڑتا رہتا ہے۔ متعدد پی آئی اے اور دوسری پروازوں کا ان پرندوں سے ٹکراؤ ہوا ہے۔ ان کے پاس پرندوں کی شوٹنگ کے انتظامات جیسے سامان نہیں ہیں۔ حالانکہ غیر معمولی بجٹ یا محصولات کے سلسلے نہ ہونے کے باوجود پی اے ایف کے ہوائی اڈوں میں اس سے بہتر سامان موجود ہے۔

☆ بار بار درخواستوں کے باوجود سی اے اے تربت، گوادر اور بہاولپور میں ایندھن سازی کی سہولت کا بندوبست نہیں کر سکا جس کے نتیجے میں طیاروں کے ذریعہ ایندھن کی

واپسی کی وجہ سے بوجھ کی قلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، طیاروں میں تکنیکی خرابی کی صورت میں سمجھوتہ کرنے والی حفاظت کا ذکر نہیں کیا جاتا۔

اس کے علاوہ دیگر خامیوں میں جعلی لائسنس کا بننا، سیکرٹریوں کا ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اس منصب کو برقرار رکھنے کے خواہشمند رہنا، اے ٹی سی کی تربیت مایوس کن رہنا، کریش رپورٹس کی پیروی نہ ہونا، انتہائی زیادہ مہنگے کرایوں کی وجہ سے ایوی ایشن بلڈنگ کا خالی رہنا۔ ان کا واحد کرایہ دار صرف پی آئی اے ہے۔ بیشتر دفاتر خالی ہیں۔

●●●

عوامی طاقت کے سامنے بے بس ہوتی سُپر پاور

اشرافیہ کی محافظ پولیس کے ہاتھوں سیاہ فام جارج فلائیڈ کے سفاکانہ قتل سے شروع ہونے والا طوفان امریکی گلی کوچوں میں پھیل چکا

☆ کیا امریکا کا زوال اب نوشتہ دیوار بن چکا؟
☆ کیا ریاستی وسائل اور طاقت عوام کے اندر پیدا شدہ بے چینی کو ختم کرسکیں گے؟
☆ کیا مٹھی بھر اشرافیہ اپنے کردار پر نظر ثانی کرنے پر تیار ہے؟
☆ موجودہ صورتحال میں پاکستان کے لیے ترقی اور استحکام کے نئے امکانات کیا ہیں؟

طیب اعجاز قریشی کے قلم سے

جب 25 مئی کی شام چھیالیس سالہ جارج فلائیڈ ایک اسٹور میں سگریٹ خریدنے داخل ہوا تو کسی کے وہم و گمان میں نہیں تھا کہ وہ دنیا کی اکلوتی سپر پاور امریکا میں رائج ظالمانہ، متعصّبانہ اور استحصالی نظام کو کاری ضرب پہنچانے کا محرک بنے گا۔ جیسے دس سال قبل تیونس کے ایک پھیری والے کی خودکشی نے دنیائے عرب میں ''عرب بہار'' نامی انقلاب برپا کردیا تھا۔ اسی طرح جارج کے نہایت دردناک قتل نے امریکی نظام حکومت کی بنیادوں میں پائی جانے والی خرابیاں سبھی پر آشکارا کردیں۔

دنیا میں دو طبقات پائے جاتے ہیں: ایک ظالم اور دوسرا مظلوم۔ دونوں کے مابین کشمکش جاری رہتی ہے۔ پچھلے چالیس پچاس برس کا نرالا پن یہ ہے کہ اس دوران ظالم طبقے نے ''ایلیٹ'' یا ''اشرافیہ'' کا روپ دھار کر قوموں کے وسائل پر قبضہ کرلیا اور اپنی تجوریاں بھرنے لگے۔ جبکہ عوام الناس اتنا ہی کما پاتے کہ جسم و روح کا رشتہ برقرار رہ سکے۔

اس نام نہاد ایلیٹ طبقے نے دولت کمانے کی خاطر جو عیارانہ طریق واردات اپنایا، اس کی ایک جھلک آپ بل گیٹس کے مضمون میں پڑھ سکتے ہیں جو اسی شمارے میں شاملِ اشاعت ہے۔ مفادات کو تحفظ دینے کا پیچ در پیچ سلسلہ جاری تھا کہ اس پر اچانک کورونا وائرس نے حملہ کردیا۔ وائرس سے پھوٹی وبا نے آمرانہ حکومتوں کو بھی عوام کی دادرسی کرنے پر مجبور کردیا۔

ایلیٹ طبقے کے وضع کردہ ظالمانہ و سرمایہ دارانہ نظریات پر مبنی نظام کو اگلی ضرب جارج کی موت نے لگائی۔ سوشل

میڈیا کی خامیاں اپنی جگہ، مگر امریکی نسل پرست پولیس افسر نے جس درندگی و وحشت سے جارج کو قتل کیا وہ اسی کی وجہ سے پوری دنیا میں نمایاں ہوگئی۔ لرزہ خیز ویڈیو دیکھ کر لاکھوں امریکی سڑکوں پر نکل آئے۔ وہ پھر کووڈ 19 کے بطن سے پھوٹنے والے خوف کو بھی خاطر میں نہ لائے اور اپنے ایلیٹ طبقے کے خلاف زبردست مظاہرے کرنے لگے۔ اسی موقع پر لوٹ مار کے واقعات بھی رونما ہوئے جو نہیں ہونے چاہئیں تھے۔ مگر مشہور امریکی مسلمان باسکٹ بال کھلاڑی، کریم عبدالجبار کا کہنا تھا: ''لوٹ مار کے واقعات ہی محروم و پسے طبقات کی آواز بن کر حکومتی ایوانوں میں ہلچل پیدا کرتے ہیں۔''

امریکا میں نسلی امتیاز کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اسی شہر میں 1934ء میں بھی ظلم کے خلاف عوامی شورش نے سر اٹھایا تھا جس سے نمٹنے کے لیے پولیس نے نہتے شہریوں پر بہیمانہ تشدد کیا اور ایک ہی دن میں درجنوں لوگوں کو ہلاک اور زخمی کردیا۔ وہ دن شہر کی تاریخ میں ''خونی جمعہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

امریکی معاشرے میں نسلی امتیاز رچ بس گیا ہے۔ امریکی آئین میں دیے گئے حقوق کے باوجود سیاہ فام اور دیگر غیر سفید فام باشندے اوّل درجے کے شہری نہیں سمجھے جاتے۔ یہی وجہ ہے کہ آج امریکا میں ''سیاہ فام کی زندگی بھی قیمتی (Black Lives Matter) کا نعرہ زبان زدِ عام ہے۔ 1955 میں شہری حقوق کے حصول کے لیے چلائی جانے والی تحریک میں مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کی جدوجہد سے سیاہ فام امریکی کسی حد تک غلامانہ زندگی سے نجات حاصل کرنے میں کامیاب رہے لیکن امریکی معاشرے پر اصل حکمرانی آئین کی نہیں بلکہ ایک مخصوص اشرافیہ کی ہے جو مساوی حقوق کے حوالے سے کی جانے والی ہر کوشش کو ناکام بنا دیتی ہے۔ مساوی شہری حقوق کی جدوجہد کرنے کے پاداش ہی میں مارٹن لوتھر کنگ 4 اپریل 1968 کی شام ایک نسل پرست سفید فام کے ہاتھوں اپنی زندگی کی بازی ہار گیا۔

سیاہ فام امریکی صدر باراک حسین اوباما سے عام امریکی شہری کو توقع تھی کہ وہ حکومت سنبھال کر عدل و انصاف پر مبنی نظام قائم کریں گے۔ اپنی انتخابی مہم میں صدر اوباما نے سیاہ فام امریکیوں کو مساوی حقوق دلوانے کے حوالے سے حکومتی نظام میں اصلاحات کرنے کے وعدے کیے تھے۔ لیکن صدر کا منصب سنبھالنے کے بعد وہ اپنے وعدوں کو عملی شکل دینے میں ناکام رہے۔ سفید فام بالادستی کے نظریے کی علمبردار امریکی اشرافیہ کسی ایسی کوشش کو کامیاب نہیں ہونے دیتی جس سے اس کی بالادستی اور اس سے جڑے مفادات پر زد پڑ جائے۔ ایک امریکی صدر اپنے انتخابی ایجنڈے پر اسی وقت ہی عمل کرسکتا ہے جب وہ اشرافیہ کے مفادات سے ہم آہنگ ہو۔

امریکا میں سیاہ فام اور دیگر غیر سفید فام نسل سے تعلق رکھنے والے لوگوں کے لیے رہائشی کالونیاں اور تعلیمی ادارے الگ ہیں۔ ان گروہوں کے لوگوں کو معمولی ملازمتیں ہی مل پاتی ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے مخصوص نام دیکھ کر انھیں انٹرویو کے لیے بلایا ہی نہیں جاتا۔ مالک مکان اپنے گھر انھیں کرایے پر دینے سے اجتناب کرتے ہیں۔ ناکوں پر پولیس انہیں بسوں اور کاروں سے نکال کر ذلت آمیز طریقے سے ان کی تلاشی لیتی ہے۔ ریاستی اداروں کی نظر میں سیاہ فام اقلیت

سے تعلق رکھنے والے مرد و زن مشکوک اور مجرم ہیں۔ آئے دن امریکی شہروں میں پولیس اور نسل پرست سفید فاموں کے ہاتھوں بے گناہ سیاہ فام باشندوں کی ہلاکت معمول بن چکی۔ جب عدالتیں سفید فام افراد کو سنگین جرائم پر نرم سزائیں دیں تو یہ فعل جلتی پر تیل چھڑکنے کے مترادف ہے۔

حد یہ ہے کہ جارج کی بہیمانہ موت کے بعد جو مظاہرے ہوئے ان میں بھی سفید فام پولیس نے نسلی تعصب کا بدترین مظاہرہ کیا۔ امریکی پولیس مظاہرین کو قابو کرنے میں ناکام نظر آئی بلکہ اس کے پُرتشدد رویے سے حالات مزید خراب ہوئے۔ امریکی پولیس شورش کو ختم کرنے میں کیوں ناکام ہے، یہ سمجھنے کے لیے ہمیں ماضی میں جھانکنا ہوگا جب امریکا میں پولیس کا قیام عمل میں آیا۔ ابتدا میں اشرافیہ نے اپنے جوئے خانوں اور کوٹھوں کی حفاظت کے لیے نجی شعبے سے لوگوں کو ملازمت پر رکھنا شروع کیا۔ بوسٹن ایک بڑی بندرگاہ تھی وہاں تجارتی مال کی دوسرے شہروں میں آمدورفت محفوظ بنانے کے لیے جہازراں کمپنیاں لوگوں کو بطور محافظ رکھتی تھیں۔ شمالی ریاستوں میں پولیس کا قیام مفرور سیاہ فام غلام پکڑنے اور ان کی بغاوتوں کو کچلنے کے لیے عمل میں لایا گیا۔ شروع میں پولیس کی تنخواہ انہی اشرافیہ خود ادا کرتے تھے لیکن وقت کے ساتھ ساتھ انھوں نے اسے ایک قومی خدمت کا محکمہ بنا کر اخراجات ریاست پر ڈال دیے۔

اگرچہ بعدازاں اصلاحات کی گئیں لیکن پولیس کا نسلی تعصب دور نہ ہوسکا وہ آج بھی سیاہ فام شہریوں سے باغی غلاموں کی طرح پیش آتی ہے۔ انسداد جرائم اور عوامی شورش سے حکمت اور تدبر سے نمٹنا ان کی تربیت میں شامل نہیں۔ نتیجتاً جدید ترین اور مہلک اسلحے سے لیس امریکی پولیس ملک بھر میں پھیلے مظاہرین کے سامنے بے بس نظر آئی ہے۔

جارج فلائیڈ کو جس طرح بے دردی سے گردن پر گھٹنا رکھ کر مارا گیا، یہ تکنیک اسرائیلی پولیس مقبوضہ فلسطینی علاقوں میں استعمال کرتی ہے۔ امریکی پولیس نے اس کی تربیت اسرائیل ہی سے پائی۔ بھارتی سیکیورٹی فورسز بھی بھارت بالخصوص مقبوضہ کشمیر میں اسرائیلیوں سے اذیت دینے کے نت نئے طریقے سیکھ کر مسلمانوں پر ظلم و ستم ڈھا رہی ہیں۔

☆☆☆

نامور امریکی سوشیالوجسٹ Richard Lachmann کی حال ہی میں شائع ہوئی کتاب First-Class Passengers on a Sinking Ship دلچسپ اور انکشافات سے بھرپور ہے۔ نیویارک میں پیدا ہونے والے پروفیسر رچرڈ کئی کتابوں کے مصنف اور اپنی تصنیفات پر معتدد ایوارڈز پا چکے۔ اپنی اس نئی کتاب میں تاریخی حوالوں سے ماضی کی مغربی سامراجی طاقتوں مثلاً سپین، فرانس اور برطانیہ کے زوال کے محرکات پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کیسے امریکا بھی انھی عوامل کا شکار ہو کر اپنی عالمی طاقت سے محروم ہو رہا ہے۔ کتاب میں بڑی وضاحت سے بتایا گیا ہے کہ کس طرح امریکی ''طبقہ اشرافیہ'' نے دولت سمیٹنے کی ہوس میں قومی مفادات قربان کیے اور اب امریکا ایک ایسے راستے پر چل نکلا ہے جس کا اختتام مکمل زوال پر ہی منتج ہوگا۔

مصنف کے مطابق امریکی صدارتی الیکشن کے اُمیدوار ایک نعرہ پورے جوش و خروش سے لگاتے ہیں کہ ہم امریکا کو دوبارہ عظیم بنائیں گے۔ یہ نعرہ ہی اس تلخ حقیقت کا کھلا اعتراف ہے کہ امریکا اب ویسا عظیم نہیں رہا جیسا کبھی تھا۔

مہنگی ترین درسگاہوں کے باوجود امریکا میں تعلیمی معیار تیزی سے گر چکا اور اس کے طلبہ کی کارکردگی معاصر ترقی یافتہ ممالک کے طالبانِ علم سے بہت پیچھے رہ گئی ہے۔ پچھلی پانچ دہائیوں کے دوران معیارِ تعلیم میں تنزلی کے باعث ترقی یافتہ ممالک کی فہرست میں امریکا چودھویں نمبر پر پہنچ چکا۔ امریکی حکومت دفاع اور صحت کے شعبوں کو خطیر رقوم مہیا کرتی ہے لیکن پچھلے کئی عشروں سے یہ عالمی طاقت ان دونوں شعبوں میں بھی ترقی یافتہ ممالک سے کہیں پیچھے رہ گئی۔

امریکا اپنی قومی دولت کا 17.1 فیصد صحت کے شعبہ پر خرچ کرتا ہے، امریکی عوام صحت کی سہولتوں کے حوالے سے سنگین مسائل سے دوچار ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ عام شہری بہت زیادہ ڈاکٹروں کے پاس جاتے یا پھر اسپتال مریضوں سے بھرے رہتے ہیں۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ امریکا میں صحت کی سہولتیں دنیا بھر کے مقابلے میں کئی گنا مہنگی کردی گئی ہیں۔ امریکی کانگریس میں شعبہ صحت سے وابستہ کمپنیوں کے زرخرید سیاستدان بیٹھے ہیں۔ وہ کوئی بھی ایسی قانون سازی نہیں ہونے دیتے جس سے ادویہ کی قیمتوں اور شعبۂ صحت کے اخراجات میں کمی لائی جاسکے۔ اسی طرح ہیلتھ انشورنس کمپنیوں کی زیادہ سے زیادہ منافع کمانے کی دوڑ بھی عام شہری کی جیب پر بوجھ کا سبب بنتی ہے۔ انشورنس، ادویہ سازی اور اسپتالوں پر قابض امریکی اشرافیہ اس قدر طاقتور ہے کہ وہ اپنے مفادات کے خلاف کسی بھی قسم کے حکومتی اقدامات برداشت نہیں کرتی۔ پروفیسر رچرڈ کے مطابق اشرافیہ کا ملکی وسائل میں زیادہ سے زیادہ حصہ وصول کرنے کی ہوس بالآخر کسی بھی قوم کو زوال پزیر کردیتی ہے۔

کتاب میں دیے گئے اعداد و شمار کے مطابق امریکی فوج بلاشبہ دنیا میں جدید ترین اسلحے اور حربی ساز و سامان کے حوالے سے اپنا کوئی ثانی نہیں رکھتی اور اقوام عالم پر اپنا دبدبہ بھی قائم رکھے ہوئے ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ عسکری برتری کے باوجود امریکا آج تک کوئی جنگ نہیں جیت سکا اور نہ ہی مہلک ترین ہتھیاروں سے لیس امریکی فوج کسی بھی مفتوحہ علاقے پر زیادہ عرصہ اپنا قبضہ برقرار رکھ سکی۔ وجہ یہ کہ امریکا عسکری ٹیکنالوجی کے میدان میں تو سب سے آگے ہے لیکن بزدلی کے سبب اپنے فوجیوں کی جانیں گنوانے سے ڈرتا ہے۔

امریکا اور اس کے نیٹو اتحادی دفاع پر روس اور چین کے مشترکہ بجٹ سے دوگنا خرچ کرتے ہیں مگر کیا وجہ کہ امریکا اس قدر کثیر سرمایہ جھونکنے کے باوجود جنگوں میں فتح حاصل نہیں کرسکا؟ یہ اہم سوال سمجھنے کے لیے ہمیں امریکی فوج کی ہیئت کا جائزہ لینا ہوگا۔ مارچ 2012 کے اعداد و شمار کے مطابق امریکی فوج 945 جرنیلوں اور ایڈمرلوں کے ساتھ دنیا میں پہلے نمبر پر ہے۔ یعنی ہر پندرہ سو افسران پر ایک Flag-Rank آفیسر موجود ہے۔ آرمی میں 10 ڈویژن فوج کی کمان کے لیے 109 میجر جنرل ہیں۔ اسی طرح ایئر فورس میں 100 ونگ ہیں جن کی کمان 3712 کرنل کرتے ہیں۔ نیوی کے پاس 285 جہاز ہیں اور ان کی کمان کے لیے 3335 کپتان موجود ہیں۔

امریکی فوج چار شعبوں میں منقسم ہے: بری، بحریہ، فضائیہ اور میرین کور۔ ہر شعبہ انتظامی اُمور میں خودمختار ہے۔ اس کے سربراہ اپنے فیصلوں میں آزاد ہوتے ہیں۔ ہر شعبے کے اپنے تعلیمی ادارے ہیں جو اپنے افسران کی تربیت کرتے اور انھیں کیریئر میں آگے بڑھنے میں مدد دیتے ہیں۔ افسران کی ترقی جدید ترین ٹیکنالوجی کے استعمال میں کس

قدر مہارت حاصل کرنے سے مشروط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شعبے کے سربراہ کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ دفاعی بجٹ سے زیادہ سے زیادہ حصہ طلب کرے تاکہ جدید ترین ہتھیار حاصل کیے جاسکیں۔ اسلحہ فروخت کرنے والے ادارے جو دراصل منافع بخش کمپنیاں اور اسٹاک مارکیٹوں میں رجسٹرڈ ہیں، اس کا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ اس امر کو مستحکم بنانے کے لیے کہ ان کے ہتھیار بکتے رہیں وہ ریٹائرڈ جرنیلوں اور افسران کو اپنے اداروں میں منہ مانگی تنخواہ پر ملازم رکھتے ہیں۔ اس ملی بھگت سے دفاعی بجٹ کا ایک بڑا حصہ ان اسلحہ ساز اداروں کے پاس چلا جاتا ہے۔

امریکی فوج کے شعبۂ جات چونکہ اپنے اپنے دائرہ کار کے اندر خودمختار ہیں، اسی وجہ سے جب وہ کسی ایک کمپنی سے کوئی ہتھیار خریدتے ہیں تو ہر شعبہ اس میں اپنی خواہشات کے مطابق تبدیلیاں کرواتا ہے۔ اس باعث قیمت میں بہت زیادہ اضافہ ہوتا اور اس کی کارکردگی میں کمی آجاتی ہے۔ مثال کے طور پر دوسری جنگ عظیم کے دوران بمبار طیارے کی قیمت پچاس ہزار ڈالر تک تھی۔ امریکی فوج سال بھر میں تقریباً پچھتر ہزار طیارے خریدتی تھی۔ 1995 میں F-151 کی قیمت 100 ملین ڈالر اور B-2 بمبار کی قیمت 2 ارب ڈالر کی ہوش رُبا سطح کو چھونے لگی۔ اسی طرح F-18 Super Hornet جو نیوی کے لیے پسندیدہ لڑاکا طیارہ ہے، اس کی قیمت 93 ملین ڈالر اور F-22 Raptor کی قیمت 355 ملین ڈالر اور F-35 کی لاگت 134 ملین ڈالر ہے۔ حیرت انگیز بات یہ کہ تمام طیارے انسدادِ شورش کی جنگ (Counterinsurgency Warfare) میں استعمال نہیں کیے جاسکتے۔

جدید ٹیکنالوجی کے حامل ہتھیاروں کے باوجود کوئی بھی جنگ جیتنے کے لیے میدان میں جوان بھیجنے کی ضرورت پڑتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس میں جان جانے کا خطرہ بدرجہ اُتم موجود رہتا ہے۔ یہ خطرہ مول لینے کے لیے نہ تو فوجی جوان تیار ہوتا ہے اور نہ ہی امریکی عوام اپنے جوانوں کی میتیں وصول کرنا چاہتی ہے۔ جارج بش کے دور سے میڈیا پر پابندی لگادی گئی کہ وہ امریکا واپس آنے والے فوجی تابوتوں کی تصاویر یا خبریں شائع نہیں کریں گے۔ مزید برآں حاضر سروس فوجیوں کی اموات کے امکانات کم کرنے کے لیے پرائیویٹ کمپنیوں مثلاً بلیک واٹر وغیرہ کو مختلف ممالک میں اہداف ٹھیکے پر دیے جاتے ہیں۔ اس طرح ان ٹھیکیدار کمپنیوں کا جانی نقصان عوام کے سامنے نہیں آتا۔

دنیا بھر کی طرح امریکی فوج کے اندر بھی بہادری کے کارنامے انجام دینے پر جو میڈل دیے جاتے ہیں ان کی تعداد اب بہت کم ہوچکی۔ سول وار کے دوران جاں نثاری کے لازوال کارنامے انجام دینے پر 1525 میڈل مختلف کیٹیگریوں میں دیے گئے جن کی تعداد دہشت گردی کے خلاف جنگ میں صرف 16 رہ گئی۔ اس سے عیاں ہے کہ دفاع پر سب سے زیادہ خرچ کرنے کے باوجود امریکا اب زیادہ عرصہ دنیا پر اپنا تسلط برقرار نہیں رکھ سکتا۔ یہ فوج امریکا کے لیے پورس کا ہاتھی ثابت ہوگی۔ امریکا کا زوال اب نوشتۂ دیوار بن چکا لیکن سوال یہ ہے کہ اس کے بعد دنیا کس نظامِ زندگی میں پناہ لے گی؟

☆☆☆

امریکا میں کورونا کے خوف سے بے پروا ہوکر معروف جامعات سفید فام طلبہ، انصاف پسند اور انسانی اقدار کے

محافظ شہری بھی عوامی تحریک کا حصہ بن رہے ہیں۔ کچھ غصیلے شہری اشرافیہ کی پرتعیش اشیا والے مہنگے برانڈ کے اسٹوروں، پٹرول پمپوں وغیرہ کی لوٹ مار کر کے اپنے جذبہ انتقام کی تسکین کرتے رہے تو کچھ نے اپنے غیض و غضب کا اظہار پولیس اسٹیشنوں اور گاڑیوں کو نذرِ آتش کر کے کیا۔ بعد ازاں پولیس نے کرفیو کی خلاف ورزی کرنے پر ایک ہزار ڈالر جرمانہ کی سزا رکھی لیکن مظاہرین اس کی پروا کیے بغیر سڑکوں پر موجود ہیں مظاہروں، مارچوں اور لوٹ مار کا یہ سلسلہ امریکا کی پچاس ریاستوں پھیل چکا۔

امریکی معاشرے کی گھٹی میں پڑا نسلی تعصب امریکا کو تباہی کے دہانے پر لے آیا۔ باشعور اور انصاف پسند امریکی شہری بھی اس پر خاموش نہیں رہے۔ سابق سیکریٹری دفاع جیمز میٹس نے صدر ٹرمپ کی ملکِ شام کی پالیسی سے اختلاف کرتے ہوئے دسمبر 2018 میں استعفا دے دیا تھا۔ موجودہ صورتحال کے تناظر میں انھوں نے ٹرمپ کی مذمت کرتے ہوئے بیان دیا: ”صدر اپنے طرزِ عمل سے قوم کو تقسیم کر رہے ہیں۔ فوج کو امریکی آئین میں دیے گئے بنیادی حقوق کی خلاف ورزی کا حکم دینا بجا نہیں۔ مظاہرین آئین کے تحت سبھی امریکیوں کے لیے مساوی حقوق کا مطالبہ کر رہے ہیں اور اس میں وہ ہر طرح سے حق بجانب ہیں۔“

مظاہرین اس حکومتی دوعملی پر بھی سیخ پا ہیں کہ اسپتالوں میں طبی عملے کو کورونا وائرس سے بچاؤ کی حفاظتی کٹ تو میسر نہیں لیکن پولیس اور فوجیوں کو ہر طرح کے حفاظتی لباس مہیا کیے گئے۔ سی این این کی لائیو کوریج کرنے والے سیاہ فام صحافی کو پولیس نے گرفتار کر لیا اور اس کے سفید فام ساتھی کو چھوڑ دیا۔ اس واقعے نے سیاہ فام امریکیوں کے اندر عدم تحفظ کا احساس مزید گہرا کر دیا۔ طاقت کے بے رحم استعمال سے کسی مسئلے کو دبانا مہذب طریقہ نہیں۔ امریکا، بھارت، فرانس یا کوئی بھی ملکِ ریاستی طاقت سے مزاحمتی تحریکوں کو دبانے میں آج تک کامیاب نہیں ہو سکا۔

جلتی پر تیل کا کام صدر ٹرمپ کے ٹویٹ When the looting starts,the shooting starts. نے کیا۔ گویا انھوں نے لوٹ مار کرنے والوں کو گولی مارنے کی دھمکی دی۔ بگڑتی صورتحال کے پیشِ نظر صدر ٹرمپ نے امریکا میں مارشل لاء لگانے کا عندیہ دیتے ہوئے واشنگٹن ڈی سی فوج کے حوالے کر دیا۔ حالات اس قدر کشیدہ ہو گئے کہ مظاہرین کے خوف سے صدر ٹرمپ کو وائٹ ہاؤس کے بنکر میں چھپنا پڑا۔ اس کے بعد اپنی خفت مٹانے کے لیے انھوں نے وائٹ ہاؤس سے نزدیک ایک چرچ کے باہر بائبل ہاتھ میں پکڑ کر تصاویر اُتروائیں۔

امریکا کی دیکھا دیکھی دیگر ممالک کینیڈا، جرمنی، برطانیہ، فرانس، دیگر یورپی اور افریقی ملکوں میں بھی عام لوگ بڑی تعداد میں پرامن مارچ میں شامل ہوئے۔ یہ مظاہرے اسی لیے منعقد ہوئے کہ ایلیٹ طبقے نے اپنے مفادات کے حصول کی خاطر جو عالمی استحصالی نظام تخلیق کر ڈالا ہے، اس کے خلاف آواز بلند کی جائے۔ نیوزی لینڈ میں Black Lives Matter کے حوالے سے امریکا کے باہر دنیا کا سب سے بڑا مظاہرہ ہوا۔ حالات اور واقعات سے عیاں ہے کہ یہ آواز بلند تر ہوتی جائے گی۔

ممکن ہے کہ عالمی ایلیٹ طبقہ اپنی طاقت و اقتدار بچانے کے لیے کوئی نئی چال چل دے۔ مدعا یہ ہے کہ عوام کی

توجہ اصل مسائل سے ہٹ کر فروعی باتوں پر لگ جائے۔ اگر وہ اپنی چال میں کامیاب نہ ہو سکا تو امریکا سمیت مختلف ممالک میں اشرافیہ اور زیردست طبقات کے مابین خانہ جنگی کا خطرہ جنم لے سکتا ہے۔ یہ آشکارا ہے کہ امریکا تیزی سے اکلوتی سپر پاور ہونے کا اعزاز کھو رہا ہے۔ دنیا بھر کے دانشور اس سوچ میں ہیں کہ اس کی جگہ کون لے گا؟ چین یقیناً بڑی عسکری و معاشی قوت ہے لیکن وہ تن تنہا دنیا میں عادلانہ و منصفانہ عالمی نظام قائم کرنے کی پوزیشن میں نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ چین، روس، وسط ایشیا کے ممالک، ترکی، ایران اور پاکستان پر مشتمل طاقتور اتحاد ایک نیا انسان دوست اور مبنی بر عدل و انصاف نظام لا سکتا ہے۔

☆☆☆

عام خیال یہ تھا کہ پانچ چھے ماہ کے اندر نئے کورونا وائرس سے پھیلی وبا ختم ہو جائے گی۔ دنیا ویکسین تیار کر لے گی اور اس سے پیدا شدہ مسائل حل ہونا شروع ہو جائیں گے لیکن وبا طول پکڑ چکی اور مستقبل قریب میں بھی اس سے جان چھوٹتی نظر نہیں آتی۔ پوری دنیا میں معاشی، معاشرتی اور سماجی افراتفری ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھ رہی ہے اور لوگوں کی پریشانیاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ متاثرین کی تعداد میں اضافہ جاری ہے اور اُسی حساب سے شرح اموات میں بھی۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ دنیا کے تمام ممالک کی قیادتیں کسی ایک فورم پر سر جوڑ کر بیٹھتیں، عالمی وسائل کو بروئے کار لاتے ہوئے اس مسئلے کا پائیدار حل تلاش کر کے انسانیت کو اس گمبھیر صورتحال سے نجات دلاتیں...... مگر افسوس! ایسا ہونے کے بجائے انتشار کی فضا نظر آئی۔ خاص طور پر عالمی قیادت کے دعویدار امریکا کا کردار اس حوالے سے خاصا مایوس کن رہا۔ صدر ٹرمپ کی غیر دانشمندانہ پالیسیوں کی وجہ سے امریکا میں وفاق اور ریاستی حکومتوں کے مابین بہت سے اختلافات دیکھنے کو ملے۔ اِن کی ساری توجہ نومبر میں ہونے والے صدارتی انتخابات جیتنے پر مرکوز ہے اور وہ وبا کو بھی الیکشن کارڈ کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔

صدر ٹرمپ نے دنیا میں کووڈ 19 کے پھیلاؤ کا ذمہ دار چین کو ٹھہرایا اور اس کے ساتھ معاملات مزید خراب کرنے کی ہر ممکن سعی کرتا رہا۔ حالانکہ چین کا کردار اس معاملے میں خاصا مثبت رہا۔ وہ مل جل کر انسانیت کو درپیش اس عظیم آفت کا مقابلہ کرنا چاہتا ہے لیکن امریکا چین کو زچ کرنے کا کوئی موقع ضائع نہیں کرتا۔ چاہے وہ ہانگ کانگ میں مظاہروں کا سلسلہ ہو، ہواوے کمپنی کا معاملہ یا پھر چینی مصنوعات پر درآمدی ٹیکس میں بے تحاشا اضافہ کر کے ٹیرف وار کا آغاز۔ امریکا عالمی ادارۂ صحت سے بھی امریکی پالیسی کے تحت چین میں کورونا وائرس کے حوالے سے اعداد و شمار شائع نہ کرنے پر ناراضی کے سبب علیحدہ ہو چکا۔ یہی رویہ ہمیں دنیا کی پانچویں بڑی معیشت بھارت کی قیادت میں بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ نسل پرست سفید فام امریکیوں کی طرح، نریندر مودی کی قیادت میں ہندو انتہا پسندوں نے بھارت میں اقلیتوں خصوصاً مسلمانوں کا جینا حرام کر رکھا ہے بلکہ وہ صدر ٹرمپ کی شہ پر چین کے ساتھ بھی سرحدی تنازع پر فوجی جھڑپیں شروع کر چکا۔ ساڑھے تین ہزار کلو میٹر لمبی لائن آف ایکچوئل کنٹرول پر چین اور بھارت کی فوجیں آمنے سامنے ہیں۔ چینی صدر نے اپنی افواج کو کسی بھی طرح کی جنگ کے لیے تیار رہنے کا حکم دے دیا ہے۔

اسی طرح بھارت اور نیپال کے درمیان بھی سرحدی اُمور کے حوالے سے کشیدگی بڑھی ہے۔ بھارت آئے دن مقبوضہ کشمیر میں نہتے شہریوں پر تشدد کر کے انھیں شہید کر رہا ہے۔ جنگ بندی لائن پر اشتعال انگیز کارروائیوں سے بے گناہ شہریوں کو زندگیوں سے محروم کیا جا رہا ہے۔ اسی اثنا میں صدر ٹرمپ نے وبا اور اس سے جڑے مسائل پر غور و فکر اور قابو پانے کے حوالے سے جی سیون تنظیم کا طے شدہ اہم اجلاس کچھ رکن ممالک کی شرکت سے معذرت کی بنا پر ملتوی کر دیا۔

بڑی طاقتوں کی طرف سے کوئی متفقہ لائحہ عمل سامنے نہ آنے کی وجہ سے تمام ممالک اپنے اپنے طور پر ہی اس وبا سے نمٹنے میں مصروف ہیں۔ یہ بحث بھی چھڑ چکی کہ گلوبلائزیشن کا دور اب اپنے انجام کی طرف چل پڑا اور اقوام عالم قوم پرستی کی طرف گامزن ہو گئی ہیں۔ کچھ لوگ جمہوریت کی ناکامی کی باتیں کر رہے تو کچھ کا خیال ہے کہ سخت آمرانہ حکومت ہی مسائل کا حل ہے۔ غرض ہر کوئی اپنا اپنا راگ الاپتا ہے لیکن ان مسائل سے کیسے نکلا جائے؟ اس کا جواب ہنوز موجود نہیں۔

☆☆☆

کوویڈ 19 ایسا عالمگیر مسئلہ ہے جو تمام ممالک کو بلاتفریق اپنی لپیٹ میں لے چکا۔ اس میں غریب امیر کا کوئی فرق نہیں۔ افریقا سے لے کر ایشیا تک، یورپ اور مریکا سب اس کی لپیٹ میں ہیں۔ اس وبا نے دنیا کی ہیئت ترکیبی بدل کر رکھ دی۔ ایسا محسوس ہوا کہ کسی نے ''فیکٹری ری سیٹ'' کا بٹن دبایا اور روزمرہ زندگی کا رخ بدل ڈالا۔ دنیا میں طاقت کا محور تبدیل ہو رہا ہے۔ وبا کی وجہ سے دنیا کو جن معاشی، سماجی اور معاشرتی مسائل کا سامنا ہے، ان کا کوئی حل کسی قیادت کے پاس نہیں۔ اس وجہ سے اب قیادت کا خلا بھی پیدا ہو گیا ہے۔ مسائل وقت کے ساتھ ساتھ گمبھیر ہو رہے ہیں۔ حکومتیں قرضوں میں دھنستی چلی جا رہی ہیں اور معیشتیں سکڑ گئیں ہیں جو آنے والے دنوں میں بڑی خرابی کا پیش خیمہ بن سکتی ہیں۔

عالمی سرمایہ دارانہ نظام کا کھوکھلا پن بھی اس وبا کی بدولت ساری دنیا پر عیاں ہو چکا۔ دنیا کے وسائل پر چند گروہ عرصہ دراز سے قابض ہیں۔ محروم اور مقہور طبقات سے تعلق رکھنے والے افراد میں مسلسل اضافہ جبکہ بڑی بڑی کارپوریشنوں اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کی تجوریاں دولت کے انبار سمیٹ رہی ہیں۔ دنیا میں امیر اور غریب کا فرق بہت زیادہ بڑھ چکا۔ پچھلی چند دہائیوں میں مصنوعی طریقے سے مختلف ملکوں کی معیشتوں کا حجم بڑھایا گیا تھا مگر وہ وبا کے ایک ہی جھٹکے سے زمین بوس ہو گئیں۔ دنیا میں اسلحہ کی دوڑ کی وجہ سے ملکوں کے دفاع پر اُٹھنے والے اخراجات بہت بڑھ چکے جس کا فائدہ بالآخر بڑی بڑی منافع بخش کمپنیوں کو ہی پہنچا۔ وبا نے عام آدمی کو سوچنے پر مجبور کیا آخر اس اسلحے کے انبار سے اُسے کیا فائدہ حاصل ہوا؟ امریکا کی زیر قیادت یہ سرمایہ دارانہ نظام اب زمین بوس ہوتا نظر آتا ہے۔

یہ وبا قدرت کی طرف سے پیغام ہے کہ ہم بطور انسان اپنے سیاسی، معاشی اور معاشرتی چلن پر غور کریں اور انفرادی واجتماعی معاملات میں انھی اقدار کی طرف لوٹ جائیں جو انسانی احترام اور اعلیٰ قدروں پر مشتمل ہیں۔ تبدیلی کا پہیہ چل

پڑا ہے۔ اس وقت اگر قدرت کی طرف سے ملی اس وارننگ کو نظر انداز کیا گیا تو پھر ایک بہت بڑی تباہی ہماری منتظر ہو گی۔

موجودہ حالات سے نکلنے کے لیے ہمیں آؤٹ آف باکس سوچنا اور پھر ہر طرح کے نتائج کو قبول کرنا ہو گا۔ دنیا بھر میں حکومتیں لاک ڈاؤن پر اصرار کر رہی ہیں لیکن یہ بھی مسئلے کا کوئی پائیدار حل نہیں۔ معاشرے کا وہ طبقہ جو خطِ غربت سے نیچے ہے، بھوک کو بیماری پر ترجیح دیتا ہے۔ کیونکہ اگر وہ بیماری سے بچ بھی گیا تو بھوک اُسے مار ڈالے گی۔ لاک ڈاؤن شاید اعلیٰ طرزِ زندگی رکھنے والے فرد کے لیے بے ضرر ہو، کیونکہ اس کے پاس کھانے پینے کے وافر وسائل ہیں اور وہ اپنی گاڑی میں سفر کر سکتا ہے لیکن وہ بے چارہ جو روزانہ کی بنیاد پر کماتا ہے، اس کے لیے اپنی زندگی کی پہیہ چلانا مشکل ہو گیا۔

☆☆☆

دنیا کے بیشتر ممالک میں نظامِ عدل وانصاف اپنی افادیت کھو چکا۔ بروقت انصاف نہ ملنے سے لوگوں نے قانون کو اپنے ہاتھوں میں لینا شروع کر دیا۔ پوری دنیا میں اشرافیہ نے قانون کو گھر کی لونڈی بنا رکھا ہے۔ غریب کو کسی چھوٹے سے جرم کی سزا دینے کے لیے قانون فوراً حرکت میں آ جاتا ہے۔ پچھلے دنوں ہم نے اپنے ملک میں بھی دیکھا کہ ایک بہت بڑے پراپرٹی ٹائیکون کی بیٹی محافظوں کے ساتھ دندناتی ہوئی ایک اداکارہ کے گھر داخل ہوئی اور مار پیٹ کرنے کے بعد اسے آگ لگانے کی کوشش کی۔ اس واقعے کی ویڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی۔ اسی طرح پچھلے دنوں ہزارہ موٹروے پر ایک اعلیٰ افسر کی بیوی کی گالم گلوچ کی ویڈیو ان رویوں کی غماض ہے کہ مٹھی بھر اشرافیہ پورے معاشرے کو یرغمال بنا چکے۔ عام آدمی کے اندر پکتا ہوا لاوا اگر پھٹ پڑا تو بڑے بڑے محلات میں آسودہ لوگ سڑکوں پر گھسٹتے ہوئے نظر آئیں گے۔

ہماری بیوروکریسی فرسودہ نظام کی محافظ بن چکی۔ وہ اپنی موجودہ ذہنی ساخت اور تربیت کے ساتھ دورِ جدید کے مسائل حل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔ بچے اسکول نہیں جا پا رہے اور زیادہ تر اساتذہ پریشان ہیں کہ وہ آن لائن کیسے پڑھائیں اور بچے کی دلچسپی پڑھائی میں کس طرح برقرار رکھیں؟ کاروباری اداروں کو اپنا وجود قائم رکھنے کے حوالے سے سخت مشکلات درپیش ہیں۔ کچھ کاروبار تو سرے سے ہی ختم ہو چکے اور کچھ جگہوں پر اخراجات پر قابو پا کر خسارہ کم کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے لیکن اصل مسئلہ ان حالات میں ذرائع آمدن بڑھانے کی تدابیر تلاش کرنا ہے۔ کیونکہ صرف اخراجات میں کٹوتی کرنے سے ہونے والے نقصانات کا ازالہ ممکن نہیں۔

بدلتے حالات کا تقاضا ہے کہ ایسے نئے اُبھرتے شعبوں پر نظر رکھی جائے جن سے آمدن حاصل ہونے کے امکانات روشن ہوں۔ وزیراعظم عمران خان کا محترمہ ڈاکٹر ثانیہ نشتر کو بیرونِ ملک سے لانے کا فیصلہ اور احساس پروگرام کے ذریعے غریب لوگوں میں شفاف طریقے سے اربوں روپے کی تقسیم کو ممکن بنانے کا عمل قابلِ تحسین ہے۔ ڈاکٹر ثانیہ نشتر عالمی ادارہ صحت، ورلڈ اکنامک فورم اور امریکی نیشنل اکیڈمی آف سائنس میں اعلیٰ عہدوں پر کام کر

چکی ہیں۔ حکومت ہیورو کریسی میں قابل اور ماہر لوگوں کو شامل کرنے کے لیے قواعد وضوابط میں ترامیم بھی لا رہی ہے تاکہ اپنے اپنے شعبے میں ماہر افراد کو براہ راست گریڈ 18 یا اس سے اُوپر تعینات کر کے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اُٹھایا جاسکے۔ وزیراعظم پاکستان کا یہ بھی ایک احسن قدم ہے کہ وہ مختلف حادثات اور اسکینڈلز پر بنائے جانے والے کمیشنوں کی رپورٹوں کو سرکاری طور شائع کر رہے ہیں تاکہ ہمیں پتا چلے، کون اس ملک کے وسائل لوٹتا رہا اور کہاں ہم سے کوتاہیاں ہوئیں۔ اس طرح مستقبل میں بہتر حکمت عملی اپنا کر ان سے بچا جاسکے گا۔

☆☆☆

درپیش مسائل کو سمجھنے اور ان سے نکلنے کے لیے راہیں ڈھونڈنے کی اُمیدوں کا مرکز نسل نو کو بنانا ہوگا۔ اب ہر شعبہ ہائے زندگی میں قابل اور پرعزم نوجوانوں کو سامنے لانا وقت کی ضرورت ہے۔ نوجوانوں کی ایک خاصیت یہ ہے کہ ان کا دامن دنیاوی آلائشوں سے ممکنہ حد تک صاف ہوتا ہے۔ پھر وہ دورِ حاضر کے تقاضے سمجھتے اور نئی ٹیکنالوجی کو برتنا بھی جانتے ہیں۔ دل وجان سے قومی مقاصد کے حصول پر جت جانے کا جذبہ بھی رکھتے ہیں۔ ہمیں نوجوانوں کو موقع دیتے ہوئے پورے اعتماد کے ساتھ ان پر حالات سنبھالنے کی ذمہ داری ڈالنا ہوگی اور خود اُن کی پشت پناہی کرتے ہوئے پچھلی صفوں میں کھڑے ہونا ہوگا۔ اُمید واثق ہے کہ اس سے مسائل کا حل جلد نکلے گا اور اداروں کے اخراجات میں بھی خاطر خواہ کمی آئے گی۔ ہمارے جو شیلے اور مثبت طرز فکر رکھنے والے نوجوان پنشنر کاروں سے کم اُجرت پر کام کر لیتے ہیں۔ خود کو منوانے کا جذبہ اور لگن انھیں نت نئے منصوبے بنانے میں مدد دیتی ہے۔ بلاشبہ اداروں میں براجمان لوگ تجربے کار ہیں لیکن موجودہ مسائل کے حل کے لیے ان کا تجربہ شاید ہمارے کسی کام نہ آسکے۔

ہانگ کانگ میں ہوتے احتجاج کی قیادت بھی نوجوانوں کے ہاتھ میں ہے۔ اس سے قطع نظر کہ ان کے مطالبات درست ہیں یا غلط وہ بڑی یکسوئی سے اپنے مطالبات چینی حکومت کے سامنے رکھ رہے ہیں۔ اگر ہم نے پاکستان، بھارت اور دنیا کے دیگر حصوں میں نوجوان قیادت کو موقع نہیں دیا تو خدانخواستہ حالات اس قدر خراب ہو سکتے ہیں کہ پھر شاید نئی نسل سے بھی نہ سنبھل سکیں۔ جب اہل قیادت نہ ہو تو پھر محض چنگاری بھڑک کر سب کچھ بھسم کر ڈالتی ہے۔ تمام شعبوں میں نوجوان قیادت کا سامنے آنا ناگزیر ہے جو طویل المدتی منصوبہ بندی کر کے ملک کو پائیدار ترقی کی راہ پر گامزن کر دے۔ باشعور نوجوانوں کی دنیا بھر کے حالات پر گہری نظر ہے۔ سوشل میڈیا یا ران کے درمیان تبادلہ خیال بھی جاری ہے۔ نتیجتاً وہ منظم ہو رہے ہیں۔ ہمیں حتی الامکان وطن واپس آنے والے دنیا کے معروف تعلیمی اداروں سے فارغ التحصیل پاکستانی نوجوانوں کو آگے بڑھنے کا موقع دینا ہوگا۔ یہی بہترین وقت ہے کہ ان کے مضبوط ہاتھوں میں قیادت سونپ دی جائے۔

☆☆☆

بحیثیت مسلمان ہمارا یقین ہے کہ یہ دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ ہر مصیبت ہمارے لیے آزمائش کا درجہ رکھتی ہے۔ سورۃ البقرہ کی آیت نمبر 55 اور 56 میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

”ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے، کچھ خوف سے، کچھ بھوک سے، جانی اور مالی نقصان سے، پھلوں کے نقصان سے، اس پر صبر کرنے والوں کے لیے خوشخبری ہے۔ جب ان لوگوں پر کوئی مصیبت آتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ بیشک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بیشک ہم اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔“ اس آزمائش کی گھڑی ہمیں جہاں دنیاوی اسباب اختیار کرنے ہیں اپنے رب کی طرف رجوع کرتے ہوئے مشکلات کو بھی خندہ پیشانی سے برداشت کرنا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے لہٰذا وبائی صورتحال میں پاکستان کی ترقی کے مواقع بھی پوشیدہ ہیں۔ وطن عزیز محل وقوع کے اعتبار سے منفرد مقام کا حامل ہے۔ امریکا اور چین کے درمیان نئی سرد جنگ چھڑنے سے چین کا پاکستان پر انحصار بڑھ گیا ہے جس سے دونوں ملکوں کو معاشی طور پر فائدہ حاصل ہوگا۔ دوسری طرف امریکا کو بھی افغانستان کی دلدل سے نکلنے کے لیے ہماری مدد درکار ہے۔ آج گھٹن حالات میں دنیا کو خوراک کی کمی کا سامنا ہے لیکن اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے پاکستان ایک زرعی ملک ہے۔ بہتر منصوبہ بندی سے ہم نہ صرف خوراک کے معاملے میں خودکفیل ہوں گے بلکہ دنیا کے دیگر ممالک کی غذائی ضروریات بھی پوری کر سکتے ہیں۔ عالمی منڈی میں تیل کی گرتی قیمتیں بھی اللہ کی طرف سے ہمارے لیے رحمت کا پیغام ہے۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنی شہرہ آفاق نظم ”ساقی نامہ“ میں موجودہ عالمی صورتحال کی بہت عمدہ عکاسی کی ہے جس کے چند اشعار پیش خدمت ہیں:

زمانے کے انداز بدلے گئے
نیا راگ ہے، ساز بدلے گئے
پرانی سیاست گری خوار ہے
زمیں میر و سُلطاں سے بیزار ہے
گیا دورِ سرمایہ داری گیا
تماشا دِکھا کر مداری گیا
گراں خواب چینی سنبھلنے لگے
ہمالہ کے چشمے اُبلنے لگے
خرد کو غلامی سے آزاد کر
جوانوں کو پیروں کا استاد کر

دنیا کا دوسرا امیر ترین آدمی

بل گیٹس...

یکتا سماجی راہنما یا مہا فراڈیا؟

Pakistanipoint

ایک ذہین انسان کی حیرت انگیز، سبق آموز اور افسوس ناک داستان، لالچ و ہوس کے جال میں پھنس کر اُس نے بڑی مکاری و عیاری سے عوامی فلاح و بہبود اپناتے ہوئے مالی فوائد پانے کے شیطانی فن کو اپنی ندرت و قدرت سے نئی صورت شکل دے ڈالی

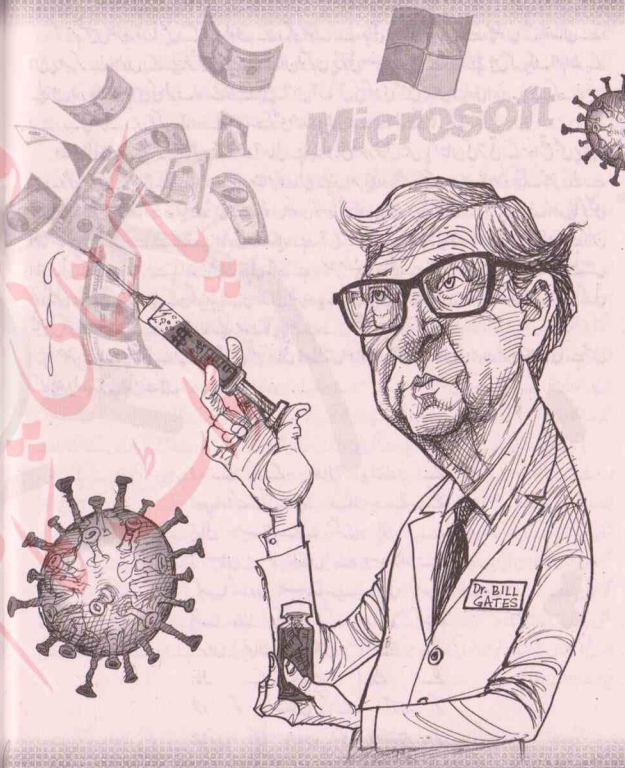

سید عاصم محمود

یہ 25 مئی کی شام ہے۔ امریکی شہر مِنی ایپلس کے ایک گروسری اسٹور میں چھیالیس سالہ سیاہ فام، جارج فلائیڈ داخل ہوا۔ وہ سگریٹس خریدنا چاہتا تھا۔ ملازم اسٹور کو رقم دی تو اُسے شک ہوا کہ بیس ڈالر کا ایک نوٹ جعلی ہے۔ اس نے فوراً پولیس کو فون کر دیا۔ تھوڑی دیر میں آٹھ دس پولیس والے وہاں آپہنچے۔

جارج فلائیڈ اپنی کار میں وہیں موجود تھا۔ پولیس نے اُسے گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کی مختلف ویڈیوز موجود ہیں۔ ان سے عیاں ہے کہ جارج ڈپریشن کا شکار تھا۔ دراصل وہ ایک ریسٹورنٹ میں بطور گارڈ کام کرتا تھا۔ لاک ڈاؤن کی وجہ سے اپنی ملازمت سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ عام فہم یہ کہتی ہے کہ ایسے موقع پر پولیس کو اُسے دلاسا دینا چاہیے تھا مگر تین سفید فام پولیس والوں نے اُسے زمین پر لٹا دیا اور ایک ہٹا کٹا افسر جارج کی گردن پر گھٹنا رکھ کر طمطراق سے بیٹھ گیا۔

جارج درد سے کراہنے لگا۔ اس نے کہا: ''میں سانس نہیں لے سکتا۔'' اس نے پھر پولیس والوں سے استدعا کی کہ اُسے چھوڑ دیں مگر پولیس افسر پونے نو منٹ تک اس کی گردن پر گھٹنا رکھے بیٹھا رہا۔ لگتا تھا کہ وہ ایک سیاہ فام کی سرعام بے عزتی اور تشدد کر کے لطف اندوز ہو رہا ہے لیکن اسی خوفناک عمل سے گزر کر جارج کی موت واقع ہو گئی۔

پولیس والے اتنے دیدہ دلیر تھے کہ تماشائی اس دردناک منظر کی ویڈیو بناتے رہے مگر انھیں کوئی پروا نہیں تھی۔ لیکن بعد میں انھی ویڈیوز نے پورے امریکا میں آگ لگا دی۔ ہزارہا سیاہ اور سفید فام شہری مل کر امریکی پولیس کی حیوانیت، ظلم اور بے حسی کے خلاف مظاہرے کرنے لگے۔ کئی شہروں میں سکیورٹی فورسز اور مظاہرین کا خونی ٹکراؤ ہوا۔ اس باعث وہاں کرفیو لگانا پڑا مگر مظاہرے جاری رہے۔ نیز لوٹ مار کے واقعات بھی سامنے آئے۔

جارج فلائیڈ قدرتی موت نہیں مرا بلکہ اُسے قتل کیا گیا۔ یہ واضح طور پر امریکا کی سفید فام اکثریت میں پائے جانے والے تعصب، احساس برتری اور غرور و تکبر کا بدترین مظاہرہ تھا جس نے ایک انسان کی قیمتی جان لے لی۔ یہ قتل امریکا میں رائج متعصب اور کرپٹ نظام کی وجہ سے ظہور پزیر ہوا۔

امریکا کے حکمران بڑے فخر سے اپنی مملکت کو جمہوریت، انسانی حقوق اور انصاف و مساوات کا گڑھ قرار دیتے ہیں۔ سچ مگر یہ ہے کہ سفید فام اکثریت سے تعلق رکھنے والے کئی لوگ اقلیتوں کے معاملے میں نسلی، لسانی، مذہبی، معاشی اور سیاسی تعصب رکھتے ہیں۔ اسی تعصب کے باعث امریکا میں دو قانون وجود میں آچکے...... ایک طاقتور اور دوسرا کمزور کے لیے۔ مجرم اگر بااختیار ہو تو وہ سزا سے بھی بچ جاتا ہے۔ کمزور ناکردہ جرم کر کے بھی پھنس جائے تو اُسے کڑی سزا ملتی ہے۔

یہی دیکھیے کہ صرف بیس ڈالر کی وجہ سے جارج فلائیڈ کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے مگر اسی امریکا میں میں کئی طاقتور ہر سال اربوں ڈالر کی ٹیکس چوری کرتے ہیں اور قانون ان کا بال بیکا نہیں کر پاتا۔ وہ غیر قانونی اور غیر اخلاقی سرگرمیاں اپنا کر اربوں ڈالر کماتے ہیں مگر امریکی قانون انھیں کچھ کہنے کی ہمت نہیں کرتا کیونکہ وہ سفید فام ہیں اور طاقتور بھی! اس انوکھے اعجوبے کی بہترین مثال بل گیٹس ہے، دنیا کا امیر ترین آدمی جسے بیشتر پاکستانی معصوم، انسان دوست اور غریب پرور سمجھتے ہیں۔

وزیراعظم پاکستان سے ملاقات

یہ ستمبر 2019ء کی بات ہے، وزیراعظم پاکستان، عمران خان کی ملاقات مشہور امریکی سافٹ ویئر کمپنی، مائیکروسافٹ کے بانی، بل گیٹس سے نیویارک میں ہوئی۔ پچھلے بیس برس سے وہ غیر سرکاری سماجی تنظیم بل اینڈ ملینڈہ گیٹس فاؤنڈیشن

چلا رہا ہے۔ یہ مالی لحاظ سے دنیا کی سب سے بڑی این جی او ہے۔ غربت، جہالت، بیماری اور آلودگی وغیرہ کے دنیا سے خاتمے کا قابل رشک اور عظیم الشان پروگرام رکھتی ہے۔ اس ضمن میں حکومتوں سے لے کر نجی اداروں کو بھاری بھرکم مالی امداد دیتی ہے۔

پاکستانی وزیراعظم سے ملاقات کے بعد بل گیٹس نے اعلان کیا کہ اس کی تنظیم پاکستان سے بیماری و غربت ختم کرنے کے لیے حکومت کو 20 کروڑ ڈالر فراہم کرے گی۔ اہل پاکستان نے اس اعلان کا خیر مقدم کیا کیونکہ وہ بل گیٹس کو غریبوں کی ہمدرد، رحم دل اور مخیر ہستی سمجھتے ہیں۔ ایسا دولت مند جو اپنے اربوں ڈالروں کے ذریعے بنی نوع انسان کو اہم مسائل سے نجات دلانا چاہتا ہے۔ اسی لیے بل گیٹس کو دنیا بھر میں عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

جاننے والے مگر جانتے ہیں کہ بل گیٹس کی سماجی سرگرمیاں محض ایک پردہ ہیں۔ اس پردے کے ذریعے دراصل بل گیٹس نے اپنے گناہ اور جرائم چھپانے کی کوششیں کیں اور میڈیا کی طاقت کے ذریعے اپنے مشن میں کامیاب رہا۔ بنیادی طور پر وہ ایک عیار کھرب پتی ہے۔ اس نے غریبوں کی فلاح و بہبود پر مبنی سرگرمیاں بے غرضی سے یا انسان دوستی میں انجام نہیں دیں بلکہ ان سے بھی بل گیٹس کے ذاتی یا کاروباری مفادات وابستہ تھے۔

ایک سفید جھوٹ

بل گیٹس کی داستان زندگی ہمیں بتاتی ہے کہ دورِ جدید میں انتہائی اونچے پیمانے پر لالچ اپنا مکروہ روپ کیونکر دکھا رہا ہے۔ یہ شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ اپنی بیشتر آمدن سماجی فلاح و بہبود پر خرچ کرتا ہے۔ یہ مگر تصویر کا ایک رخ ہے۔ دوسرا رخ مخفی حقائق سامنے لاتا ہے۔

2010ء میں بل گیٹس کے کُل اثاثہ جات 54 ارب ڈالر مالیت رکھتے تھے۔ آج یہ 106 ارب ڈالر کا مالک

بل گیٹس عمران خان کے ساتھ

ہے۔ گویا دس برس میں اس کے اثاثہ جات کی مالیت تقریباً دگنی بڑھ گئی۔ یہ چمتکار کیونکر انجام پایا؟ اس کرشمے کے پیچھے یہی وجہ پوشیدہ ہے کہ بل گیٹس سماجی سرگرمیوں کی آڑ میں اپنے مالی مفادات پورے کرنے کی بھرپور سعی کرتا ہے۔

اس امریکی کھرب پتی کا طریق واردات خاصا پیچیدہ ہے۔ مختصر یہ کہ اس نے اپنی کُل دولت میں سے 60 ارب ڈالر سٹاک مارکیٹوں میں لگا رکھے ہیں۔ یعنی اس نے اپنی بھاری بھرکم رقم سے مختلف کمپنیوں کے حصص خرید رکھے ہیں۔ 40 ارب ڈالر اس نے مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں میں لگائے ہیں۔ بقیہ چھے ارب ڈالر کی وہ جائیدادیں، ہوائی جہاز، کاریں وغیرہ رکھتا ہے۔

بالواسطہ فائدہ

بل گیٹس کا طریق عمل یہ ہے کہ وہ اس انداز میں سماجی سرگرمیوں پر بھاری رقومات خرچ کرتا ہے کہ بیشتر رقم انھی کمپنیوں کو مل جائے جن میں موصوف نے سرمایہ کاری کر رکھی ہے یا ان کے حصص خرید رکھے ہیں۔ یوں وہ اپنی این جی او کے توسط سے بالواسطہ طور پر ان ملٹی نیشنل کمپنیوں کو فائدہ پہنچاتا ہے۔ بل گیٹس بڑے فخر سے بتاتا ہے کہ وہ پچھلے بیس برس کے دوران غریبوں کی فلاح و بہبود پر 36 ارب ڈالر خرچ کر چکا۔ سچ مگر یہ ہے کہ اس رقم کا کچھ حصہ ہی غریبوں کی بھلائی پر خرچ ہوا۔ بیشتر حصہ ایسی سرگرمیوں پر لگا جن کے ذریعے کسی نہ کسی طرح ملٹی نیشنل کمپنیوں کو فائدہ پہنچ سکے۔ گویا بل گیٹس عوامی فلاح و بہبود کے کاموں پر جو رقم خرچ کرے، اس کے پیچھے موصوف کا کوئی نہ کوئی مفاد ضرور ہوتا ہے۔

ملٹی نیشنل کمپنیوں میں کی گئی سرمایہ کاری سے بل گیٹس کو اربوں ڈالر آمدن ہوتی ہے۔ وہ اس آمدن کا بڑا حصہ اپنی سماجی تنظیم کو دیتا ہے۔ لیکن گیٹس فاؤنڈیشن اس طریقے سے یہ رقم خرچ کرتی ہے کہ اپنی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو بھی زیادہ سے زیادہ مالی فائدہ پہنچ سکے۔

پاکستان: ایک بڑی منڈی

مثال کے طور پر بھولے بھالے پاکستانی یہی سمجھتے ہیں کہ پاکستان کو 20 کروڑ ڈالر دے کر بل گیٹس نے بڑا نیک کام انجام دیا۔ حقیقت مگر یہ ہے کہ اس مالی امداد سے بل گیٹس اپنے کئی مفادات کی تکمیل کرے گا۔ پاکستان بلحاظ آبادی دنیا کی پانچویں بڑی منڈی ہے۔ چنانچہ وہ پاکستانی حکومت کو کہہ سکتا ہے کہ فلاں فلاں عالمی کمپنیوں سے مطلوبہ اشیا خریدی جائیں۔ یہ وہ کمپنیاں ہیں جن میں بل گیٹس نے سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ ان کمپنیوں کو فائدہ پہنچانے اور بزنس بڑھانے ہی سے بل گیٹس کی دولت بھی بڑھتی ہے۔ آخر صرف دس برس میں اس کی دولت دگنی کیسے ہوگئی؟

نئے کورونا وائرس سے پھیلی وبا نے جہاں انسانی زندگی کے کئی پہلو تلپٹ کر ڈالے، وہیں اس نے بل گیٹس کے گرد تنا پاکیزگی کا ہیولا بھی چاک کر دیا۔ کروڑوں انسانوں پر یہ بھیانک سچائی آشکارا ہوئی کہ سماجی سرگرمیوں کے پیچھے موصوف نے اپنے مالی مفادات بھی چھپا رکھے تھے۔

ہیرے سے زیرو

بل گیٹس اپنی دولت غریبوں کی فلاح و بہبود پر خرچنے، انسان دوست اعلیٰ نظریات رکھنے اور اپنی رحم دلانہ طبیعت کے باعث پوری دنیا میں خصوصاً نئی نسل کے لیے رول ماڈل اور آئیڈیل شخصیت بن چکا تھا مگر تلخ حقائق اس کی پوشیدہ اصلیت سامنے لے آئے۔ یہ بہرحال بنی نوع انسان کے لیے اچھی خبر نہیں جو پہلے ہی کووڈ 19 کی وجہ سے معاشی، معاشرتی اور سیاسی مسائل میں پھنس چکی۔ جب بل گیٹس جیسا بظاہر غریب پرور دولت مند ہی دھوکے باز، لالچی اور فراڈیا نکل آئے تو خاصی تکلیف ہوتی ہے۔

فروری 2020ء سے دنیا کی دوسری امیر ترین ہستی مختلف الزامات کی زد میں رہی۔ یہاں تک کہا گیا کہ نیا کورونا وائرس اسی کی تخلیق ہے جس کے ذریعے وہ دنیا میں آبادی کم کرنا چاہتا ہے۔ یہ الزامات تو ثابت نہ ہو سکے لیکن ماہرین اور دانشوروں کی غیر تحقیق سے بل گیٹس کے وہ جرائم ضرور عیاں ہو گئے جو اس کے سرتوڑ کوششوں کے باعث پس پردہ چلے گئے تھے۔

عین ممکن ہے کہ بل گیٹس واقعی دنیا سے غربت، بیماری اور جہالت کا خاتمہ چاہتا ہو مگر یہ بھی تلخ سچائی ہے کہ اپنے عزائم کو عملی جامہ پہنانے کی خاطر بل گیٹس نے سماجی بھلائی کی جو راہ اپنائی، اس سے موصوف کا مالی مفاد بھی وابستہ تھا۔ یہی حقیقت اُسے ایک ہیرو سے زیرو بنا ڈالتی ہے..... عام آدمی جو کئی انسانوں کی طرح لالچ و ہوس کا اسیر بن بیٹھا۔

بل گیٹس کی داستان حیات چشم کشا، حیرت انگیز اور سبق آموز ہے۔ یہ عیاں کرتی ہے کہ ایک ذہین انسان جب لالچ میں آ کر دھوکے بازی اور فراڈ کی راہ اختیار کر لے تو کیونکر ذلت اس کا مقدر بنتی ہے۔ بل گیٹس نے بھی بے عزت ہو کر ہی سماجی سرگرمیوں کا آغاز کیا تاکہ معاشرے میں اپنا کھویا ہوا مقام و مرتبہ حاصل کرے مگر یہ سماجی سرگرمیاں بھی بل گیٹس نے انتی عیاری سے انجام دیں کہ ان کو بھی کمائی کا ذریعہ بنا لیا۔ سچ ہے، انسان کے لالچ کی کوئی حد نہیں۔

پہلی امریکی خیراتی تنظیم

اہل پاکستان کی اکثریت نہیں جانتی کہ غریبوں کی بھلائی کے کاموں کی آڑ میں اپنے مفادات پورے کرنا امریکی سرمایہ داروں کا چلن رہا ہے۔ اس چلن کی بنیاد سو سال قبل دو امریکی دولت مندوں نے رکھی تھی۔ دور جدید میں بل گیٹس اسی روایت کا نمایاں ترین نمائندہ ہے۔

اینڈریو کارنیج

امریکی کھرب پتی اینڈریو کارنیج پہلا دولت مند ہے جس نے دور جدید میں غریبوں کی فلاح کے لیے ایک غیر سرکاری تنظیم کی بنیاد رکھی۔ اس کی ایما پر 1911ء میں کارنیج کارپوریشن آف نیویارک کا قیام عمل میں آیا۔ اینڈریو نے اس تنظیم کو اپنی جیب سے 125 ملین ڈالر دیے جو تب خاصی بڑی رقم تھی۔ اس چندے کی بدولت تنظیم تب دنیا کی امیر ترین این جی او بن گئی۔ ایک سال قبل ہی اینڈریو کارنیج نے ایک تھنک ٹینک ''کارنیج اینڈ وومنٹ فار انٹرنیشنل پیس'' کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ جلد امریکا کا مشہور تھنک ٹینک بن گیا۔

غریبوں سے کوئی ہمدردی نہیں

اینڈریو کو غریبوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی۔ اس نے یہ تنظیمیں دو مقاصد پانے کی خاطر قائم کی تھیں۔ اوّل مقصد معاشرے میں عزت حاصل کرنا تھا۔ وہ دراصل ایک شاطر کاروباری تھا۔ جب وہ اسکیل کے شعبے میں آیا تو اس نے کارخانے کھول لیے۔ ساتھ ساتھ ایسی چالیں چلیں کہ دیگر صنعت کاروں کے شعبہ اسکیل میں قدم جمنے نہ پائیں۔ یوں اینڈریو نے اسکیل انڈسٹری میں اجارہ داری قائم کر لی۔ اس کا فلسفہ تھا کہ کامیابی پانے کی خاطر ناجائز ذرائع بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں۔

وہ ایک ظالم و کٹھور انسان بھی تھا۔ 1881ء میں اس نے ریاست پنسلوینیا و نیا کے قصبے جونز ٹاؤن میں ایک جھیل خرید لی۔ یہ جھیل قصبے سے صرف 20 میل دور تھی اور اس پر ایک ڈیم بنا ہوا تھا۔ اینڈریو نے اس ڈیم کو مچھلیاں پکڑنے کی شکارگاہ بنا لیا۔

1889ء میں پانی زیادہ بھر جانے سے پرانا ڈیم ٹوٹ گیا۔ چنانچہ دو کروڑ ٹن پانی بہ نکلا اور جونز ٹاؤن کو تباہ کر ڈالا۔ اس سیلاب کے باعث 2209 افراد ہلاک ہوئے جبکہ کروڑوں ڈالر کا نقصان ہوا۔ اینڈریو کارنیج نے چالاکی یہ کی کہ شکارگاہ کو اپنے پارٹنر کی ملکیت بتایا۔ یوں وہ مقدمے

Netscape Navigator

بازیوں سے بچ گیا۔

1892ء میں اس کے ایک اسٹیل کارخانے میں مزدوروں نے ہڑتال کردی۔ اس بار بھی اینڈریو نے سارا معاملہ اپنے ملازمین کے سپرد کیا اور خود اسکاٹ لینڈ سیر کرنے چلا گیا۔ اینڈریو کی ہٹ دھرمی کے باعث معاملات خراب ہو گئے۔ سیکیورٹی اور مزدوروں کے مابین تصادم ہوا جس میں دس افراد ہلاک ہوگئے۔ چونکہ اینڈریو جائے وقوعہ سے غیر حاضر تھا لہٰذا اس بار بھی مقدموں سے بچ گیا۔

نفرت کیسے ختم کی؟

اینڈریو جب بڑھاپے میں داخل ہوا تو عام لوگ اُسے نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ یہ دیکھ کر اُسے قدرتاً تکلیف پہنچتی۔ سمجھی کسی نے اسے مشورہ دیا کہ غریبوں کی فلاح و بہبود کے منصوبوں پر رقم خرچ کرو۔ یوں معاشرے میں عزت و احترام پالوگے۔ یہ تجویز اینڈریو کو پسند آئی۔

وہ پھر سماجی بھلائی کرنے کے طریقوں پر غور کرنے لگا۔ ساتھیوں سے صلاح مشورے کے بعد اس نے اپنی این جی او بنانے کا فیصلہ کیا۔ تنظیم کے قیام سے وہ اپنا ایک اور بڑا مفاد حاصل کرسکتا تھا۔ امریکا میں ٹیکسوں کی شرح کافی زیادہ ہے۔ امرا کو تو مزید کئی ٹیکس دینے پڑتے ہیں مگر اینڈریو ان ٹیکسوں سے سخت چڑتا تھا۔ کہتا کہ میں نے اپنی ذہانت و محنت سے دولت کمائی ہے۔ میں کیوں اُسے حکومت کی تجوریوں میں بھر دوں؟

اینڈریو نے پھر یہی سوچا کہ اپنی دولت کا بڑا حصہ سماجی تنظیم کو عطیہ کردوں۔ اس طرح نہ صرف دولت حکومت کو نہیں

جان راک فیلر

ملتی بلکہ امریکی معاشرے میں وسیع پیمانے پر سماجی سرگرمیاں انجام دینے سے اس کی واہ واہ ہو جاتی۔ چنانچہ اینڈریو نے سماجی تنظیم قائم کرکے ایک تیر سے دو شکار کرلیے۔

راک فیلر میدان میں

اینڈریو کارنیگی کی یہ چال اپنے وقت میں دنیا کے امیر ترین شخص، جان ڈی راک فیلر کو بھی پسند آئی۔ موصوف مکاری اور دھوکے بازی میں اینڈریو سے دو ہاتھ بڑھ کر تھا۔ وہ تیل کی اسٹینڈرڈ آئل کمپنی کا مالک تھا۔ کئی سال تک امریکا میں تیل کی ''90 فیصد'' خرید و فروخت اسی کمپنی کے قبضے میں رہی۔ راک فیلر نے حیلے بہانوں، چالوں اور سازشوں سے اس انڈسٹری میں کسی اور کمپنی کے قدم جمنے ہی نہیں دیے اور اپنی اجارہ داری قائم کرلی۔

آخر تنگ آکر کچھ معاصرین نے اسے عدالت میں گھسیٹ لیا۔ ہوتے ہوتے معاملہ سپریم کورٹ پہنچا۔ تب وہاں جج گوئج بیٹھے تھے۔ انھوں نے اس دلیل سے اتفاق کیا کہ راک فیلر نے آئل انڈسٹری میں اجارہ داری قائم کر رکھی ہے۔ لہٰذا انھوں نے اس کی کمپنی کو 34 ذیلی کمپنیوں میں تقسیم کر دیا اور دور حاضر میں تیل کی سبھی بڑی امریکی کمپنیوں نے اس تقسیم سے جنم لیا۔

اب اینڈریو کی طرح راک فیلر کو بھی بڑھاپے میں یہ فکر ستانے لگی کہ عمر بھر اس نے جو دولت کمائی ہے، اس کا بڑا حصہ امریکی حکومت کی تجوریوں میں چلا جائے گا۔ وہ تو امریکی سیاست دانوں اور افسر شاہی کو کرپٹ سمجھتا تھا۔ پھر وہ اینڈریو کی طرح معاشرے میں اپنی عزت بحال کرنے کا خواہش مند تھا۔ اسی لیے راک فیلر نے بھی 1913ء میں اپنی این جی او، راک فیلر فاؤنڈیشن کی داغ بیل ڈال دی۔ یوں امریکا کے امیر باسیوں کے لیے غریبوں کی فلاح و بہبود کا عمل اپنی دولت بچانے اور عزت بڑھانے کا منفرد و انوکھا ہتھیار بن گیا۔

سماجی بھلائی کا ہتھیار

اسی ہتھیار کو پھر رفتہ رفتہ دیگر امریکی امرا نے بھی اپنا لیا۔ وجہ یہی کہ امریکا میں نہ صرف ٹیکسوں کی تعداد کافی زیادہ ہے بلکہ ان کی شرح بھی بلند ہے۔ اسی لیے امرا کی اکثریت ٹیکس کی رقم بچانے کے لیے مختلف ہتھکنڈے اختیار کر لیتی ہے۔ اب بہت سے دولت مند سماجی تنظیمیں قائم کرنے لگے۔ وہ ٹرسٹ بنا کر کروڑوں ڈالر تنظیموں کو دان کر دیتے۔ نتیجتاً 1940ء تک امریکا میں ایسی کئی سو غیر سرکاری تنظیمیں وجود میں آگئیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ان سماجی تنظیموں نے امریکا بھر میں اسکول، کالج، یونیورسٹیوں، اسپتالوں اور دیگر عوامی ادارے کھول دیے۔ ان کی بدولت عوام کو معیاری تعلیم اور عمدہ علاج سستے داموں ملنے لگا۔ مگر یہ بھی تلخ سچائی ہے کہ محض غریبوں کی خدمت کرنا ان سماجی تنظیموں کا واحد مقصد نہیں تھا۔ ان کی بنیاد محض اسی لیے ڈالی گئی تاکہ دولت مند اپنی کمائی حکومت کے ہاتھوں میں نہ جانے دیں، ٹیکس کم سے کم ادا کریں اور اس دوران عوام میں نیک نامی کمالیں۔

اخلاق و قانون بیروں تلے

دولت کے ذریعے سماجی فلاح و بہبود کی غرض سے غیر سرکاری تنظیموں کا قیام ایک اختراع تھی اور یہ نیا طریق عمل ایجاد کرنے والے امریکی امرا کی زندگی مثالی، شاندار اور خیر پر مبنی دکھائی نہیں دیتی۔ مثال کے طور پر جان راک فیلر کامیابیاں پانے کی خاطر کاروبار کرتے ہوئے ہر جائز و ناجائز راہ اپناتا رہا۔ اس کا کہنا تھا: ''سرمایہ دارانہ نظام میں صرف چالاک و عیار افراد ہی کامیاب ہو سکتے ہیں۔'' غرض وہ مادی نظام کا ایسا مخصوص نمائندہ بن گیا جو کامیاب ہونے کے لیے اخلاق و قانون کو پیروں تلے روندنے میں عار محسوس نہیں کرتے۔

بل گیٹس بھی سماجی فلاح و بہبود کے میدان میں قدم دھرنے سے قبل نیک و پارسا نہیں تھا۔ اس کی داستان حیات یہ سچائی اجاگر کرتی ہے کہ وہ کامیابی کا ہما اپنے سر بٹھانے کے لیے ناجائز طریقے بھی اپناتا رہا۔ اس کو لائق کہہ لیجیے یا کامیاب ترین انسان کہلانے کی تمنا۔

کمپیوٹر سافٹ ویئر میں دلچسپی

ولیم ہنری گیٹس سوم اکتوبر 1955ء میں امریکی شہر سیتل میں پیدا ہوا۔ اس کا باپ نامور وکیل اور امیر شخص تھا۔ وہ بیٹے کو بھی وکیل بنانا چاہتا تھا مگر ولیم ہنری المعروف بل گیٹس بچپن ہی سے کمپیوٹر میں دلچسپی لینے لگا۔ آٹھویں جماعت میں تھا کہ اس نے پہلا سافٹ ویئر تیار کرلیا۔ اس کی مدد سے کمپیوٹر میں گیمز کھیلنا ممکن تھا۔

دھوکے بازی کی راہ

انھی دنوں ایک کمپنی، کمپیوٹر سینٹر کارپوریشن کے تیار کردہ نئے کمپیوٹر اسکول آئے۔ ان کمپیوٹروں پر پیسے دے کر مخصوص

وقت تک گیمز کھیلنا ممکن تھا۔ ایک بار کلاس ٹیچر نے بل گیٹس کو چار دوستوں سمیت آپریٹنگ سسٹم سے چھیڑ چھاڑ کرتے پکڑ لیا۔ بل کوشش کر رہا تھا کہ کسی اندرونی خرابی سے فائدہ اٹھا کر کھیلنے کے وقت میں اضافہ کر لیا جائے۔ بطور سزا انھیں تین ماہ کے لیے کمپیوٹر پر کھیلنے سے روک دیا گیا۔

یہ دیکھیے کہ بل گیٹس کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ پھر بھی وہ اس سعی میں تھا کہ کھیلنے کے لیے مفت وقت مل جائے۔ اس واقعے سے پتا چلتا ہے کہ وہ لڑکپن ہی میں دھوکے بازی کی راہ پر چل نکلا تھا۔

بعدازاں بل گیٹس کمپیوٹر سینٹر کارپوریشن آنے جانے لگا۔ وہاں اس نے ماہرین سے کمپیوٹر زبانیں مثلاً بیسک، فورٹان وغیرہ سیکھیں۔ اپنے تجربے کی بنیاد پر اس نے پھر اسکول کی کلاسیں شیڈول کرنے کے لیے سافٹ ویئر تیار کیا۔ اس کام میں ہم جماعت پال ایلن بل کا مددگار رہا۔

ہارورڈ یونیورسٹی میں داخلہ

بل گیٹس بہرحال ذہین فطین طالب علم تھا۔ اس نے اعلیٰ نمبر لے کر ہائی اسکول پاس کیا۔ پھر ہارورڈ یونیورسٹی کے داخلہ امتحان (SAT) میں 1600 میں سے 1590 نمبر لیے۔ یوں وہ یونیورسٹی میں داخلہ لینے میں کامیاب رہا۔ وہ ماں باپ کی خواہش پر وکالت کرنا چاہتا تھا مگر اس نے ریاضی اور کمپیوٹر سائنس کے مضامین بھی رکھ لیے۔ یونیورسٹی میں دوران تعلیم بل مختلف سافٹ ویئر بناتا رہا۔ یہ اس کا من پسند مشغلہ بن گیا تھا۔

1975ء کے اوائل میں بل گیٹس اور پال ایلن نے ایک نئے کمپیوٹر، آلٹیر 8800 کے لیے پروگرام لینگوئج بنائی۔ یہ پروگرام کمپیوٹر بنانے والی کمپنی، آئی بی ایم نے اسے خرید لیا۔ اس فروخت سے بل گیٹس اور پال ایلن کے حوصلے بلند ہو گئے۔ چنانچہ اسی سال انھوں نے مائیکروسوفٹ کمپنی کی بنیاد رکھ دی۔ یہ نام ''مائیکروکمپیوٹر'' اور ''سافٹ ویئر'' کے الفاظ کا مخفف تھا۔

غیر اخلاقی حرکات کا جنم

مائیکروسوفٹ کمپنی پھر مختلف سافٹ ویئر بنانے لگی۔ پہلے پانچ برس تک بل ہر سافٹ ویئر کی تیاری میں شریک رہا۔ پھر اس نے انتظامی معاملات اپنے ہاتھوں میں لے لیے۔ کمپنی تیزی سے ترقی کرتی رہی کیونکہ تب گنی چنی کمپنیاں ہی کمپیوٹروں کے لیے سافٹ ویئر بناتی تھیں۔ مائیکروسوفٹ نے نومبر 1985ء میں اپنا مشہور زمانہ آپریٹنگ سسٹم، ونڈوز پیش کیا۔ اس کے بعد کمپنی کی بڑھوتری کا سفر تیز ہو گیا مگر اس ترقی میں غیر قانونی نہیں تو غیر اخلاقی حرکات کا عمل دخل ضرور تھا۔

ہوا یہ کہ بل گیٹس اپنے آپریٹنگ سسٹم (ونڈوز) کو مقبول بنانے کی خاطر نت نئے سافٹ ویئر سامنے لانے لگا۔ جب دیگر سافٹ ویئر کمپنیوں نے اپنے پروگرام ونڈوز میں متعارف کرانے چاہے، تو بل گیٹس چوکنا ہو گیا۔ وہ دیگر کمپنیوں کے سافٹ ویئر استعمال کرنے کے حق میں نہیں تھا۔ اسی لیے اس کی ایما پر آپریٹنگ سسٹم میں ایسی تبدیلیاں کر دی گئیں کہ صرف بل گیٹس کے منظور شدہ سافٹ ویئر ہی ونڈوز میں انسٹال ہو پاتے۔ بقیہ سافٹ ویئر کسی نہ کسی اندرونی خرابی کی وجہ سے انسٹال نہ ہوتے۔ گویا اس نے اینڈریو کارنیج اور راک فیلر کے نقش قدم پر چلتے ہوئے منفی راہ اپنالی تاکہ کمپیوٹر انڈسٹری میں اپنی اجارہ داری قائم کر سکے۔

شکایت ہو گئی

آخر تنگ آ کر معاصر سافٹ ویئر کمپنیوں نے امریکی حکومت کو شکایت لگائی کہ مائیکروسافٹ کمپنی تکنیکی چالیں چل کر سافٹ ویئر انڈسٹری میں اپنی اجارہ داری قائم کر رہی ہے۔ اس کے حیلے بہانوں سے عیاں ہے کہ وہ دیگر سافٹ ویئر کمپنیوں کو دیوالیہ کرنا چاہتی ہے۔ اس شکایت پر 1992ء سے امریکی حکومت کا ایک ادارہ، فیڈرل ٹریڈ کمیشن مائیکروسافٹ کی کاروباری سرگرمیوں کی چھان بین کرنے لگا۔

اس کمیشن کے چار کمشنر تھے۔ دو کمشنر مائیکروسافٹ کے خلاف مقدمہ چلانا چاہتے تھے مگر دو حق میں نہیں تھے۔ یوں کمیشن میں ڈیڈلاک پیدا ہو گیا۔ یہ عین ممکن ہے کہ دو کمشنروں کی حمایت حاصل کرنے کے لیے بل گیٹس نے ہاتھ پاؤں مارے ہوں۔ امریکا بظاہر قانون پسند شہریوں کا ملک ہے لیکن وہاں کا خصوصاً ایلیٹ طبقہ اپنے مفادات پورے کرنے کے لیے قانون توڑنے میں دیر نہیں لگاتا۔ لہٰذا ہو سکتا ہے کہ پس پردہ رہتے ہوئے بل گیٹس نے کمشنروں پر اثر انداز ہونے کی کوششیں کیں تاہم اس امر کا ثبوت موجود نہیں۔

محکمہ انصاف میدان میں

بہرحال ڈیڈلاک کے باعث اگلے سال کمیشن نے مائیکروسافٹ کے خلاف تحقیقات ختم کر دیں۔ مگر اسی سال امریکی حکومت کا محکمہ انصاف شکایات پر کمپنی کی سرگرمیوں کا جائزہ لینے لگا۔ تبھی یہ بات سامنے آئی کہ مائیکروسافٹ نے یہ بندوبست کر رکھا ہے، ونڈوز میں کسی اور کمپنی کا پروگرام انسٹال نہ ہو سکے۔ بعض سافٹ ویئر جیسے نیٹ اسکیپ اور جاوا براؤزر انسٹال کرنے میں بہت زیادہ دقت ہوتی۔ یہ ایک متنازع حرکت تھی۔

اسکول میں پڑھتے ہوئے

محکمہ انصاف نے مائیکروسافٹ کمپنی کو حکم دیا کہ وہ ونڈوز کے صارفین کو اپنی مرضی کے سافٹ ویئر انسٹال یا ان انسٹال کرنے کا حق دے اور من مانی نہ کرے۔ بل گیٹس نے طوعاً کرہاً یہ حکم تسلیم کر لیا۔ تاہم اس کا اصرار تھا کہ انٹرنیٹ ایکسپلور ونڈوز کا لازمی حصہ ہے لہٰذا اُسے الگ سے سافٹ ویئر قرار نہیں دیا جائے۔ گویا بل اپنے براؤزر کو ونڈوز کا لازمی حصہ بنانا چاہتا تھا۔ محکمہ انصاف نے اس کے استدلال سے اتفاق نہیں کیا۔

مقدمہ دائر ہو گیا

جب مسئلہ بات چیت سے حل نہ ہوا تو 1998ء میں محکمہ انصاف نے مائیکروسافٹ پر ڈسٹرکٹ کورٹ آف کولمبیا میں مقدمہ ٹھوک دیا۔ کمپنی پر الزام تھا کہ وہ غیر قانونی و غیر اخلاقی طریقے اپنا کر معاصرین کے کاروبار کو نقصان پہنچا رہی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ دنیائے سافٹ ویئر میں اپنی مونوپلی قائم کر سکے۔

لفظی ہیر پھیر

اسی سال بل گیٹس نے مقدمے کے سلسلے میں اپنا بیان دیا۔ ماہرین کہتے ہیں کہ سوال جواب کے دوران بل نے ''لفظی ہیر پھیر'' سے کام لیا اور درست جوابات دینے سے گریز کرتا رہا۔ اس کی کوشش رہی کہ سوال جواب کے سیشن کو پیچیدہ بنا دیا جائے۔ اس سیشن کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے:

گیٹس: آپ پوچھ رہے کہ میں نے ای میل کب لکھی یا کوئی اور بات پوچھنا چاہتے ہیں؟

وکیل: میں جنوری 1996ء والی ای میل کی بات کر رہا ہوں۔

گیٹس: وہ مہینا؟

وکیل: جی سر۔

گیٹس: تو کیا ہوا تب؟

وکیل: جنوری 1996ء میں آپ کن براؤزر کے بارے میں فکرمند تھے؟

گیٹس: مجھے نہیں پتا کہ ''فکرمند'' سے آپ کی کیا مراد ہے۔

وکیل: آپ کو ''فکرمند'' کے سلسلے میں کیا سمجھ نہیں آیا؟

گیٹس: مجھے یقین نہیں کہ اس سے آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔

بیانِ حلفی میں بل گیٹس تقریباً ہر بات کی نفی کرتا رہا لیکن بعد میں محکمہ انصاف کے وکلا نے عدالت میں بل گیٹس کی ای میلز کے ذریعے ثابت کر دیا کہ مائیکروسافٹ کا بانی جن حقائق کو نہ جاننے کا دعویٰ کر رہا تھا، اصل میں ان سے خوب واقف تھا۔ گویا بل کی عیاری اور جھوٹ کھل کر سامنے آ گئے۔

ملیامیٹ کر دیں گے

دورانِ مقدمہ پروسیسر بنانے والی مشہور امریکی کمپنی، انٹل کے نائب صدر نے بطور گواہ بیان دیا۔ اس نے بتایا: ''ایک بار میں مائیکروسافٹ کے سینئر نائب صدر، پال مارٹز کے پاس بیٹھا تھا۔ دوران گفتگو وہ کہنے لگا کہ ہم نیٹ اسکیپ کمپنی کو ''ملیامیٹ'' کر دیں گے۔ اس کی آکسیجن کاٹ دیں گے۔ یہ کام ونڈوز میں براؤزر متعارف کرا کر انجام پائے گا۔''

جعلی ایفکٹ

مائیکروسافٹ کمپنی کا دعویٰ تھا کہ اگر ونڈوز سے انٹرنیٹ ایکسپلورر نکال دیا جائے تو وہ سست ہو جاتی ہے۔ ثبوت کے طور پر کمپنی کے نائب صدر، جم آلشین نے ایک وڈیو پیش کی۔ محکمہ انصاف کے وکلا نے نوٹ کیا کہ اس وڈیو میں کئی ایپلی کیشنز کے آئیکون پُراسرار طور پر غائب ہوئے اور پھر واپس آ گئے۔ لہٰذا انھوں نے اعتراض کیا کہ وڈیو میں جعلی ایفکٹس داخل کیے گئے ہیں۔ طویل جرح کے بعد جم آلشین نے یہ بات تسلیم کر لی۔

اس سے ثابت ہو گیا کہ اپنی غلطیوں اور گناہوں پر پردہ ڈالنے کے لیے بل گیٹس اور اس کی کمپنی جھوٹ و دھوکے بازی کا سہارا لے رہی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ کہ فراڈ پکڑے جانے کے باوجود مائیکروسافٹ نے جھوٹ بولنے کا اپنا وتیرہ ترک نہیں کیا۔

غلط حقائق بتائے گئے

محکمہ انصاف کو شکایت ملی تھی کہ صارفین ونڈوز میں نیٹ اسکیپ براؤزر انسٹال کرتے ہوئے بہت مشکل محسوس کرتے ہیں۔ مائیکروسوفٹ نے عدالت میں ایک وڈیو پیش کی جس میں دکھایا گیا کہ نیٹ اسکیپ براؤزر بڑی سہولت اور تیزی سے ونڈوز میں انسٹال ہو گیا لیکن محکمہ انصاف نے اسی عمل کی اپنی وڈیو تیار کی۔ اس میں دکھایا گیا کہ مائیکروسافٹ نے نیٹ اسکیپ ڈاؤن لوڈ کرنے کا طویل اور نہایت مشکل مرحلہ اپنی وڈیو سے حذف کر دیا۔ یوں اسے کاٹ کر کمپنی نے بدنیتی کا مظاہرہ کیا۔ حیرت انگیز بات یہ کہ مائیکروسافٹ کے نائب صدر، بریڈ چیز نے آخر کار تسلیم کیا کہ کمپنی کی تیار کردہ وڈیو میں غلط حقائق بتائے گئے ہیں۔

اخباروں میں پروپیگنڈا

بل گیٹس نے جب اپنی دروغ گوئی اور فراڈ کے سبب عدالت میں شکست ہوتے دیکھی تو وہ اخبارات میں ایک ایک صفحے کے اشتہار دے کر یہ واویلا مچانے لگا کہ معاصرین حسد و جلن کے مارے مائیکروسافٹ کو نشانہ بنا رہے ہیں۔ وہ کمپنی کی ''اختراع پسندی'' سے خائف ہیں اور یہ کہ حکومت ان کا مہرہ بن چکی۔ دراصل بل گیٹس کو پریشانی تھی کہ اگر فیصلہ کمپنی کے خلاف آیا تو مائیکروسافٹ کی نئی مصنوعہ، ونڈوز 98 پر منفی اثرات مرتب ہو سکتے تھے۔

جج کا فیصلہ

یہ مقدمہ جج تھامس پین فیلڈ جیکسن کی عدالت میں سنا گیا۔ وہ ایک سینئر اور نیک نام جج تھے۔ انھوں نے 5 نومبر 1999ء کو ''گیٹس کے حقائق'' عوام کے سامنے رکھتے ہوئے اپنے فیصلے میں لکھا:

''ثبوتوں سے عیاں ہے کہ مائیکروسافٹ نے اپنی دولت اور اثرورسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سافٹ ویئر انڈسٹری میں معاصر کمپنیوں کو پنپنے نہیں دیا۔ اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ معاصر کمپنیوں مثلاً ایپل، جاوا، نیٹ اسکیپ، رئیل نیٹ ورکس، لائنکس وغیرہ کا کاروبار چلنے نہیں دیا جائے۔

یوں انڈسٹری میں صحت مند مقابلے کی فضا کا جنم نہ ہونے دیا اور اپنی طاقت کا ناجائز استعمال کیا۔ یہ خودغرضی اور ذاتی مفادات کی مثال ہے۔''

اس طرح ثابت ہو گیا کہ مائیکروسافٹ کمپنی سافٹ ویئر انڈسٹری میں اجارہ داری قائم کرنے میں ملوث پائی گئی۔ جج نے کمپنی کی مونوپلی ختم کرنے کے لیے حکم دیا کہ اسے دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ ایک حصہ ونڈوز تیار کرے اور دوسرا سافٹ ویئر بنائے۔

جج کے خلاف مہم

بل گیٹس نے فوراً اعلیٰ عدالت، ڈی سی سرکٹ کورٹ آف اپیلز میں فیصلے کے خلاف درخواست دے دی۔ جج تھامس پین سے غلطی یہ ہوئی کہ انھوں نے قطعی فیصلہ سنانے سے قبل کیس کے متعلق ایک صحافی کو انٹرویو دے دیا۔ گو تب تک تمام حقائق سامنے آ چکے تھے مگر ازروئے قانون انھیں کیس کے بارے میں انٹرویو نہیں دینا چاہیے تھا۔

جج تھامس کی اس غلطی کو بل گیٹس کے زرخرید اخبارات نے خوب اچھالا۔ انھوں نے الزام لگایا کہ جج تھامس شروع سے فریق مخالف کی طرف داری کر رہے تھے۔ تاہم سبھی جانتے تھے کہ جج ایک دیانتدار آدمی ہے۔ اس نے کبھی کسی فریق کو حمایت نہیں دی تھی۔

اکھڑ اور ضدی گھوڑے

دراصل جج تھامس کا وہ انٹرویو چشم کشا تھا۔ انھوں نے اس میں مائیکروسافٹ اور بل گیٹس کی چالاکی اور جھوٹ کے خوب پول کھولے۔ کمپنی کے اعلیٰ عہدیداروں کو انھوں نے ''اکھڑ اور ضدی گھوڑوں'' سے تشبیہ دی جنھیں ڈنڈے سے پیٹا جانا چاہیے۔ چار سال قبل جج تھامس نے قتل کا ایک کیس سنا تھا جس میں قاتل بڑے سفاک اور ظالم تھے۔ پریس نے انھیں ''گینگ لینڈ کلرز'' کا خطاب دیا تھا۔ جج تھامس نے مائیکروسافٹ کے ڈائریکٹروں کو بھی اسی خطاب سے نوازا۔ اس بابت انھوں نے صحافی کو بتایا:

''جب میں نے قاتلوں کو سزا سنائی تو وہ کہنے لگے، ہم بے قصور ہیں۔ ہم نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سارا کیس ہمارے خلاف سازش ہے۔ حکمران ٹولہ ہمیں تباہ کرنا چاہتا ہے۔ مائیکروسافٹ کمپنی کا کیس سنتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ ضروری نہیں کہ قاتل جرائم پیشہ گروہ سے تعلق رکھتے ہوں۔''

نپولین اور ڈرگ ٹریفکر

جج تھامس نے بل گیٹس کو ''نپولین'' سے تشبیہ دی جو طاقت کے نشے میں سرشار ہو کر غیر قانونی حرکات بھی کر جاتا تھا۔ یہی نہیں بل گیٹس ''ڈرگ ٹریفکر'' (Drug Trafficker) بھی قرار پایا کیونکہ اسے ٹیپ کی گئی ٹیلی فون کالوں میں دھمکیاں دیتے سنا جا سکتا تھا۔

سرکٹ کورٹ آف اپیلز میں مقدمہ چل رہا تھا کہ واقعہ

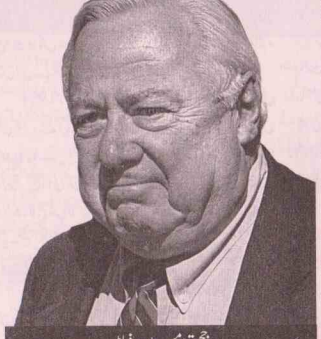

جج تھامس پین فیلڈ

نائن الیون پیش آ گیا۔ اب امریکی حکومت کی ساری توجہ دہشت گردی کے خلاف نام نہاد جنگ پر مرکوز ہوگئی۔ اس صورتحال سے مائیکروسافٹ نے فائدہ اُٹھایا اور عدالت سے باہر تصفیہ کرنے کی سعی کرنے لگی۔ نئی صورت حال کی وجہ سے اسے کامیابی مل گئی۔ بل گیٹس نے محکمۂ انصاف سے وعدہ کیا کہ ونڈوز میں دیگر کمپنیوں کے سافٹ ویئر انسٹال کرنے کی اجازت دی جائے گی اور کمپنی کوئی رکاوٹ پیدا نہیں کرنا چاہتی۔

عزت بچانے کی کوشش

امریکا میں دانشور یہ امر نمایاں کرتے ہیں کہ مائیکروسافٹ کے خلاف مقدمے نے کمپنی اور بل گیٹس کی شہرت و عزت کو کافی نقصان پہنچایا۔ کیس سے واقف عام امریکی اسے ایک دھوکے باز اور جھوٹا آدمی سمجھنے لگے۔ تبھی بل گیٹس نے فیصلہ کہ وہ ایک سماجی تنظیم بنا کر معاشرے میں اپنی کھوئی عزت واپس بحال کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ 2000ء میں اس نے بل اینڈ ملینڈہ گیٹس فاؤنڈیشن قائم کردی۔

1994ء تک بل گیٹس کھرب پتی بن چکا تھا۔ اسی سال بل گیٹس نے ایک این جی او قائم کردی مگر اس کی سرگرمیاں محدود پیمانے پر انجام پاتی تھیں۔ 1999ء میں بل گیٹس دنیا کا امیر ترین آدمی بن گیا۔ اب اس نے فیصلہ کیا کہ اپنی بے پناہ دولت کام میں لا کر میڈیا کی طاقت کے ذریعے اپنے آپ کو ایک مخیر ہستی میں تبدیل کرلیا جائے۔

میڈیا کو سہارا بنایا

یہی وجہ ہے، 2000ء سے بل گیٹس اہم امریکی ٹی وی نیٹ ورکس کو اشتہارات دینے لگا۔ جب اس نے اپنی سماجی تنظیم قائم کی تو اس کی تشہیر پر کروڑوں ڈالر خرچ کیے۔ یہ رقم

بل اینڈ ملینڈہ کا صدر دفتر

امریکی و برطانوی میڈیا کی تجوریوں ہی میں گئی۔ اس میڈیا نے جواب میں بل گیٹس کو دکھی انسانیت کا ''نجات دہندہ'' اور مسیحا بنا کر پیش کیا۔ یہ دعویٰ ہوا کہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر غربت، جہالت اور بیماری ختم کرسکتا ہے۔

بل اینڈ ملینڈہ گیٹس فاؤنڈیشن امریکا اور بیرون ممالک مصروف کار مختلف سماجی اداروں کو مالی امداد دینے لگی۔ یہ مالی امداد بھی بل گیٹس کے لیے عزت و شہرت پانے کا طریق کار بن گیا۔ اب وہ بھی اینڈریو کارنیج اور جان راک فیلر کی طرح دولت کے سہارے معاشرے میں بلند اور قابل احترام مقام حاصل کرسکتا تھا۔ لوگوں کی یادداشت کمزور ہوتی ہے۔ وہ جلد بھول گئے کہ بل گیٹس پر دھوکے بازی اور دروغ گوئی کے الزامات ثابت ہوچکے۔

یورپی یونین کا جرمانہ

2004ء میں یورپی یونین کے یورپین کمیشن نے بھی بسلسلہ ایک کیس مائیکروسافٹ کو عدالت میں گھسیٹ لیا۔ کمپنی پر الزام تھا کہ وہ مارکیٹ میں اپنی اعلیٰ پوزیشن برقرار کرنے کی خاطر ناجائز اقدامات کر رہی ہے۔ مائیکروسافٹ پر مقدمہ چلا اور یورپی یونین کمیشن نے اسے حکم دیا کہ وہ 381 ملین پونڈ بطور جرمانہ ادا کرے۔ یہ تب یورپین کمیشن کی تاریخ میں سب

سے بڑا جرمانہ تھا جو مائیکروسافٹ پر عائد کیا گیا۔ اس فیصلے نے کمپنی کی ساکھ کو مزید نقصان پہنچا دیا۔

مائیکروسافٹ کو خدا حافظ

یہ یقینی ہے کہ مائیکروسوفٹ کے اندرون خانہ افسر اور سرمایہ کار بل گیٹس پر تنقید کرنے لگے۔ ظاہر ہے، اس کے آمرانہ اور یکطرفہ فیصلوں سے کمپنی کو نقصان پہنچ رہا تھا۔ درست کہ بل گیٹس نے مائیکروسوفٹ کو اپنی کوششوں سے مایہ

امپیریل کالج، لندن

ناز سافٹ ویئر کمپنی بنا دیا۔ لیکن کاروباری حلقوں میں اسے اچھی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا۔ دیگر کاروباری بل کو سازشی، عیار اور مکار سمجھتے تھے۔ مائیکروسافٹ کی ساکھ مزید تباہ ہونے سے بچانے کے لیے ہی بل گیٹس نے اس کا انتظام چھوڑ دیا۔ 2008ء سے وہ اپنی سماجی تنظیم کو زیادہ وقت اور توانائی دینے لگا۔

سماجی بھلائی کا نیا ماڈل

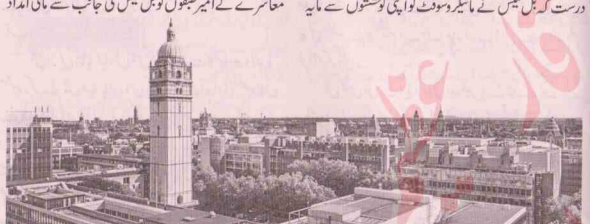

2008ء میں بل گیٹس نے اعلان کیا کہ وہ دنیا بھر میں نجی اداروں کے ساتھ اشتراک چاہتا ہے تاکہ عوام الناس کی بہتری کے لیے مصنوعات تیار ہوسکیں اور اس سلسلے میں ٹیکنالوجی بھی بروئے کار لائی جائے۔ بل گیٹس ''تخلیقی سرمایہ کاری'' کا خواہاں تھا۔ وہ نجی شعبے کی دولت اور تجربے سے سماجی فلاح و بہبود انجام دینے کا خواہش مند تھا۔ یقیناً یہ ایک عمدہ تصور تھا جس سے دکھی انسانیت کو فائدہ ہوتا۔ لیکن بل گیٹس کے دعوے اور خواب جب حقیقت میں ڈھلنے تو عالمی سطح پر سماجی بھلائی کا ایک نیا ماڈل سامنے آ گیا۔

اس نئے ماڈل میں اکثر اوقات غریب طبقے نہیں معاشرے کے امیر طبقوں کو بل گیٹس کی جانب سے مالی امداد ملنے لگی۔ یہ نیا ماڈل دیکھ کر ماہرین کو احساس ہوا کہ بل گیٹس غریبوں کے ساتھ ساتھ امیر ترین لوگوں کی بھی مالی مدد کرنا چاہتا ہے تاکہ انھیں اور اپنے آپ مالی فائدہ پہنچا سکے۔

عالمی شعبہ صحت کا ڈان

بل اینڈ ملینڈہ گیٹس فاؤنڈیشن کے ذریعے پچھلے بیس برس میں دنیا کے امیر ترین لوگوں میں سے ایک کی زبردست کایا پلٹ یہ ہوئی کہ وہ بین الاقوامی سطح پر شعبہ صحت میں اہم ترین شخصیت بن گیا۔ حیرت انگیز بات یہ کہ بل گیٹس کوئی میڈیکل ڈگری نہیں رکھتا۔ حتیٰ کہ اس نے کسی قسم کا طبی کورس بھی نہیں کیا۔ وہ ماہر امراض نہیں اور نہ ہی چھوٹی بیماریوں سے گہری شناسائی رکھتا ہے۔

اس کے باوجود جب نیا کورونا وائرس سامنے آیا تو بل گیٹس ہی نے دنیا کے سات ارب انسانوں کو تسلی دی کہ وہ فکر نہ کریں، ویکسین اور اینٹی وائرس ادویہ بننے کے بعد حالات نارمل ہو جائیں گے۔ بل گیٹس کے بیان سے عیاں ہے کہ آج وہ عوامی صحت، طبی تحقیق اور ویکسین بنانے کے عمل میں مرکزی حیثیت اختیار کر چکا۔ حالانکہ وہ محض ایسا سافٹ ویئر ڈویلپر ہے جو اپنی تعلیم بھی مکمل نہیں کر سکا۔

آپ دسترس سے نہیں بچ سکتے

قبل ازیں بتایا گیا، بل گیٹس کو ''انسانیت کا نجات دہندہ'' مشہور کرنے میں میڈیا اور اس کی تنظیم کے امدادی منصوبوں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ آج بھی یہ تنظیم امریکا اور برطانیہ کے اکثر ٹی وی نیٹ ورکس، اخبارات اور رسائل کو کسی نہ کسی شکل میں مالی امداد دیتی ہے۔ ان میں بی بی سی، اے بی سی نیوز، گارجین، این پی آر، سی این این اور دیگر میڈیا ادارے شامل ہیں۔

امریکا میں قومی اور بین الاقوامی خبریں نشر کرنے والا پروگرام ''پی بی ایس نیوز آور'' بہت مشہور تھا۔ صحافی جم لہرر اس کا میزبان تھا۔ 2008ء میں بل گیٹس کی تنظیم نے اس پروگرام کو پینتیس لاکھ ڈالر کی امداد دی۔ مقصد یہ تھا کہ جم لہرر اپنے پروگرام کا ایک حصہ عالمی صحت کی خبروں کے لیے مخصوص کر سکے۔ بعض ماہرین نے تب جم سے سوال کیا کہ بل گیٹس سے رقم لینے کے بعد اب وہ صرف وہی خبریں نشر کرے گا جو تنظیم چاہے گی؟ اس نے جواب دیا:

''بات یہ ہے کہ آج عالمی صحت کے میدان میں بل گیٹس کی تنظیم چھائی ہوئی ہے۔ وہ ہر شعبہ صحت میں قدم جما چکی۔ لہٰذا آپ چاہیں بھی تو اس کی دسترس سے نہیں بچ سکتے۔''

بل زار بن چکا

یہ کھلی حقیقت ہے کہ آج عالمی صحت کے شعبے میں بل گیٹس ''زار'' بن چکا۔ اسی نے 2000ء میں ایک عالمی شراکتی منصوبے ''گیوی۔ دی ویکسین الائنس'' کی بنیاد رکھی۔ اس منصوبے کے پلیٹ فارم پر بل نے حکومتوں اور نامی گرامی ادویہ ساز اداروں کو جمع کر لیا۔ منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ ''ویکسین اور دیگر ادویہ کی فروخت کے لیے دنیا بھر میں مارکیٹیں تلاش کی جا سکیں۔''

گیوی۔ دی ویکسین الائنس کے قیام کی خاطر بل اینڈ ملینڈہ گیٹس فاؤنڈیشن نے 750 ملین ڈالر فراہم کیے۔ اس عالمی منصوبے کو تنظیم اب تک چار ارب ڈالر سے زائد رقم فراہم کر چکی۔

بل گیٹس ہی نے ایڈز، دق اور ملیریا کے خاتمے کے لیے بننے والے پروگرام ''گلوبل فنڈ'' کو بنیادی رقم فراہم کی۔ یہ بھی حکومتوں اور نجی اداروں کے تعاون سے چلنے والا پروگرام ہے۔

غرض 2008ء سے لے کر اب تک عالمی صحت کے شعبے میں جتنے بھی پروگرام معرض وجود میں آئے ہیں، انھیں بل گیٹس کی تنظیم نے اربوں ڈالر فراہم کیے۔ اسی دوران تنظیم افریقا اور ایشیا کے ترقی پذیر ممالک کو بھی ہر سال کروڑوں ڈالر کی امداد دیتی رہی۔ یہی وجہ ہے، پچھلے بیس سال کے دوران بل گیٹس کی تنظیم بین الاقوامی سطح سے لے کر ممالک تک میں شعبہ صحت سے جڑے ہر فرد، گروہ اور ادارے سے تعلق قائم کر چکی۔

بچوں کے اسکول کو بھاری چندہ

آئیے اس امر کا جائزہ لیتے ہیں کہ امدادی رقوم دے کر بل گیٹس نے عالمی سطح پر اپنا اثر و رسوخ کیونکر بڑھایا۔ پچھلے سال امریکی میڈیا کمپنی، نیٹ فلیکس نے بل گیٹس کی حیات و خدمات پر ایک دستاویزی فلم دکھائی۔ اس میں میزبان برنی نو (Bernie Noe) نامی ایک آدمی سے بات چیت کرتا ہے جسے گیٹس کا دوست بتایا گیا۔ وہ کہتا ہے: ''بل گیٹس ایک گھنٹے میں ڈیڑھ سو صفحات پڑھ لیتا ہے۔ عام آدمی ایسا نہیں کر سکتا۔

اسی لیے میں اسے غیر معمولی ہستی قرار دیتا ہوں۔''

فلم میں مگر یہ نہیں بتایا گیا کہ برنی نو ایک نجی تعلیمی ادارے، لیک سائیڈ اسکول کا پرنسپل ہے اور نہ ہی یہ کہ بل گیٹس کی تنظیم اسکول کو 80 ملین ڈالر کی امداد دے چکی۔ مگر یہ سچائی کا ایک روپ ہے۔ دوسرا روپ یہ کہ اسی اسکول میں گیٹس کے بچے پڑھتے رہے۔ گویا گیٹس جوڑے نے اپنے خیراتی ادارے کے ذریعے اس اسکول کو کروڑوں روپے عطا کر ڈالے جہاں امرا کے بچے پڑھتے ہیں اور تعلیم بہت مہنگی ہے۔ یہ قدردانی صرف اس لیے ہوئی کہ بل کے بچے وہاں پڑھتے تھے۔

متصادم مفاد میں گھرا بل گیٹس

درج بالا حقائق اس کیفیت کو سامنے لاتے ہیں جسے ''متصادم مفاد'' (Conflict of Interests) کہا جاتا ہے۔ بل گیٹس کی زندگی اور اعمال میں اس قسم کے متصادم مفاد جا بجا ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر کچھ عرصہ قبل انکشاف ہوا تھا کہ وہ بدنام زمانہ امریکی سرمایہ کار، جیفرے اسپٹین سے ملتا رہا ہے تا کہ سماجی کاموں میں اس کی مدد لے سکے۔ ان منصوبوں کے ذریعے اسپٹین کو کروڑوں ڈالر کی آمدن ہونی تھی۔ گویا بل گیٹس اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مجرموں سے بھی میل جول رکھتا ہے جو قابل اعتراض بات ہے۔

بل اینڈ ملینڈہ گیٹس فاؤنڈیشن کے بارے میں خاص بات یہ ہے کہ دنیا کی کوئی حکومت بشمول امریکی حکمران تنظیم کی سرگرمیوں کے بارے میں چھان بین نہیں کر سکتے۔ اس کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ تنظیم نے خیرات دینے اور سماجی بھلائی کرنے کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ اسی لیے وہ عوامی تنقید سے بھی بچ جاتی ہے۔ رفتہ رفتہ سماجی سرگرمیوں کی آڑ ہی میں بل گیٹس نے امریکا ہی نہیں دنیا بھر میں سیاسی طاقت بھی حاصل کر لی۔

اربوں ڈالر...... ملٹی نیشنل کمپنیوں کو

دی نیشن امریکا کا مشہور رسالہ ہے۔ اس کے محققوں نے تحقیق سے دریافت کیا ہے کہ گیٹس فاؤنڈیشن پچھلے بیس برس میں ''انیس ہزار'' دفعہ مختلف نجی اداروں اور حکومتوں کو مالی امداد دے چکی۔ ان میں سے کم از کم چار ارب ڈالر ملٹی نیشنل کمپنیوں کو دیے گئے۔ ان کمپنیوں میں کھرب پتی کمپنیاں مثلاً یونی لیور، گلیکسو سمتھ لائن، آئی بی ایم، این بی سی یونیورسل میڈیا وغیرہ شامل ہیں۔ ان کمپنیوں کو یہ کام سپرد کیے گئے: نئی ادویہ کی تیاری، ترقی پذیر ممالک میں سیوریج کی بحالی، مسلم صارفین کے لیے مصنوعات تیار کرنا اور گیٹس فاؤنڈیشن کے کارناموں کی تشہیر۔

تحقیق سے انکشاف ہوا کہ فاؤنڈیشن نے میڈیا کمپنیوں کو بھی ''تین سو ملین ڈالر'' فراہم کیے تا کہ وہ اس کے پیغام کو دنیا کے کونے کونے تک پھیلا سکیں۔ اس ضمن میں فلمیں بنانے والوں نے بھی ڈالروں کی بہتی گنگا میں ہاتھ دھوئے۔

غریبوں کی تعلیم کا دشمن

مثال کے طور پر 2010ء میں ویسٹرن میڈیا اور پارٹیسپنٹ نامی امریکی کمپنیوں نے ''ویٹنگ فار سپر مین'' نامی فلم بنائی۔ یہ امریکا کے سرکاری اسکولوں کے خلاف تھی۔ فلم نے امریکی عوام کو یہ پیغام دیا کہ ملک میں نجی اسکول ہونے چاہئیں تا کہ وہاں عمدہ تعلیم حاصل کر کے بچے سپر مین بن سکیں۔ گیٹس فاؤنڈیشن بھی امریکا میں پرائیویٹ اسکولوں کا قیام چاہتی ہے۔ اسی لیے اس نے امریکی کمپنیوں کو دو ملین ڈالر فراہم کیے تا کہ فلم کی پروموشن ہو سکے۔ حالانکہ فلم میں سرکاری اسکولوں پر تنقید کی گئی جہاں غریب و متوسط طبقوں سے تعلق رکھنے والے بچے کم فیس میں عمدہ تعلیم پاتے ہیں۔ پرائیویٹ اسکولوں کے قیام سے تو وہ سستی تعلیم سے محروم ہو جائیں گے۔

ماسٹر کارڈ کو بھاری چندہ

گیٹس فاؤنڈیشن کی اکثر مالی امداد ایسی ہی متنازع اور غریبوں کے مفادات سے متصادم ہے۔ حالانکہ بقول بل گیٹس

تنظیم کا قیام غرباء کی بھلائی کے لیے ہی عمل میں لایا گیا۔ غربا کے مفادات پر ضرب لگانے کی ایک اور مثال ملاحظہ فرمائیے۔

گیٹس فاؤنڈیشن نے کھرب پتی امریکی کریڈٹ کارڈ کمپنی، ماسٹر کارڈ کے ایک ذیلی ادارے کو 2014ء میں انیس ملین ڈالر کی امداد دی۔ یہ ادارہ غریب افریقی ملک، کینیا میں سرگرم تھا۔ امداد کا مقصد یہ تھا کہ وہ کینیا کے عوام میں ڈیجیٹل مصنوعات متعارف کرا سکے۔ مگر یہ بھی متصادم مفاد کی نمایاں مثال ہے۔

ماسٹر کارڈ کھرب پتی کمپنی ہے۔ وہ اپنے کاروبار کے پھیلاؤ کی خاطر کروڑوں ڈالر خرچ کر سکتی ہے۔ لیکن ''گیٹس فاؤنڈیشن جیسی سماجی تنظیم نے اُسے لاکھوں ڈالر کی امداد کیوں دی؟ آخر وہ اس امداد سے کس قسم کا مفاد حاصل کرنا چاہتی تھی؟ اس بابت ہم آگے چل کر قارئین کو چشم کشا سچائی سے آگاہ کریں گے۔

ایک خطرناک نیا رجحان

برطانیہ کی یونیورسٹی آف ایسیکس میں ڈاکٹر لینسے میکگوئے عمرانیات کی پروفیسر ہیں۔ وہ ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کی سرگرمیوں پر تحقیق کرتے ہوئے ایک چشم کشا کتاب ''مفت تحفہ کوئی وجود نہیں رکھتا'' (No Such thing as a free Gift) تحریر کر چکیں۔ وہ کہتی ہیں: ''گیٹس فاؤنڈیشن ہر سال ملٹی نیشنل کمپنیوں کو جو بھاری بھرکم رقم بطور امداد دیتی ہے، وہ حیران کن ہے۔ یہ کمپنیاں اربوں ڈالر کا منافع کماتی ہیں۔ اس کے باوجود گیٹس فاؤنڈیشن انھیں کروڑوں ڈالر بطور چندہ دیتی ہے۔ سماجی شعبے میں یہ نہایت خطرناک نیا رجحان ہے کیونکہ اب ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے آپ کو خیرات اور امداد کے قابل سمجھنے لگی ہیں۔''

ذکر ہو چکا کہ گیٹس فاؤنڈیشن نے 2014ء میں ماسٹر کارڈ کمپنی کے ایک ذیلی ادارے کو چندہ دیا تھا۔ ڈاکٹر لینسے کی

Gavi
The Vaccine Alliance

گیوی دی ویکسین الائنس

تحقیق سے انکشاف ہوا کہ اس چندے سے گیٹس فاؤنڈیشن نے مالی فائدہ اٹھایا۔ وجہ یہ کہ اس زمانے میں فاؤنڈیشن نے ماسٹر کارڈ میں برکشائر ہیتھ وے کمپنی کے ذریعے سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ یاد رہے، برکشائر ہیتھ وے ایک اور بڑے ارب پتی، وارن بفٹ کی ملکیت ہے۔ یہ شخص بھی بل گیٹس کے ساتھ سماجی فلاح و بہبود کے میدان میں سرگرم ہے۔

ٹیکس چوری

پروفیسر لینسے میکگوئے یہ نکتہ بھی اجاگر کرتی ہے کہ گیٹس فاؤنڈیشن جس ادارے کو چندہ یا خیراتی امداد دے، وہ ٹیکس سے مستثنیٰ ہوتا ہے۔ فاؤنڈیشن اسی لیے اس انداز میں اداروں کو امداد دیتی ہے کہ کسی نہ کسی طرح اسے بھی مالی فائدہ ہو سکے۔ یہی وجہ ہے، پچھلے بیس برس میں گیٹس فاؤنڈیشن کے اثاثہ جات کی مالیت چند ارب ڈالر سے بڑھ کر پچاس ارب ڈالر تک پہنچ چکی۔ اس مالیت کا اندازہ یوں لگائیے کہ پاکستان کا پورا ایک سالہ وفاقی بجٹ بھی اتنی زیادہ رقم کا حامل نہیں ہوتا۔

ملکیتی کمپنیوں کو امداد

دی نیشن رسالے کی تحقیق سے یہ حیرت انگیز سچائی بھی سامنے آئی کہ گیٹس فاؤنڈیشن نے ان دولت مند ادویہ ساز کمپنیوں کو بھی سالانہ گرانٹ سے نوازا جن میں اس نے سرمایہ کاری کر رکھی تھی۔ اس گرانٹ کی رقم تین سو ملین ڈالر بنتی ہے۔ ان کمپنیوں میں میرک، نوا آرٹس، گلیکسو سمتھ لائن، سنوفی، اکرسن، ایل جی، میڈ وٹرونک اور دیگر شامل ہیں۔ فاؤنڈیشن نے ان کمپنیوں کے کارپوریٹ اسٹاک یا بانڈ خرید رکھے

ہیں۔ انھیں اس لیے امداد دی گئی کہ وہ نئی ادویہ تیار کر سکیں۔ صحت کا مانیٹرنگ نظام تشکیل دیں اور موبائل بینکنگ سروسز سامنے لائیں۔

درج بالا بھی متصادم مفاد کی ناقابل فراموش مثال ہے۔ وہ یوں کہ ایک تنظیم نے جس کمپنی میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے اور وہ ایک لحاظ سے اس کی ملکیت ہے، اسی کو وہ چندہ بھی دے رہی ہے۔ پھر ایسا ایک کمپنی کے ساتھ نہیں ہوا بلکہ گیٹس فاؤنڈیشن نے ان کمپنیوں کو بھی مالی امداد دی جن کے وہ مالکانہ حقوق بھی رکھتی ہے۔ حیرت انگیز بات یہ کہ امریکی حکومت گیٹس فاؤنڈیشن کی متصادم مفاد والی پالیسی دیکھتی اور خاموش رہتی ہے۔ اُسے تنظیم کے خلاف کارروائی کرنے کی ہمت نہیں ہوتی یا پھر وہ کسی وجہ سے فاؤنڈیشن کو کسی مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی۔ گویا فاؤنڈیشن کی غیر قانونی اور غیر اخلاقی سرگرمیوں سے امریکی حکمران طبقے کا مفاد بھی وابستہ ہے۔

کیا کھچڑی پک رہی ہے؟

گیٹس فاؤنڈیشن نے کبھی میڈیا کو یہ تفصیل فراہم نہیں کی کہ وہ ملٹی نیشنل اور منافع کے لیے کام کرنے والی کمپنیوں کو کتنے ارب ڈالر امداد یا چندے کی مد میں فراہم کر چکی۔ تاہم نجی محفلوں اور کاروباری تقریبات میں بل گیٹس کھلے عام کوشش کرتا ہے کہ وہ اپنی فاؤنڈیشن اور ملٹی نیشنل کمپنیوں کے مابین تعلقات میں اضافہ کر سکے۔ اس نے 2013ء میں امریکن انسٹیٹیوٹ اور 2014ء میں مائیکروسوفٹ میں منعقدہ تقریبات میں خطاب کرتے ہوئے فخر سے بتایا کہ تنظیم ادویہ ساز کمپنیوں کے ساتھ مختلف منصوبوں پر کام کر رہی ہے جن کی مالیت کئی ارب ڈالر ہے۔

ادویہ ساز کمپنیوں اور بل اینڈ ملینڈہ گیٹس فاؤنڈیشن کی شراکت کو گہرائی و گیرائی سے دیکھا جائے تو چشم کشا انکشافات ہوتے ہیں۔ تب پتا چلتا ہے کہ فاؤنڈیشن اس لیے انھیں کروڑوں ڈالر دے رہی ہے تاکہ وہ ادویہ کے لیے مزید منڈیاں تلاش کریں اور دیگر ایسے خرچے بھی گھٹا لیں جو عوام کے سامنے کبھی پیش نہیں کیے جاتے۔ چنانچہ عام آدمی کو علم ہی نہیں کہ فاؤنڈیشن اور ادویہ ساز بڑی کمپنیوں کے مابین کیا کھچڑی پک رہی ہے اور ان کی شراکت کس قسم کے مفادات حاصل کرنا چاہتی ہے۔

اربوں ڈالر کی ٹیکس بچت

بل گیٹس اکثر بڑے فخر سے کہتا ہے کہ وہ ہر سال اربوں ڈالر مالیت کے ٹیکس دیتا ہے۔ ایک بار اس نے یہ عدد دس ارب ڈالر بتایا تھا۔ گو اس بات کی تصدیق نہیں ہو سکتی کیونکہ بل نے کبھی اپنے ٹیکسوں سے متعلق کاغذات عوام کے سامنے پیش نہیں کیے۔ بلکہ عین ممکن ہے کہ وہ اپنی سماجی تنظیم کے ذریعے ہر سال اربوں ڈالر کا ٹیکس بچا رہا ہو۔ جی ہاں، یہ حقیقت ہے اور بہت کم لوگ اس کی بابت جانتے ہیں۔

پروفیسر رے میڈوف امریکا کے بوسٹن کالج میں قانون پڑھاتے ہیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ امیر ترین کمپنیاں سماجی تنظیموں کو امداد یا چندہ دے کر ٹیکس بچا لیتی ہیں۔ وہ یوں کہ گیٹس فاؤنڈیشن کے مانند سماجی تنظیمیں چلانے والے امرا کو امریکا میں کیپٹل گین ٹیکس نہیں دینا پڑتا جس کی شرح پندرہ فیصد ہے۔ اسی طرح وہ اسٹیٹ ٹیکسوں سے بھی مبرا ہو جاتے ہیں جن کی شرح چالیس فیصد ہے۔

یوں وہ اپنی آمدن پر 55 فیصد ٹیکس لگنے ہی نہیں دیتے۔ اس طرح بل گیٹس اور وارن بفٹ جیسی امیر ہستیاں ٹیکسوں کی مد میں ہر سال اربوں ڈالر بچا لیتی ہیں۔ پروفیسر میڈوف کا کہنا ہے کہ بل گیٹس سالانہ کم از کم 14/ارب ڈالر ٹیکسوں کی رقم بچاتا ہے۔ یقیناً یہ بہت بڑی رقم ہے۔ پاکستان میں کوئی بھی امیر شخص اتنی زیادہ دولت نہیں رکھتا۔

عوام کے حقوق پر ڈاکا

پروفیسر میڈوف اور دیگر ماہرین قانون کا کہنا ہے کہ بل گیٹس اور دیگر کھرب پتی ٹیکسوں کی رقم بچا کر گویا عوام کے

حقوق پر ڈاکا ڈالتے ہیں۔ وجہ یہ کہ یہ بچائی گئی رقم اگر امریکی حکومت کو مل جائے، تو اس سے سڑکیں، پل، اسپتال اور اسکول تعمیر ہوں گے۔ غریبوں کو مفت علاج اور تعلیم کی سہولت میسر آئے گی۔ حکومت کو مالی خسارہ کم کرنے میں مدد ملے گی۔ عوام کو الٹا سرکاری مالی خسارہ کم کرنے کے لیے اپنی جیب سے رقم دینا پڑتی ہے۔ اسی لیے امریکا کے غریب و متوسط طبقوں پر مالی بوجھ بڑھ رہا ہے اور وہ آئے دن امرا کے خلاف احتجاج کرنے لگے ہیں۔

رقم عام آدمی کی ملکیت

امریکی حکومت کے پاس اب عوام پر خرچنے کی خاطر رقم نہیں، اسی لیے وہ بہت سے سماجی کام دولت مندوں کے سپرد کر رہی ہے۔ مثلاً ادویہ اور ویکسین تیار کرنا، بچوں کو تعلیم دینا اور سائنسی تحقیق و تجربات کرنا۔ پروفیسر میڈوف کہتے ہیں:

''دنیا بھر میں عام لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ بل گیٹس جیسے کھرب اور ارب پتی اپنا پیسہ عوامی مسائل حل کرنے پر استعمال کر کے کارہائے نمایاں انجام دے رہے ہیں۔ انھیں مگر یہ علم نہیں کہ یہ بظاہر مخیر افراد جو رقم سماجی فلاح و بہبود پر خرچ کرتے ہیں، اس کا بڑا حصہ عوام کی ملکیت ہے۔ وہ یہ رقم ٹیکس بچا کر کماتے ہیں۔ لہٰذا وہ عوامی بھلائی کے کاموں پر خرچ کر کے عام آدمی پر احسان نہیں کرتے بلکہ یہ ان کا فرض ہے۔ لیکن وہ ٹیکسوں کی رقم بچا کر اس فرض میں ڈنڈی مار جاتے ہیں۔''

انٹیلی جنس انٹرسٹ گروپ

امریکا میں بعض سرکاری افسر اور عوامی حقوق کی تنظیمیں چاہتی ہیں کہ جن کھرب پتی اور ارب پتی شخصیات نے سماجی تنظیمیں بنا رکھی ہیں، ان کی سرگرمیاں قانون کے زیادہ سخت دائرے میں لائی جائیں۔ مقصد یہ ہے کہ حکومت اور عوام، دونوں کو معلوم ہو سکے کہ ان کے مالی معاملات کس نوعیت کے ہیں۔ آمدن اور خرچ کا کیا حساب ہے۔ مگر کھرب پتیوں کی تنظیمیں اپنے کام میں آزادی چاہتی ہیں۔ اسی لیے جب

کئی لوگ بل گیٹس کو شیطان سمجھتے ہیں

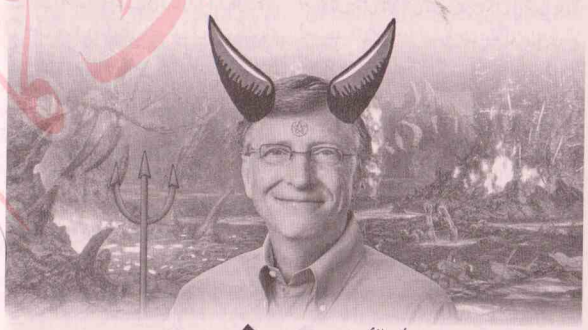

امریکی حکومت ان کے کاموں میں مداخلت کرے تو وہ ناک بھوں چڑھاتی ہیں۔

ماہرین کا کہنا ہے کہ یہ تنظیمیں میڈیا کے ذریعے پروپیگنڈا کرتی ہیں کہ انھیں آزادی ملنی چاہیے اور یہ کہ حکومت ان پر قانونی پابندیاں عائد نہ کریں تاکہ وہ مسلسل غریبوں کی امداد کرتی رہیں۔ بعض نے تو ''انٹیلی انٹرسٹ گروپ'' بنا رکھے ہیں جو ہر محاذ پر کھرب پتیوں کی تنظیموں کا مقدمہ لڑتے ہیں تاکہ وہ قانون کے سخت دائرہ کار سے باہر رہیں۔

انٹیلی انٹرسٹ گروہوں میں ''فلنتھروپی راؤنڈ ٹیبل'' (Philanthropy Round Table) شامل ہے۔ اس کو بل گیٹس سمیت کئی امریکی و برطانوی کھرب پتی چندہ دیتے ہیں۔ بل گیٹس فاؤنڈیشن نے اسے 2005ء تا 2019ء تیس لاکھ ڈالر فراہم کیے۔ فاؤنڈیشن نے چندے کا مقصد یہ بیان کیا:

''تاکہ عوام کو سماجی فلاح و بہبود کے کاموں کی طرف اُبھارا جاسکے۔''

کھرب پتیوں کے پشتی بان

ماہرین کا کہنا ہے، غور کیا جائے تو فلنتھروپی راؤنڈ ٹیبل جیسے ادارے بل گیٹس، وارن بفٹ، چارلس کوچ وغیرہ کھرب پتیوں کے مفادات کو تحفظ دیتے ہیں۔ ورنہ یہ ادارے ترقی پزیر ممالک میں غربت، جہالت اور بیماری ختم کرنے کی خاطر رتی برابر کام نہیں کر رہے۔ ان اداروں کی بس ذمے داری یہ ہے کہ عوام میں کھرب پتیوں کی تنظیموں کے حق میں پروپیگنڈا لٹریچر پھیلاتے رہیں۔

درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ بل اور اس کی بیگم، ملینڈہ گیٹس نے اگرچہ کھلم کھلا اپنی سماجی تنظیم کے ذریعے اپنے آپ کو نہیں نوازا تاہم وہ وقتاً فوقتاً ایسے اقدامات ضرور کرتے رہے جن کے ذریعے انھوں نے مفادات پورے کر ڈالے۔ کبھی اپنے بچوں کے اسکول کو بھاری بھرکم چندہ دیا تو کبھی اپنی ملکیتی کمپنیوں ہی کو نوازا۔ حتیٰ کہ اپنی سرگرمیوں کی خامیاں چھپانے کے لیے خصوصی گروپ تشکیل دیے۔ اس دوران وہ ٹیکسوں کی بھاری رقم بچا کر اپنی تنظیم اور ذاتی اثاثہ جات بھی بڑھاتے رہے۔

اصلیت کا پردہ چاک

سماجی فلاح و بہبود اپنا کر پھر بل گیٹس کی زندگی میں بھی انقلاب آگیا۔ کہاں تو وہ اپنی دھوکے کی بازی اور جھوٹ بولنے کی عادت کے باعث عوام میں معتوب ہو گیا تھا۔ حتیٰ کہ ایک بار برسلز میں اس کے چہرے پر لوگوں نے کریم کیک مَل دیا مگر سماجی میدان میں قدم دھرتے ہی وہ امریکا ہی نہیں دنیا بھر کے اربوں افراد کی نظر میں ہیرو بن بیٹھا لیکن وقت اب بدل رہا ہے اور عام لوگوں کے سامنے اس کی اصلیت کا پردہ چاک ہو چکا۔

یہ دوسری بات ہے کہ بل گیٹس نے سماجی فلاح و بہبود کے میدان میں جو کامیابیاں پائیں، ان سے دیگر امریکی کھرب پتی بھی متاثر ہوئے۔ انھیں احساس ہوا کہ وہ بھی اپنا مال دان کر کے نہ صرف عوام میں مقبول ہوں گے بلکہ حکومتی ایوانوں میں بھی اثر و رسوخ حاصل کر سکتے ہیں۔ ایسے متاثر ہونے والے امریکی دولت مندوں میں ایمزون کا مالک جیف بیزوس اور فیس بک کا مارک زکر برگ نمایاں ہیں۔

پابندیاں قبول نہیں

حکومت سے قانونی لڑائیاں لڑتے ہوئے بل گیٹس کا استدلال تھا کہ وہ مائیکروسافٹ کو پابندیوں کی زنجیر سے جکڑنا چاہتی ہے۔ بل نے کبھی یہ تسلیم نہیں کیا کہ اجارہ دار بننے کی خاطر اس نے خود غرضی اور لالچ دکھایا۔ بہرحال سماجی میدان میں پہنچ کر وہ اپنی فاؤنڈیشن کے ذریعے امریکا میں ان این جی اوز کو بھاری چندے دینے لگا جو صنعت و تجارت کو حکومتی پابندیوں سے آزاد دیکھنا چاہتی ہیں۔

یہ بھی ''مقصد مفاد'' کی ایک مثال ہے کہ بل گیٹس نے اپنی فاؤنڈیشن کے ذریعے اپنا ایک اور مفاد حاصل کر لیا۔ بل ان غیر سرکاری اداروں کو بھی امداد دیتا ہے جو ہر معاملے میں

حکومت کا کردار محدود کرنا چاہتے ہیں۔ خصوصاً ان کی خواہش ہے کہ حکومت کسی قسم کی شرائط کے بغیر شعبہ صنعت و تجارت کو ترقی دے اور اس کی مانگیں پوری کرے۔

پیٹنٹ کا موذی ہتھیار

گیٹس فاؤنڈیشن پچھلے بیس برس میں ان امریکی و برطانوی این جی اوز کو کروڑوں ڈالر بطور چندہ دے چکی جو تعلیمی اداروں میں ٹیکنالوجی کا فروغ چاہتی ہیں...... مطلب یہ کہ جماعتوں میں اساتذہ کی جگہ کمپیوٹر لے لیں اور روبوٹ اساتذہ بچوں کو تعلیم دیں۔ یہ دیکھیے کہ اس تبدیلی سے مائیکرو سافٹ ہی کو سب سے زیادہ فائدہ ہوگا کہ کمپنی کی مصنوعات ہاتھوں ہاتھ فروخت ہوں گی۔ یہ دوبارہ متصادم مقصد والا ہی معاملہ ہے لیکن عام لوگ گیٹس فاؤنڈیشن کی ایسی چالوں کو نہیں سمجھ پاتے کیونکہ وہ دھیان ہی نہیں دیتے۔

تعلیم ہی وہ واحد شعبہ نہیں جہاں گیٹس فاؤنڈیشن کے مالی مفادات صاف دکھائی دیتے ہیں۔ ایک شعبہ سافٹ ویئرز کے پیٹنٹ کو تحفظ دینا بھی ہے۔ بل گیٹس اکثر کہتا ہے کہ ہر شعبے میں پیٹنٹ کو قانونی تحفظ حاصل ہونا چاہیے۔ اس روش کا منفی روپ مگر یہ ہے کہ پیٹنٹ کردہ شے پھر بہت مہنگی ہو جاتی ہے۔ کیونکہ اس کی سستی نقول تیار کرنے پر پابندی ہوتی ہے۔ یہ روش عوام کے لیے نقصان دہ ہے۔

ادویہ کی من مانی قیمت

درج بالا دلیل کی ایک مثال ادویہ کی ساز کمپنیاں ہیں جن سے گیٹس فاؤنڈیشن قریبی تعلقات رکھتی ہے۔ ملٹی نیشنل کمپنیاں بڑی شدت اور سختی سے اپنی تیار کردہ ادویہ کسی کو بنانے نہیں دیتیں۔ اس چلن کی وجہ سے ہی انھیں موقع ملتا ہے کہ وہ اپنی ادویہ کی من مانی قیمتیں رکھ دیں۔ یوں عام آدمی ان ادویہ سے مستفید نہیں ہو پاتا۔ اس خرابی سے خصوصاً ترقی پزیر ممالک میں ہر سال لاکھوں غریب چل بستے ہیں کیونکہ وہ اپنی بیماری کی دوا ہی نہیں خرید پاتے۔

غریبوں کے حقوق کو تحفظ دینے والی ایک امریکی تنظیم، نالج ایکولوجی انٹرنیشنل کے سربراہ، جیمز لو، بل گیٹس کے سخت ناقد ہیں۔ کہتے ہیں:

''یہ آدمی اپنی فاؤنڈیشن کے بل بوتے پر ادویہ ساز کمپنیوں کے پیٹنٹ کا سخت دفاع کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ غریب

وارن بفٹ

ممالک میں بھی ان ادویہ کی سستی نقول (جینرک) ادویہ تیار نہیں ہونے دیتا۔ آخر یہ کس قسم کی سماجی بھلائی ہے؟ وہ ہمیشہ کارپوریٹ مفادات کی رکھوالی کرتا اور انھیں پورے کراتا ہے۔ وہ ملٹی نیشنل ادویہ ساز کمپنیوں کا بہت بڑا محافظ ہے مگر یہی بہت عجیب بات ہے کہ بل گیٹس بظاہر غریبوں کا بھلا چاہتا ہے لیکن وہ ادویہ ساز کمپنیوں کی سستی ادویہ بننے نہیں دیتا...... یہ کھلا تضاد اور منافقت ہے۔''

مالی فائدہ سب سے مقدم

حقیقت یہ ہے کہ دنیا بھر میں منافع کے لیے کام کرنے والی سیکڑوں کمپنیوں سے گیٹس فاؤنڈیشن کے تعلقات نے کئی

متصادم مفاد جنم دے ڈالے۔ ان سے عیاں ہے کہ فاؤنڈیشن کے تینوں ٹرسٹی (بل، ملینڈہ اور وارن بفٹ) اور ان کی کمپنیاں تنظیم کی رفاہی و سماجی سرگرمیوں سے مالی فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔

مثال کے طور پر پچھلے بیس برس میں فاؤنڈیشن نے ایسی بیسیوں کمپنیوں کو بھاری امداد دی جن میں وارن بفٹ نے سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ ان میں ماسٹر کارڈ اور کوکا کولا شامل ہیں۔ پھر بل گیٹس طویل عرصہ بفٹ کی کمپنی، برک شائر کے بورڈ آف ڈائریکٹرز میں شامل رہا اور حال ہی میں ریٹائر ہوا ہے۔ یہی نہیں، بل اور اس کی فاؤنڈیشن برک شائر کے اربوں ڈالر مالیت کے حصص کی ملکیت رکھتے ہیں۔

اپنی کمپنی کو بھی نہ چھوڑا

گیٹس فاؤنڈیشن کی سرگرمیوں کا جائزہ لیا جائے تو انکشاف ہوتا ہے کہ اس نے مائیکروسافٹ سے بھی مالی مفادات وابستہ رکھے۔ یاد رہے، بل گیٹس آج بھی بحیثیت مشیر ٹیکنالوجی اس کمپنی سے وابستہ ہے۔ متصادم مفاد کی ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔

چند سال قبل گیٹس فاؤنڈیشن نے 200 ملین ڈالر سے ایک منصوبہ شروع کیا۔ مقصد امریکا کی تمام سرکاری لائبریریوں میں کتب کو سافٹ ویئر کے ذریعے مربوط کرنا تھا۔ اسی مقصد کے لیے مائیکروسافٹ کے تیار کردہ سافٹ ویئر ہی استعمال کیے گئے۔ یوں فاؤنڈیشن کے ٹرسٹیوں نے اپنی ہی کمپنی کو مالی فائدہ پہنچا دیا۔ اسی طرح سائنس و ٹیکنالوجی کے کئی منصوبوں میں فاؤنڈیشن اور مائیکروسافٹ کے محقق مل کر کام کرتے رہے۔ ان کو تنخواہیں گیٹس فاؤنڈیشن سے ملتی تھیں اور تنظیم ہی دیگر خرچے بھی برداشت کرتی۔

یہ درست ہے کہ بل گیٹس ہی نے اپنی فاؤنڈیشن کو زیادہ تر دولت فراہم کی لیکن جب اس نے دولت کا بڑا حصہ اپنے

جب برسلز میں کیک پھینکا گیا

نجی و کاروباری مفادات پورے کرنے میں ہی استعمال کرنا تھا، تو پھر سماجی بھلائی کا جامہ کیوں زیب تن کر لیا؟ کیا اسی لیے کہ اپنی دولت کو بھاری ٹیکسوں سے بچایا جا سکے یا پھر اپنے مخصوص مفاد پورے کر لیے جائیں۔

بدنام زمانہ کمپنیوں سے تعلق

امریکا میں بل گیٹس کی سرگرمیوں پر تنقید کرنے والے ماہرین اکثر امریکی حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ اس کی ٹیکس تفصیل سامنے لائی جائے مگر حکومت یہ کہہ کر معذرت کر لیتی ہے کہ ازروئے قانون ٹیکس دہندہ کی معلومات افشا نہیں ہو سکتی۔ اس قانون سے بل گیٹس نے بہت فائدہ اُٹھایا اور فاؤنڈیشن کی راہ سے اپنے مالی مفادات پورے کرنے لگا۔

اس بات کی بہترین مثال یہی ہے کہ فاؤنڈیشن نے جن ملٹی نیشنل کمپنیوں مثلاً یونی لیور، میرک وغیرہ میں سرمایہ کاری کر رکھی ہے، وہ انھی کو کسی نہ کسی طرح بھاری چندے دیتی رہتی ہے۔ فاؤنڈیشن میں بل گیٹس نے ''اسٹریٹجک انویسمنٹ

فنڈ“ کے نام سے ایک فنڈ بنا رکھا ہے تاکہ سماجی فلاح و بہبود کے کام کیے جا سکیں مگر اسی فنڈ کے ذریعے ایک نئی کمپنی، اگبائیوم (AgBiome) میں 70 لاکھ ڈالر کی سرمایہ کاری ہوئی۔ اس کمپنی میں رقم لگانے والی دیگر کمپنیوں میں بدنام زمانہ زرعی کمپنی، مونسانتو اور سائجینٹا شامل تھیں۔

بعدازاں بل گیٹس نے اپنے فنڈ سے اگبائیوم کو مزید دو کروڑ ڈالر دیے تاکہ وہ افریقی کسانوں کے لیے کیڑے مار ادویہ تیار کر سکے۔ یہ بھی متصادم مفاد فعل تھا۔ سبھی جانتے ہیں کہ کیڑے مار ادویہ کی بدولت انسانوں میں مختلف بیماریاں جنم لے چکیں لیکن بیماری کے خلاف نبردآزما بل گیٹس اسی کمپنی کو بھاری چندہ دے رہا ہے جو بیماریاں پیدا کرنے والی مصنوعات تیار کرتی ہے۔

اسی طرح گیٹس فاؤنڈیشن مختلف اقسام کی اینٹی بائیوٹک ادویہ بنانے والی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو پچھلے بیس برس میں اربوں ڈالر بطور چندہ دے چکی مگر اب یہ سچائی منظرعام پر آ رہی ہے کہ رنگا رنگ اینٹی بائیوٹک ادویہ نے چھوتی بیماریوں میں اضافہ کر دیا۔ اب ان بیماریوں کے جراثیم طاقتور ہو چکے اور ان پر پرانی اینٹی بائیوٹک ادویہ اثر نہیں کرتیں۔ گویا انسانی صحت سے کھلواڑ کا ایک نیا دھندا ایجاد ہو چکا جس سے گیٹس فاؤنڈیشن جیسی بظاہر سماج سدھار تنظیمیں اور ملٹی نیشنل ادویہ ساز کمپنیاں خوب مالی فائدہ اُٹھا رہی ہیں۔

بل گیٹس کا حق گو باپ

قبل ازیں بتایا گیا کہ امریکا میں دولت مند سماجی تنظیمیں قائم کر کے انھیں اپنی دولت دان کر دیتے ہیں۔ اس روش کو امریکی امراء بھاری بھر کم ٹیکسوں سے بچنے کے لیے جوق در جوق اختیار کرنے لگے۔ دلچسپ بات یہ کہ بل گیٹس کا وکیل باپ، گیٹس سینئر اسی چلن کے خلاف تھا۔ اسی نے دور جوانی میں یہ مہم چلائی تھی کہ ہر دولت مند پر لازم کیا جائے کہ وہ مخصوص رقم ہی دان کر سکے۔ مدعا یہ تھا کہ بقیہ رقم پھر ٹیکسوں

والد کے ہمراہ

کے دائرے میں لائی جائے۔ تاہم امریکی امراء کی شدید مخالفت کے باعث گیٹس سینئر کی مہم ناکام ہو گئی۔

گیٹس سینئر کو یقیناً علم نہ تھا کہ خود اس کا بیٹا باپ کی تجویز پسند نہیں کرتا۔ مائیکروسافٹ کی تاریخ بتاتی ہے کہ یہ کمپنی مسلسل حکومت سے ٹیکس کم کرنے کا مطالبہ کرتی رہی۔ یہی نہیں، کمپنی نے سوئٹزرلینڈ، کیمن جزائر اور دیگر جگہوں پر آف شور کمپنیاں قائم کیں تاکہ ان کے ذریعے ٹیکسوں کی رقم بچائی جا سکے۔ اس طریقے سے مائیکروسافٹ نے بلامبالغہ اربوں ڈالر ٹیکس بچا لیے۔

ٹیکس نظام کے سلسلے میں بھی بل گیٹس، وارن بفٹ اور ان کے ہمنوا امریکی کھرب پتیوں کی منافقت نمایاں ہے۔ جب امریکا میں بجٹ پیش کرنے کا وقت آئے تو یہ لوگ میڈیا میں بیان دیتے ہیں کہ امراء پر سپر ٹیکس لگایا جائے مگر سال کے بقیہ مہینوں میں وہ یہ مہم چلاتے ہیں کہ امریکی حکومت ہرگز ایسے ٹیکس وضع نہ کرے جو ان کی دولت کم کر کے اُسے اپنے دائرہ کار میں لے آئے۔

ٹیکس چوری کا ایک طریقہ

ٹیکس چوری کے سلسلے میں مائیکروسافٹ کا طریق کار یہ

بل گیٹس کے نزدیک بیماری کا واحد علاج ویکسین ہے

ہے کہ اس نے ان ممالک میں دفتر کھول رکھے ہیں جہاں کم سے کم ٹیکس لگتے ہیں۔ ان میں آئرلینڈ، لکسمبرگ اور سنگاپور نمایاں ہیں۔ مائیکروسافٹ پھر خصوصاً اپنا آن لائن بزنس انھی تین ممالک کے ذریعے کرتی اور یوں ایک اندازے کے مطابق سالانہ دس ارب ڈالر ٹیکسوں کی مد میں بچا لیتی ہے۔ یہ غیر قانونی فعل نہیں مگر غیر اخلاقی ضرور ہے۔ خصوصاً بل گیٹس ترقی پذیر ممالک میں اکثر لوگوں کو یہ بھاشن دیتا ہے کہ انھیں اپنے حصے کا ٹیکس ادا کرنا چاہیے۔ ایک ٹیکس چور کے منہ سے یہ نصیحت بھلی نہیں لگتی۔

ہر قیمت پر منافع

بل گیٹس جب 2000ء کے بعد بظاہر سماجی بھلائی کی جانب متوجہ ہوا تو وہ مائیکروسافٹ کمپنی میں اپنے حصص فروخت کرنے لگا۔ مقصد یہ تھا کہ گیٹس فاؤنڈیشن کو رقم دی جا سکے لیکن ہمیں یہ سچائی فراموش نہیں کرنا چاہیے کہ بل گیٹس بنیادی طور پر سرمایہ دار ہے۔ اس نے ساری عمر ایسی پالیسیاں ہی بنائیں کہ اس کی دولت میں اضافہ ہو سکے۔ اسی طرح ہر کمپنی بھی ازروئے قانون یہ کوشش کرتی ہے کہ اس کا منافع بڑھ سکے۔ لٰہذا کمپنیاں جو بھی قدم اُٹھائیں، لامحالہ مدعا یہی ہوتا ہے کہ منافع کمایا جا سکے...... چاہے اس سلسلے میں سماجی فلاح و بہبود کا شعبہ ہی استعمال کر لیا جائے۔

ادویہ ساز کمپنیوں سے خصوصی تعلق

یہ بات قابل ذکر ہے کہ مائیکروسافٹ کے حصص بیچ کر

بل گیٹس کو جو اربوں ڈالر ملے، ان کی اکثریت بل اور اس کی گیٹس فاؤنڈیشن، دونوں نے ادویہ ساز کمپنیوں میں بطور سرمایہ کاری لگا دیے۔ اس کی وجہ ہے۔ ادویہ بنانا اور بیچنا ایک بہت بڑا اور منافع بخش کاروبار بن چکا اور یہ سرمایہ کاروں کو بطور منافع اچھی رقم دیتا ہے۔

یہی وجہ ہے، 2002ء میں بل اور گیٹس فاؤنڈیشن نے گلیکسو سمتھ لائن، ایلی للی، میرک اور فائزر کے کروڑوں ڈالر مالیت کے حصص خرید لیے۔ اسی سال گیٹس فاؤنڈیشن نے دنیا کی نو بڑی ادویہ ساز کمپنیوں میں 200 ملین ڈالر کا سرمایہ لگایا جو تب خاصی بڑی رقم تھی۔

رفتہ رفتہ بل اور اس کی فاؤنڈیشن ویکسینیں بنانے اور ادویہ ایجاد کرنے کی خاطر ادویہ ساز کمپنیوں کو ''مالی امداد'' بھی دینے لگی۔

ویکسین کے دھندے کا آغاز

مثال کے طور پر انھوں نے ایک ارب ڈالر ملیریا کی ویکسین بنانے کی خاطر مختص کیے۔ یہ چھوتی مرض ہر سال افریقہ و ایشیا میں لاکھوں افراد مار ڈالتا ہے۔ ماہرین طب کی اکثریت کا کہنا ہے کہ ویکسین بھی ایک دوا ہے..... یہ کسی کو اس آتی ہے تو کسی کو نقصان پہنچا دیتی ہے۔ اسی لیے چھوتی امراض ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ عام لوگوں میں ان کی بابت شعور پیدا کیا جائے۔ انھیں بتایا جائے کیونکر چھوتی امراض مثلاً ملیریا، فلو، پولیو، کووڈ 19 وغیرہ سے بچنا چاہیے۔

گیٹس فاؤنڈیشن نے مگر تیسری دنیا کے عوام میں چھوتی امراض سے متعلق معلومات پھیلانے کے بجائے ویکسینیں متعارف کرانے کو ترجیح دی۔ کئی ماہرین کا کہنا ہے کہ وجہ یہ ہے، اس مہم میں پیسا نہیں تھا۔ اسی لیے بل گیٹس نے یہ مہم نہیں چلائی بلکہ ویکسینیں بنانے پر اپنے وسائل جھونک دیے مگر کئی ممالک میں گیٹس فاؤنڈیشن کی تجویز کردہ ویکسینوں سے تباہ کن اثرات بھی سامنے آئے۔

رابرٹ فرانسس کینیڈی امریکا کا سماجی راہنما ہے۔ یہ مقتول امریکی صدی، جان ایف کینیڈی کا بھتیجا اور مقتول سینٹر رابرٹ کینیڈی کا بیٹا ہے۔ پچھلے بیس تیس برس کے دوران مختلف ممالک میں ویکسین مہمات سے جو مضر عوامل سامنے

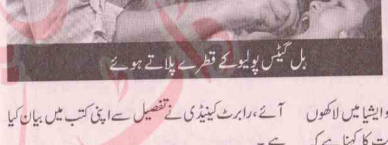
بل گیٹس پولیو کے قطرے پلاتے ہوئے

آئے، رابرٹ کینیڈی نے تفصیل سے اپنی کتب میں بیان کیا ہے۔

ویکسین مہمات کے منفی نتائج

وہ لکھتا ہے کہ 2000ء میں گیٹس فاؤنڈیشن نے سب سے پہلے افریقا میں بچوں کو گردن توڑ بخار کی ویکسین لگانے کی مہم چلوائی۔ اس مہم سے کئی بچے فالج میں مبتلا ہو گئے۔ جنوبی افریقا کے اخبارات نے تب یہ خبر شہ سرخیوں میں لگائی ''افریقی بچے ادویہ ساز کمپنیوں کے لیے گنی پگ بن گئے۔''

نیلسن منڈیلا کے ساتھی اور ماہر معاشیات، پروفیسر پیٹرک بانڈ نے بل گیٹس کی سماجی سرگرمیوں کو ''ظالمانہ'' اور ''غیر اخلاقی'' قرار دیا۔

2010ء میں گیٹس فاؤنڈیشن کی مالی مدد سے گلیکسو سمتھ لائن نے ملیریا کی تجرباتی ویکسین بنائی۔ اس نے ڈیڑھ سو سے زائد افریقی بچے مار ڈالے۔ جبکہ ہزار ہا بچے فالج، تشنج اور دیگر طبی خرابیوں کا نشانہ بن گئے۔

بھارت میں تباہی

2014ء میں گیٹس فاؤنڈیشن کی مالی امداد سے گلیکسو سمتھ لائن اور میرک نے تجرباتی طور پر ایچ پی وی (HPV) ویکسین ایجاد کی۔ اسے بھارت کی ریاستوں میں ''23 ہزار'' لڑکیوں پر آزمایا گیا۔ بارہ سولڑکیاں ویکسین لینے سے بانجھ ہو گئیں۔ ان میں دیگر طبی خلل بھی پیدا ہو گئے۔ سات سو لڑکیاں بعد ازاں چل بسیں۔

بھارتی حکومت کے تفتیش کاروں نے چھان بین سے انکشاف کیا کہ گیٹس فاؤنڈیشن کے تنخواہ دار محققوں نے غیر اخلاقی جرائم انجام دیے۔ مثلاً دیہات کی معصوم لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر ویکسین دی۔ ان کے والدین پر دباؤ ڈالا حتیٰ کہ جعلی فارم بنائے اور جب لڑکیاں بیمار ہوئیں تو ان کا علاج کرانے سے انکار کر دیا۔ بھارتی حکومت نے محققوں کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا جو سپریم کورٹ میں زیر سماعت ہے۔

2000ء میں بل گیٹس نے بھارت سے پولیو کا خاتمہ کرنے کی خاطر ویکسین مہم کا آغاز کیا۔ بھارتی حکومت نے نیشنل ایڈوائزری بورڈ کا انتظام اس کے حوالے کر دیا۔ تب بھارتی بچوں کو پانچ پولیو ویکسین ملتی تھیں۔ بل گیٹس نے انھیں پچاس تک پہنچا دیا۔ بھارتی ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ گیٹس فاؤنڈیشن نے جو ویکسینیں متعارف کرائیں، ان سے بھارت میں پولیو کی نئی اقسام پیدا ہو گئیں۔

ان اقسام پر مروجہ پولیو ویکسینیں اثر نہیں کرتی تھیں۔ اسی لیے 2000ء سے 2017ء تک انھوں نے تقریباً پانچ لاکھ بچوں کو معذور بنا دیا۔ 2017ء میں بھارتی حکومت نے گیٹس فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام چلنے والی پولیو ویکسین مہم ختم

رابرٹ فرانسس کینیڈی

کر دی۔ نیز نیشنل ایڈوائزری کونسل سے بل گیٹس اور اس کے چیلے چانٹے نکال دیے۔ اسی سال عالمی ادارہ صحت نے طوعاً کرہاً تسلیم کیا کہ گیٹس فاؤنڈیشن کی زیر سرپرستی چلنے والی پولیو ویکسین مہم سے دنیا میں اس چھوتی مرض کی نئی اقسام لے چکیں اور یہ کانگو، فلپائن اور افغانستان میں بچوں کو نشانہ بنا رہی ہیں۔

ڈی ٹی پی ویکسین

پاکستان کے علاوہ کئی ترقی پزیر ممالک میں خناق، کالی کھانسی اور تشنج سے بچاؤ کی خاطر بچوں کو ڈی ٹی پی ویکسین دی جاتی ہے۔ 2017ء میں حکومت ڈنمارک نے ماہرین کی ایک ٹیم کو یہ ذمے داری سونپی کہ افریقی ملک، گنی بساؤ جا کر ڈی ٹی پی کے اثرات کا جائزہ لیں۔ اس ٹیم کے سربراہ ڈاکٹر سورین مونگن سین تھے۔ ٹیم کے اکثر ارکان ویکسینوں کے حامی تھے۔

گنی بساؤ میں ہر سال 50 فیصد بچے پانچ سال کی عمر سے پہلے چل بستے ہیں۔ ٹیم کو تحقیق سے معلوم ہوا کہ جن بچے بچیوں نے پچھلے سال میں ڈی ٹی پی ان، ان میں شرح اموات ویکسین نہ لینے والے بچوں سے ''دس گنا'' زیادہ تھی۔ اس انکشاف نے ماہرین طب کو حیران پریشان کر دیا۔

انھوں نے پھر حکومت ڈنمارک، عالمی ادارہ صحت اور بل گیٹس کی زیر سرپرستی چلنے والی سرکاری و نجی تنظیم، گیوی پر زور دیا کہ چھوٹے بچوں کو ڈی ٹی پی ویکسین نہ دی جائے تاہم ڈینش ماہرین کی تجویز رائیگاں گئی۔ وجہ یہی ہے کہ ڈی ٹی پی پر پابندی لگا دی جائے تو نامی گرامی ادویہ ساز کمپنیوں کو مالی نقصان ہوگا۔ یہ وہ کمپنیاں ہیں جن میں بل گیٹس نے ذاتی طور پر یا گیٹس فاؤنڈیشن کے ذریعے سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔

گیٹس فاؤنڈیشن کے بین الاقوامی ویکسین پروگرام کی مخالفت کرنے والے ماہرین طب کا دعویٰ ہے کہ اس تنظیم نے عالمی ادارہ صحت کا ایجنڈا ہائی جیک کر لیا ہے۔ پہلے یہ ادارہ غریبوں کو خوراک اور صاف پانی مہیا کرنے کے منصوبے بناتا تھا۔ ان کی معاشی طور پر مدد بھی کرتا لیکن اب وہ بل گیٹس کے اس ذاتی یوٹوپیا پر عمل کر رہا ہے کہ صرف ویکسین اور دیگر ادویہ کے ذریعے ہی انسان صحت مند ہو سکتا ہے۔

یہ واضح رہے کہ ویکسین سے ہزارہا بچوں بڑوں کو فائدہ بھی ہوتا ہے۔ وہ کئی چھوتی امراض سے محفوظ ہو جاتے ہیں مگر جنھیں ویکسین راس نہ آئے، تو وہ مختلف طبی مسائل میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا ایسا کوئی نظام وضع ہونا چاہیے جو یہ بتلا دے کہ ویکسین سے کس کو فائدہ ہوگا اور کسے یہ نہیں لگنی چاہیے۔

کھربوں ڈالر کا بزنس

یہ بھی حقیقت ہے کہ ادویہ سازی کے دیگر شعبوں کی طرح اس شعبے میں اچھے برے، دونوں قسم کے لوگ ملتے ہیں۔ لالچی اور خود غرض مالکان کمپنی اپنی مصنوعات فروخت کرنے کی خاطر جھوٹی رپورٹیں شائع کراتے اور ان کی غلط تشہیر کرتے ہیں۔ یوں وہ انسانی جانوں سے کھیلتے ہیں۔ نیز پچھلے کئی عشروں سے ادویہ ساز کمپنیاں ایسی دوائیں بنا رہی ہیں جو وقتی طور پر علامات تو ختم کر دیتی ہیں مگر مرض کا خاتمہ نہیں کرتیں۔ یوں جو انسان ایک دفعہ ادویہ استعمال کرنے لگے، تو پھر بڑی مشکل سے اس کی جان چھوٹتی ہے۔

بل گیٹس کی باتوں اور اقدامات سے عیاں ہے کہ وہ دنیا بھر میں ویکسینوں اور ادویہ کا پھیلاؤ چاہتا ہے چاہے ان کے منفی اثرات ہزارہا انسانوں کی جانیں لے لیں۔ وہ ماضی میں وقتاً فوقتاً ذکر کرتا رہا ہے کہ جلد یا بدیر کوئی عالمگیر وبا دنیا کو لپیٹ میں لے سکتی ہے۔ اس نے جو کابوس (ڈراؤنا خواب) ہمیں دکھایا، وہ ماہ مارچ میں کووڈ 19 کی صورت سامنے آ گیا۔

لاک ڈاؤن کیسے ہوا؟

کووڈ 19 فلو سے ملتی جلتی وبا ہے۔ دنیا میں فلو کے وائرس ہر سال لاکھوں مرد و زن کو مار ڈالتے ہیں۔ لیکن ان وائرسوں سے کبھی کاروبار زندگی بند نہیں ہوا۔ کووڈ 19 نے تو دو اڑھائی ماہ تک زندگی کا پہیہ ہی جام کر دیا جس سے عالمی معیشت کو نقصان پہنچا۔

دنیا بھر میں زبردست لاک ڈاؤن کا معاملہ بعض باتوں کی وجہ سے مشکوک دکھائی دیتا ہے۔ اس ضمن میں ایک اہم معاملہ بل گیٹس سے تعلق رکھتا ہے۔ ماہ مارچ کے وسط سے عالمی ادارہ صحت یہ دہائی مچانے لگا کہ کووڈ 19 پوری دنیا تباہ کر سکتی ہے۔ یوں اس نے خوف و دہشت کا ماحول پیدا کر دیا۔

عام لوگ نہیں جانتے کہ حکومت امریکا کے بعد گیٹس فاؤنڈیشن عالمی ادارہ صحت کو مالی امداد دینے والی دوسری بڑی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم آسٹریلیا، کینیڈا، فرانس، روس اور برطانیہ کے مجموعی چندے سے زیادہ بڑی رقم عالمی ادارہ صحت کو دیتی ہے۔

عالمی ادارہ صحت کا مشکوک سربراہ

دوسری اہم بات یہ کہ عالمی ادارہ صحت کا موجودہ ڈائریکٹر جنرل، ٹیڈروس ادہام نوم گیبریوس بل گیٹس کی طرح ڈاکٹر نہیں بلکہ سیاست داں ہے۔ وہ ایتھوپیا کا وزیر صحت رہا ہے۔ اس دوران موصوف پر الزام لگا کہ وہ چھوتی امراض پھوٹنے کے واقعات چھپانے کی کوششیں کرتا رہا۔ اس کو بل گیٹس کی سعی سے ڈائریکٹر جنرل کا عہدہ ملا۔ وزارت

چھوڑنے کے بعد وہ بل گیٹس کی مختلف سماجی تنظیموں میں کام کرتا رہا تھا۔

دو اداروں کی رپورٹیں

عالمی ادارہ صحت، امریکا، برطانیہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور دیگر مغربی ممالک کی حکومتوں نے دو سائنسی اداروں کی تحقیق کی بنیاد پر کووڈ 19 کو خطرناک وبا قرار دیا اور لاک ڈاؤن اختیار کر لیا۔ صرف سویڈن ان مغربی ممالک سے الگ تھلگ رہا۔ ان دونوں تحقیقی اداروں کا گیٹس فاؤنڈیشن سے قریبی تعلق ہے۔

پہلا ادارہ ''امپریئل کالج، لندن'' ہے۔ اس ادارے کی کووڈ 19 ریسرچ ٹیم نے 16 مارچ کو رپورٹ دی کہ اگر لاک ڈاؤن نہ کیا گیا تو وبا سے برطانیہ میں پانچ لاکھ اور امریکا میں بائیس لاکھ افراد مر سکتے ہیں۔

دوسرے ادارے کا نام ''دی انسٹیٹیوٹ فار ہیلتھ میٹرکس اینڈ ایلیوایشن'' ہے۔ یہ امریکی ریاست واشنگٹن میں واقع ہے جہاں بل گیٹس بھی رہتا ہے۔ اس ادارے کے ماہرین نے بھی اپنی تحقیقی رپورٹ میں بتایا کہ لاک ڈاؤن نہ ہوا، تو امریکا میں لاکھوں مرد و زن وبا کا نشانہ بن سکتے ہیں۔

صدر ٹرمپ، برطانوی وزیراعظم جانسن اور کینیڈین وزیراعظم نے درج بالا سائنسی اداروں کی رپورٹوں کی بنیاد پر لاک ڈاؤن اپنانے کا فیصلہ کیا۔ ان کے بعد دنیا کی دیگر حکومتیں بھی اپنے اپنے ملک بند کرنے لگیں اور کرۂ ارض پر سارے کام ٹھپ ہو گئے۔

گیٹس فاؤنڈیشن کی بھاری امداد

لاک ڈاؤن کی تجویز دینے والے دونوں ادارے گیٹس فاؤنڈیشن سے بھاری رقم بطور امداد لے چکے۔ صرف اس سال امپریئل کالج لندن، فاؤنڈیشن سے ''اکہتر ملین ڈالر'' لے چکا۔ اسی طرح فاؤنڈیشن نے 2017ء میں واشنگٹن کے انسٹیٹیوٹ میں ''دو سو انہتر ملین ڈالر'' کی سرمایہ کاری کی تھی۔

> اپنے جذبات اور ارادوں کو مشیت خداوندی کے تابع رکھنا اور تمام فرائض حیات کو ایک لفظ میں سمیٹنے کا نام ہے 'اسلام' کسی ڈکٹیٹر کے سامنے جھکنے اور خدا کے سامنے جھکنے میں زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے جو خدا کے سامنے جھک کر مسلم بن جائے۔ اُس کی ذمہ داری اس دنیا اور اگلی دنیا دونوں اُس کے فرائض ہو جاتے ہیں۔ اس طرح مسلم بیک وقت عابد و زاہد بھی بنتا ہے اور سپاہی بھی۔ وہ میدان جنگ میں جانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے لیکن صرف اُس جنگ کے لیے جو دنیا سے شر کو مٹانے کے لیے کی جائے۔ (سویلائزیشن ان ایسٹ اینڈ ویسٹ)
>
> ☆☆☆

مقصد یہ تھا کہ انسٹیٹیوٹ وسیع پیمانے پر تحقیقی سرگرمیاں انجام دے سکے۔

ڈاکٹر انتھونی فیوچی بھی......

ایک اور انکشاف ملاحظہ فرمائیے۔ امریکا میں حکومت کا ترجمان، ڈاکٹر انتھونی فیوچی کووڈ 19 کے سلسلے میں اتھارٹی بن گیا۔ اس کا استدلال تھا کہ ویکسین بننے تک یہ وبا تباہی مچاتی رہے گی۔ لہٰذا حکومتوں کو ویکسین بنانے کی خاطر اربوں ڈالر خرچ کرنے چاہئیں۔ یوں ادویہ ساز کمپنیوں کا ترجمان بن بیٹھا۔

یہ ڈاکٹر فیوچی بل گیٹس کے منصوبوں سے براہ راست تعلق رکھتا ہے۔ 2010ء میں جب گیٹس فاؤنڈیشن نے دنیا بھر میں ویکسینیں پھیلانے کی خاطر اپنا منصوبہ ''ویکسینوں کا عشرہ'' (Decade of Vaccines) بنایا تو اُسے انجام دینے والے ڈائریکٹروں میں سے ایک ڈاکٹر فیوچی تھا۔ یہ

منصوبہ 10 ارب ڈالر کی لاگت سے شروع ہوا تھا۔ پچھلے سال گیٹس فاؤنڈیشن نے ڈاکٹر فیوچی کے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف الرجی اینڈ انفیکشن کو پچاس ملین ڈالر کی امداد دی تھی۔

کووِڈ 19 کو بڑھایا چڑھایا گیا

کووِڈ 19 یقیناً ایک مہلک وبا ہے مگر درج بالا حقائق سے عیاں ہے کہ شاید اپنے مفادات کی تکمیل کے لیے اس وبا کو بڑھا چڑھا کر، نہایت خطرناک طور پر پیش کیا گیا۔ لاک ڈاؤن بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ ممکن ہے، اس سارے تام جھام کا مقصد یہ ہو کہ ویکسین اور دیگر ادویہ بنانے والی ملٹی نیشنل کمپنیوں کو اربوں ڈالر کا بزنس دیا جا سکے۔

اب تک حقائق وشواہد یہ سچائی سامنے لا چکے کہ بل گیٹس یقیناً اپنی دولت کے بل بوتے پر انسانیت کو لاحق مسائل دُور کرنے کی سعی کر رہا ہے مگر یہ سماجی بھلائی بے غرضی نہیں مفاد پرستی سے لتھڑی ہوئی ہے۔ بل گیٹس سماجی بھلائی کی جو بھی سرگرمی انجام دے، پہلے دیکھ لیتا ہے کہ کیا اس میں کسی قسم کا فائدہ ہو رہا ہے یا نہیں۔ اگر کوئی فائدہ نہیں ہوتا تو پھر بل گیٹس اُسے انجام نہیں دیتا۔ یہ انسانیت کی فلاح وبہبود نہیں ایک قسم کا بزنس ہے جو اُسے نہ صرف مالی فوائد پہنچا رہا ہے۔ بلکہ وہ ایسی طاقتور عالمی شخصیت بھی بن گیا جو حکومتوں کی پالیسیوں پر اثرانداز ہونے کی قوت رکھتا ہے۔

سماجی بھلائی اور دین اسلام

بل گیٹس جس انداز میں خدمت خلق کر اور فیاضی دکھا رہا ہے، دین اسلام میں اس کی ممانعت ہے۔ ایک مخیر مسلمان صرف اللہ کی راہ میں غریب ومسکین پر خرچ کرتا ہے۔ اپنا رقم خرچنے سے اس کا کوئی مفاد وابستہ نہیں ہوتا اور نہ ہونا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے:

’’اگر تم اپنے صدقات اعلانیہ دو تو یہ بھی اچھا ہے۔ (لیکن) اگر تم ان کو چھپاؤ اور چپکے سے غریبوں کو دے دو، تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے اور اللہ تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور جو کچھ تم کرتے ہو، اللہ کو بہرحال اس کی خبر ہے۔‘‘ (البقرہ۔ 271)

دین اسلام نے تو خدمت خلق اور انسانی بھلائی کا جامع نظام دیا ہے۔ ’’زکوٰۃ‘‘ اور ’’فطرانہ‘‘ اس نظام میں ہر مسلمان پر فرض ہیں۔ جبکہ ’’صدقہ‘‘ اور ’’وقف‘‘ رضا کارانہ عمل ہیں۔ قرآن وحدیث میں خدمت خلق کی بہت فضیلت آئی ہے۔ احادیث نبویؐ ہیں کہ راہ سے پتھر ہٹا دینا بھی صدقہ ہے۔ اسی طرح کوئی مسلمان مال سے دوسرے انسانوں کی مدد نہیں کر سکتا، تو انھیں نقصان نہ پہنچانا اور ان کی بھلائی کا سوچنا بھی صدقہ ہے۔ اس عمل سے بھی مسلمان کو ثواب واجر ملے گا۔

خدمت خلق کے سلسلے میں یہ احادیث نبوی ﷺ ہر مسلمان کے لیے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتی ہیں:

☆ اس صدقے میں سب سے زیادہ ثواب ہے جسے تم صحت کے ساتھ اور بخل کے باوجود انجام دو۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو رزق ہم نے تمہیں دیا ہے، اس میں سے خرچ کرو، اس سے پہلے کہ تم کو موت آجائے۔ (صحیح بخاری)

☆ خیرات کو مت روکو ورنہ تیرا رزق بھی روک لیا جائے گا۔ (صحیح بخاری)

☆ گننے نہ لگ جانا ورنہ پھر اللہ بھی تجھے گن گن کر ہی دے گا۔ (صحیح بخاری)

اگر زندہ رہے.....؟

بزرگوں کے ساتھ ایسا سلوک کیوں؟

پڑھیے صفحہ نمبر 95

ہر وبا کی دوا نماز

یہی ایک وہ مستند کلیہ ہے جو بحیثیت مسلمان ہمیں ہر طرح کے ڈپریشن اور ذہنی عوارض سے نجات فراہم کرتا ہے

طاہر ایوب جنجوعہ

انسانی فطرت کا تقاضا ہے روزِ ازل سے انسان سکون اطمینان اور خوشیوں کا متلاشی رہا ہے۔ اس مقصد کے لیے نہ صرف وہ ہر طرح کے جتن کرتا بلکہ انھیں ہر مول اور ہر قیمت میں خریدنے کی بھی بھرپور کوشش کرتا ہے۔ آج کے اس موجودہ دور میں چہار سُو جس طرح سے پریشانیوں، غموں اور دکھوں کے کالے سیاہ بادل چھائے ہوئے اور جس طرح ہمارے معاشرے کا ہر فرد نفسیاتی دباؤ، ذہنی انتشار اور اندرونی خلفشار کا شکار ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بحیثیت مسلمان کوئی وجہ تو ہے جو ہماری اس طرزِ معاشرت میں افراتفری اور بحرانی کیفیات برپا کیے ہوئے ہے۔

آج اسلام کی دولت اور ایک مکمل نظامِ زندگی موجود ہونے کے باوجود ہماری تہذیبی ومعاشرتی حالت یہ ہے کہ عامل پیر، بابے، نجومی اور جوتشی جگہ جگہ ٹینشن بھگاؤ سینٹر کھولے دن رات ’’ہر مشکل کا حل‘‘، ’’ہر کامیابی کا راز‘‘ جیسے دعوؤں سے نہ صرف ’’فیض‘‘ بانٹتے پھر رہے بلکہ تمام طرح کی بیماریوں، مصائب ومشکلات کے علاج بھی ایجاد کر چکے ہیں۔ یہ الگ بات کہ ان کے اس فیض سے کسی کو افاقہ ہو نہ ہو، ان کی اپنی پریشانیاں اور غم ضرور دور ہو جاتے ہیں۔ اس وقت تو یہ دھندہ جدید خطوط پر استوار ہو کر باقاعدہ ایک انڈسٹری اور کاروبار کی صورت اختیار کر چکا۔ بہرحال یہ ایک الگ اور بڑا موضوع ہے، جس پر پھر کبھی ضرور بات ہوگی۔ فی الوقت ہمارا موضوع ایک اینٹی ڈپریشن، اینٹی اینگزائٹی اور اینٹی اسٹریس دوا اور بے چین دلوں کا چین، اور بے قرار روحوں کی غذا یعنی نماز ہے۔

بحیثیت مسلمان نماز ہماری زندگیوں میں بہت اہم ہے۔ یہ ایسا تحفہِ خداوندی ہے جو حقیقی معنوں میں کامیابی اور شفا کا ضامن ہے۔ جو باقاعدگی سے نماز ادا کرتے ہیں، وہ اس کی لذت، چاشنی، لطف اور سرُور کو اچھی طرح محسوس کر سکتے ہیں۔ میں کوئی عالم نہیں، نہ ہی کوئی داعی یا مبلغ کہ قرآن و حدیث یا آئمہ ومحدثین کے اقوال وفرامین کی روشنی میں اس کی برتری واہمیت ثابت کروں۔ اس موضوع پر بہت کچھ لکھا

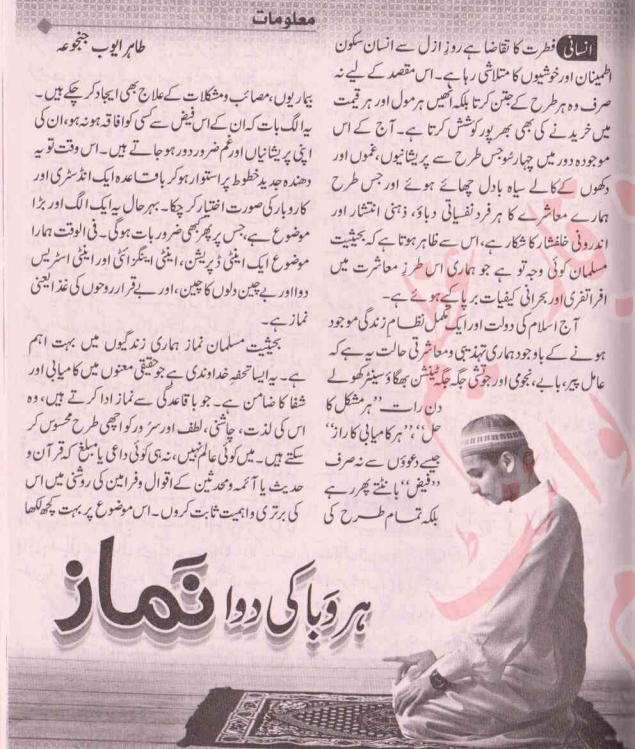

جاچکا اور لکھا جارہا ہے۔ اس حوالے سے ایک دلچسپ اور حقیقی امر یہ بھی ہے کہ نماز کی ادائیگی کے طریقہ کار کے سوا اس کی فرضیت پر تمام مسالک اسلامیان کا نہ صرف اتفاق ہے، بلکہ تمام مسالک نماز کی ادائیگی کو غیر معمولی اہمیت بھی دیتے ہیں۔

نماز خالقِ کائنات سے تعلق کا ایک دیرینہ ذریعہ اور عبادات میں سب سے اہم عبادت ہے۔ نماز کی رُوحانی و ایمانی برکات بھی اپنی جگہ مسلّم لیکن سردست ہمارا موضوع انسان کی ذہنی و جسمانی صحت پر خشوع وخضوع سے ادا کی گئی نماز کے اثرات اور جدید طبی تحقیقات کی رُو سے اس کے ثمرات کا جائزہ ہے۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ ہر سطح کی برائیاں، عیب اور نقص انسانی زندگی میں ذہنی انتشار اور نفسیاتی بگاڑ کا سبب بنتے ہیں اور ماہرینِ نفسیات کے مطابق انسان کا یہ اندرونی خلفشار ہی انسان میں رنج، الم اور حزن وملال کی کیفیات برپا کرتا ہے۔ اسی طرح جدید طبی ماہرین کے مطابق طہارت، پاکیزگی اور نفاست نہ صرف انسانی ذہن پر انتہائی مثبت اور خوشگوار اثرات مرتب کرتی بلکہ اسے آزردگی اور بے سکونی کی کیفیات سے بھی نجات دلاتی ہے۔ ان حقائق کے پیشِ نظر بلاشبہ یہ دعوے سے کہا جاسکتا ہے کہ نماز انسان کو ہر طرح کی ذہنی و نفسیاتی اور جسمانی پیچیدگیوں سے چھٹکارا دلا کر اسے سکون، فراغت اور طمانیت کا خوشگوار احساس بخشتی ہے۔

سجدہ اور دماغی کارکردگی

یونیورسٹی آف ملائیشیا کی ایک ریسرچ نے سائنس وطب کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا ہے۔ اس تحقیق کے مطابق دورانِ نماز مختلف نمازیوں کی حرکات وسکنات کا بغور معائنہ کیا گیا۔ نتائج سے پتہ چلا کہ نماز کے دوران اور خصوصاً سجدے کے وقت دماغ میں ایلفا ویوز ایکٹویٹی میں نمایاں اضافہ دیکھا گیا۔ ایلفا ویوز وہ اعصابی لہریں ہیں جو انسانی دماغ میں سکون، اطمینان اور خوشی کے جذبات پیدا کرتی ہیں۔

یہ لہریں روزمرہ زندگی کی مشکلات اور تکالیف کے شکار دماغ کو پُرسکون کرنے اور انسانی توجہ اور صلاحیتوں کو نکھارنے میں بھی اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ ایلفا ویوز کی کثرت دماغ کے پرائمل اور آکسیپٹل حصوں میں دیکھی گئی جو کہ دماغ کے بالائی اور عقبی حصوں میں واقع ہوتے ہیں۔

سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ بار بار کے تجربات کے دوران یہی صورتحال نظر آئی اور اگرچہ دیگر مراحل کے دوران ایلفا ویوز میں نسبتاً کم اضافہ ہوتا تھا لیکن سجدے کے دوران ان کے سگنل عروج پر پہنچ جاتے۔ تجربے کے نتائج اس قدر شاندار اور حیران کن تھے کہ اس تحقیق کو فوری طور پر بین الاقوامی شہرت یافتہ سائنسی جریدے اپلائیڈ سائیکالوجی میں شائع کرنے کی درخواست کردی گئی۔

دلچسپ بات یہ کہ مغرب کے متعدد جرائد نے بھی اس تحقیق کے بارے میں مضامین شائع کیے اور اعتراف کیا کہ اس بات کے سائنسی شواہد موجود ہیں کہ مسلمانوں کی یہ عبادت دماغ میں ایلفا ویو کار کردگی کو نمایاں طور پر بڑھا دیتی ہے۔

یوگا سے بہتر نماز

مغرب کے ماہرینِ نفسیات ''یوگا'' کی اہمیت وافادیت کے قائل ہیں۔ وہ اکثر ذہنی انتشار، پریشانی اور بے خوابی کے شکار مریضوں کو یوگا کی تلقین کرتے ہیں۔ یوگا کا بنیادی اصول ہی یہ ہے کہ مریض اپنی تمام تر توجہ اور دماغی قوت صرف ایک نقطے پر مرکوز کردیتا ہے۔ ایک وقت میں صرف ایک ہی خیال ذہن میں موجود رہتا ہے اور اس کے علاوہ دیگر افکار وخیالات سے توجہ ہٹالی جاتی ہے۔ اس سے دماغ رفتہ رفتہ پُرسکون ہو جاتا ہے اور ذہنی انتشار اور پریشانی ختم ہوجاتی ہے۔

''یوگا'' کا یہ انداز اور علاج تو آج دریافت ہوا لیکن نماز میں اللہ کی جانب دل کو متوجہ کرنے اور دیگر تمام افکار و خیالات سے توجہ ہٹا کر اللہ کے سامنے کھڑا رہنے اور یک سوئی

کے اس تصور سے ذہنی انتشار و پریشانی دُور کرنے کا طریقہ چودہ سو سال پہلے نماز کی شکل میں بتا دیا گیا۔

جسمانی تناؤ اور بے چینی کا خاتمہ

اسی طرح برطانیہ کی برمنگھم یونیورسٹی، امریکا کی مینیسوٹا یونیورسٹی اور پین اسٹیٹ یونیورسٹی کی مشترکہ تحقیق کے دوران یہ بات سامنے آئی کہ اگر پانچ وقت کی نماز کو عادت بنالیا جائے اور درست انداز سے ادا کی جائے تو یہ جسمانی تناؤ اور بے چینی کا خاتمہ کرنے کے ساتھ کمر درد اور ریڑھ کی ہڈی کے مسائل سے بھی نجات دلانے میں مددگار ثابت ہوتی ہے۔ ماہرین کا مزید کہنا تھا کہ مختلف طبی رپورٹوں سے یہ عندیہ ملتا ہے کہ نماز اور جسمانی طور پر صحت مند طرزِ زندگی کو برقرار رکھنے میں گہرا تعلق موجود ہے۔

تہجد کی نماز اور جدید تحقیق

ایک عربی ویب سائٹ ''الحیط'' کی رپورٹ کے مطابق جرمنی کے حیاتیاتی ماہرین کی ٹیم نے اپنی تحقیق میں ثابت کیا کہ جو لوگ رات کے پچھلے پہر نماز ادا کرتے ہیں، ان میں بڑھاپے کے اثرات جلد ظاہر نہیں ہوتے۔ رات کے آخری حصے میں بیدار ہونے سے انسانی صحت اور دماغ پر اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

''الحیط'' کی رپورٹ کے مطابق جرمنی کے شہر میونخ میں واقع Ludwig University کے سائنسدانوں نے ایک تحقیق میں انسانی جسم کی حیاتیاتی گھڑی کا سراغ لگانے کا دعویٰ کرتے ہوئے کہا کہ یہ حیاتیاتی گھڑی انسان کے دماغ کے اگلے حصے میں غدود کی شکل میں موجود ہے جو جسم میں رُونما ہونے والی تبدیلیوں سے آگاہ کرنے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ یہ غدود کھجور کی گٹھلی کی شکل میں ہوتے ہیں جو روشنی اور اندھیرے میں مرتب ہونے والے اثرات دماغ تک پہنچانے میں معاون ثابت ہوتے ہیں۔

کوئی انسان اگر دیر رات تک جاگتا ہے تو اس کا منفی اثر دماغ کے اس حصے پر براہ راست پڑتا ہے۔ اس کا اثر انسانی صحت پر رونما ہونے لگتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی انسان رات کے پچھلے پہر اُٹھ کر کسی قسم کی ورزش کرے تو اس کے بھی اچھے اثرات مرتب ہوتے ہیں اور صحت ٹھیک رہتی ہے۔ انسان جلد بوڑھا نہیں ہوتا۔ رپورٹ کے مطابق جرمن ماہرین نے ہلکی پھلکی ورزش کو زیادہ مفید قرار دیا ہے۔ رات کے پچھلے پہر کی فضا اور آب وہوا بھی انسانی جسم پر مثبت اثرات مرتب کرتی ہے۔

جرمن ماہرین کا کہنا ہے کہ نماز میں وہ تمام فوائد پائے جاتے ہیں جو کسی بھی صحت بخش ورزش میں موجود ہیں۔ رات کے پچھلے پہر ادا کی جانے والی نماز کے مثبت اثرات براہِ راست ریڑھ کی ہڈی پر مرتب ہوتے جبکہ اعصاب کو تقویت ملتی ہے۔ نتیجے میں چہرے پر جھریاں نمودار نہیں ہوتیں۔

محققین نے 55 ہزار لوگوں پر تحقیق کرتے ہوئے یہ نتیجہ نکالا کہ وہ افراد جو رات کو جلدی سوتے اور آخری پہر میں اُٹھ کر ہلکی پھلکی ورزش کرتے ہیں، وہ دیرسے بوڑھے ہوتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ ان کی بائیولوجیکل گھڑی پر مرتب ہونے والے مثبت اثرات ہیں۔

رپورٹ کے مطابق مصر کے مائیکرو بائیولوجسٹ ڈاکٹر ہانی المنصوری نے اپنی تحقیق پر اپنے مقالے میں بحث کرتے ہوئے لکھا کہ جس طرح انسانی جسم پر غذا اثرات مرتب کرتی ہے، ویسے ہی انسان کے معمولات بھی اس کی صحت پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر ہانی کے مطابق جو لوگ اپنی بائیولوجیکل گھڑی کی حفاظت کرنے کے خواہاں ہیں، انھیں چاہیے کہ وہ تہجد کی ادائیگی اپنا معمول بنالیں۔

نفسیاتی و ذہنی مسائل کا حل

دنیا بھر کے اکثر بڑے ماہرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ نفسیاتی و ذہنی مسائل کے حل کے لیے مہنگے اور منفی نتائج

کے حامل علاج سے کہیں بہتر اور آسان نسخہ صرف اور صرف نماز ہے۔

بہترین اور مکمل ورزش

دنیا کے بڑے بڑے فزیوتھراپسٹ اس امر کا برملا اعتراف کرتے ہیں کہ نماز سے بہتر ہلکی پھلکی اور مسلسل ورزش کا تصوّر نہیں کیا جاسکتا۔ ایک وجہ یہ بھی کہ اصولاً اُس ورزش کا کوئی فائدہ نہیں جس میں تسلسل نہ ہو یا وہ اتنی زیادہ کی جائے کہ جسم بری طرح تھک جائے۔ اللہ ربّ العزت نے اپنی اس عبادت یعنی نماز میں وہ تمام عوامل رکھ دیے ہیں جو ورزش اور فزیوتھراپی کی تمام کسوٹی اور معیارات پر پورا اترتے ہیں۔ مزید نماز کا سب سے بڑا فائدہ یہ کہ انسان پاک صاف اور شفاف طرزِ زندگی اختیار کرتا ہے۔ اس سے وہ کئی بیماریوں سے بچ جاتا ہے۔

وضو اور جدید سائنسی تحقیق

پانچ وقت وضو کرنے سے تمام بدن اندر اور باہر سے دھل جاتا ہے۔ دانت صاف رہتے ہیں۔ یقیناً انسانی جسم کی زیادہ تر بیماریاں دانتوں سے ہی جنم لیتی ہیں۔ اس کے علاوہ نمازی کو جہاں قلب و دل کو سکون میسر ہوتا ہے، وہیں اس میں کچھ اور دوسری خصوصیات بھی پائی جاتی ہیں، مثلاً:

☆ وہ وقت کا پابند ہوتا ہے۔

☆ نظم وضبط کے ساتھ ساتھ اصول پرست اور وفا شعار ہوتا ہے۔

☆ باحیا اور بااخلاق ہونے کے ساتھ ساتھ بااعتماد اور پرکشش شخصیت کا مالک ہوتا ہے۔

الغرض نماز انسان کو صحیح معنوں میں انسان بننے کا سلیقہ سکھاتی ہے۔ اسے مادیت سمیت ہر طرح کی دنیاوی آلائشوں اور غلاظتوں سے پاک کرتی ہے۔ البتہ یہ خصوصیات پیدا کرنے کے لیے روایتی قسم کی نماز کی عادت کافی نہیں۔ اس کے لیے خشوع وخضوع اور دوسرے شرعی لوازمات پورے

حکمت کے موتی

اپنا راز پوشیدہ رکھنا حکمت ہے۔

بچپن کا علم پتھر کی لکیر ہوتا ہے۔

علم اور فن دونوں بہت بڑی دولت ہے۔

اپنی اصلاح دنیا کا مشکل ترین کام ہے۔

دولت کے بھوکے کو کبھی راحت نہیں ہوتی۔

خوب صورت ہونا اہم نہیں ہے، اہم ہونا خوب ہے۔

نعمت کا نامناسب جگہ خرچ کرنا ناشکری ہے۔

باپ ایک کتاب ہے جس پر تجربات تحریر ہوتے ہیں۔

جاہ وشہرت سے بھاگو یہ تمہارے پیچھے پھرے گی۔

دنیا کی مصیبتیں بظاہر زخم ہے مگر درحقیقت ترقیوں کا سبب ہے۔

☆☆☆

کرنا بھی ضروری ہے۔

اگر ہم آج سے ہی اپنے اور اپنے گھر والوں کو نماز کا عادی بنانے کا عہد کرلیں اور پھر اس عہد پر کاربند رہیں تو یقین مانیے کہ ہماری زندگیوں میں نہ صرف انقلابی کیفیات پیدا ہونا شروع ہو جائیں گی، بلکہ ہر قسم کی وقتی منفعت، ہوس، لالچ اقتدار و اختیار کے لیے کبیدہ خاطر اور رنجیدہ ہونے کے بجائے سکون، اطمینان کی زندگیاں ہمارا مقدر بن جائیں گی۔

یقیناً ہماری دنیاوی زندگی باغ و بہار اور کیف وسرور کی کیفیت میں بسر ہونا شروع ہو جائے گی۔ بس یہی ایک وہ مستند کلیہ ہے، جو بحیثیت مسلمان ہمیں ہر طرح کے ڈپریشن اور ذہنی عوارض سے نجات فراہم کرسکتا ہے۔

☆☆☆

اُندلس کا غیرت مند جرنیل

ماضی میں مسلم سپر پاور کے اعلیٰ راہنما کا سبق آموز قصۂ حیات

اُسامہ عبدالقدیر

دنیائے اسلام کے نامور اور قابل وزراء کی فہرست پر نظر دوڑائی جائے تو ہمیں صفِ اوّل میں المنصور محمد بن ابی عامر کا نام بھی نظر آتا ہے۔ یہ اندلس کے اُموی خلیفہ ہشام دوم (366ھ تا 397ھ) کے زمانے میں وزارتِ عظمیٰ کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کا زمانہ اندلس کی اموی خلافت کے عروج کا زمانہ کہلاتا ہے۔

یہ بڑی پرکشش شخصیت کا مالک تھا۔ ارادے کا پکا اور مستقل مزاج۔ رحمدلی اور جود وسخا کا گویا پُتلا تھا۔ ان صفات کے ساتھ قوانین پر عمل کرانے میں بڑا سخت تھا۔ سب سے بڑھ کر غیرت مند مسلمان حکمران تھا۔ اس کے دور میں شمالی اسپین کی عیسائی ریاستوں میں مسلم اقلیتوں پر کوئی آنکھ اٹھانے کی جرأت تک نہ کرسکتا تھا اسی لیے عوام کو اس سے بڑی محبت تھی۔ جب بھی کسی جنگ سے واپس آتا تو قرطبہ کی گلیوں میں ان پر پھول کے پتیوں کی گویا بارش کی جاتی۔ آج ہم اسی ہردلعزیز وزیر کے بے مثال واقعات پر نظر دوڑاتے ہیں۔

گدھے کی سواری

لڑکپن میں ایک مرتبہ منصور اپنے دوستوں کے ساتھ تفریح کے لیے ایک باغ میں گیا۔ جب ساتھیوں نے اسے ایک کونے میں گم سُم بیٹھے ہوئے پایا تو اس کے پاس گئے

اور کھیل میں شامل نہ ہونے کا سبب دریافت کیا۔ منصور نے جواب دیا، ''میں سوچ رہا تھا کہ جب میں وزیراعظم بنوں گا تو شہر کا قاضی کسے بناؤں گا؟''

لڑکے یہ سن کر کھلکھلا کر ہنس دیے اور مختلف عہدوں پر فائز کرنے کی سفارش کرنے لگے۔

ایک بچے نے کہا ''منصور اگر تم وزیر بنا تو میرے منہ پر کالک مل کر، گدھے پر سوار کر کے شہر سے باہر نکال دینا۔''

منصور نے جواب دیا ''تمہارے ساتھ وہی سلوک کیا جائے گا جس کی تم نے خواہش کی۔'' پھر منصور بھی ان کے ساتھ کھیل کود میں مصروف ہو گیا۔ کہتے ہیں جب منصور وزیراعظم بنا تو اس نے اپنا یہ وعدہ پورا کیا تھا۔

احساسِ ذمہ داری

ایک مرتبہ منصور مجلسِ مشیران میں بیٹھا کسی مہم پر بحث کر رہا تھا۔ اس دوران سامعین مجلس نے گوشت جلنے کی بُو محسوس کی۔ آہستہ آہستہ یہ بُو اتنی تیز ہو گئی کہ سامعین پریشان ہو گئے۔ مجلس کے بعد پتا چلا کہ منصور کے پاؤں میں کوئی بیماری تھی جس کے سبب اس کے پاؤں کو داغا جا رہا تھا اور جلنے کی بُو اسی طرف سے آ رہی تھی۔ منصور کمال برداشت اور احساس ذمہ داری کے ساتھ دلجمعی سے اجلاس کی صدارت کر رہا تھا۔

جاسوسی کا بہترین نظام

ایک شب منصور اپنے محل میں بیٹھا ہوا تھا۔ شدید سردی، بارش اور تاریکی کا سماں تھا۔ اس دوران منصور نے سواروں کے دستے کے کسی افسر کو بلایا اور حکم دیا کہ اسی وقت ''طلیارش'' کے راستے پر کھڑے ہو جاؤ۔ جو شخص سب سے پہلے تمہیں اس راستے سے گزرتے ہوئے ملے، اسے میرے پاس لے آؤ۔

حسبِ حکم وہ افسر دستے کے ساتھ وہاں کھڑا ہو گیا۔ فجر کے قریب ایک ضعیف اور معمر شخص گدھے پر سوار آتا ہوا نظر آیا۔ قریب پہنچا تو افسر نے دریافت کیا کس مقصد سے جا رہے ہو؟ بوڑھے نے بڑے اطمینان کے ساتھ لکڑیاں کاٹنے کے آلات دکھاتے ہوئے کہا، لکڑیوں کی غرض سے جا رہا ہوں۔ پہلے تو افسر نے یہ سوچ کر چھوڑ دیا کہ اس کمزور بوڑھے سے منصور کو کیا تعرض ہو گا؟ پھر منصور کے خوف سے اُسے گرفتار کر کے منصور کے سامنے پیش کیا۔

منصور کے حکم سے اس کی جامہ تلاشی لی گئی لیکن بے سود، کچھ بھی برآمد نہ ہوا۔ بعدازاں جب گدھے کے پالان کی تلاشی لی گئی تو ایک خط برآمد ہوا جس میں جلاوطن عیسائیوں نے فوجی خدمت پر مامور ہم مذہبوں کو پیغام بھیجا تھا، ''موقع ملتے ہی منصور کا خاتمہ کر دو۔'' منصور نے فوراً اس بوڑھے اور فوجی خدمت پر مامور عیسائیوں کے سر قلم کروا دیے۔

قانون کا احترام

ایک موقع پر کسی مسئلے میں منصور کے بیٹے پر حد شرعی لگ گئی۔ اس خیال سے کہ میرا باپ وزیراعظم ہے، اس کا بیٹا گھر آ کر بیٹھ گیا۔ منصور کو جب پتا چلا تو وہ بہت برہم ہوا اور فوراً اسے گرفتار کروا کے عدالت میں بھیج دیا۔ یاد رہے کہ اس حد شرعی میں اس کا بیٹا ہلاک ہو گیا تھا۔

ایک مرتبہ قرطبہ کے قاضی نے منصور کے ایک مصاحب سے حلف لیے بغیر فیصلہ کر دیا۔ منصور جب اس معاملے سے مطلع ہوا تو اس نے پیغام بھیجا ''شریعت کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ ہمارے مصاحب سے بھی حلف لو۔''

جب یہ حکم منصور کے مصاحب کو ملا تو اس نے عہدے کے غرور میں حلف لینے سے انکار کر دیا۔ اس پر منصور نے اسے عہدے سے ہٹا دیا۔

دین سے محبت

منصور نے جب مسجد قرطبہ کی توسیع کا بیڑہ اٹھایا تو اردگرد مکانات خریدنا شروع کر دیا۔ سب نے بخوشی مکانات بیچ دیے لیکن ایک عمر رسیدہ خاتون آڑے آ گئی۔ آخر اس شرط پر راضی ہوئی کہ اسے ایک باغ والا مکان مفت دیا جائے۔ منصور نے اسے نہ صرف باغ والا گھر دیا بلکہ اس کے گھر کی

قیمت بھی ادا کر دی۔

بادشاہی اللہ کی!

ایک مرتبہ منصور نے خزانہ شاہی کی جانچ کی تو افسر خزانہ کے ذمے 3000 دینار کا ناجائز خرچ نکل آیا۔ جرم ثابت ہونے پر جب وہ قید خانے لے جایا جانے لگا تو مجرم نے کہا: ''افسوس صد افسوس، میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جو کام ہونے والا ہوتا ہے، اس میں عقل جاتی رہتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ کسی شخص میں کچھ قوت ہے اور نہ طاقت، جو قوت یا طاقت ہے، وہ اللہ ہے۔'' منصور نے یہ سن کر اسے واپس لانے کا حکم دیا اور پوچھا کہ یہ تم نے تمثیلاً کہے ہیں یا اعتقاداً؟ اس نے جواب دیا اعتقاداً۔ منصور نے اس کی بیڑیاں کٹوا دیں۔ یہ دیکھ کر مجرم کہنے لگا:

''کیا تم نے ابنِ ابی عامر کی فروگزاشت نہیں دیکھی؟ بالضرور اس کا احسان سب کی گردن پر ہے۔ ایسا ہی اللہ تعالیٰ جب کسی بندے سے کر گزرتا ہے، تو اسے جنت میں داخل کرتا ہے۔'' یہ سن کر منصور نے اسے رہا کر دیا اور اپنی طرف سے 3000 دینار خزانے میں جمع کروا دیے۔

مسلم حکمران کی شان

ایک مرتبہ منصور کا ایک سفیر عیسائی ریاست بشکنش کے والی غرسیہ کے پاس کسی کام سے گیا۔ اس کی بڑی خاطر مدارت ہوئی اور اسے ریاست کا دورہ بھی کروایا گیا۔ ایک گرجے میں اسے ایک مسلمان عورت قید نظر آئی۔ دورہ پورا کر کے واپسی پر اس نے پہلی ہی فرصت میں منصور کو اس عورت کے متعلق آگاہ کیا۔ یہ سنتے ہی منصور فوج لیے بشکنش پر چڑھ دوڑا۔ غرسیہ دوڑے دوڑے آ کر منصور کی خدمت میں حاضر ہوا اور حملے کا سبب دریافت کرنے لگا۔

منصور نے اسے کہا: ''تم نے وعدہ کیا تھا کہ اپنے ملک میں کسی مسلمان کو قید نہیں کرو گے تو ایک گرجے میں ایک مسلمان عورت کیوں پابندِ سلاسل ہے؟ واللہ میں اس وقت تک تیرے ملک سے نہ جاؤں گا جب تک اس کلیسا کو منہدم کروا کے مسلمان بہن کو آزاد نہیں کروالوں۔

غرسیہ نے بڑی عاجزی کے ساتھ اپنی بے خبری کا عذر پیش کیا اور فوراً گرجا منہدم کروا مسلمان عورت کو منصور کے حوالے کر دیا۔

حیرت انگیز دلیری

شمال کے عیسائیوں سے منصور کی جنگیں ہوتی رہتی تھیں۔ ایک مرتبہ منصور کی ویرقسطان اور بلنو کے مقام پر عیسائیوں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ عیسائیوں کو شکستِ فاش ہوئی۔ وہ کشتیوں پر چڑھے اور ایک چوڑے دریا کے درمیان میں واقع جزیرے پہنچے اور وہاں پناہ لے لی۔ منصور جب دریا کے کنارے پہنچا تو اسے کوئی راہ سجھائی نہیں دی۔ تب وہ گھوڑے سمیت دریا میں اُتر گیا۔ اس کی دیکھا دیکھی ساری فوج دریا میں اُتر گئی۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے دریا پار کر کے جزیرے پر قابض ہو گئے۔ ابو عامر محمد بن عبداللہ ۹۳۸ء میں پیدا ہوا۔ اس کے اجداد یمن سے اندلس آئے تھے۔ آپ نے ۱۱ اگست ۱۰۰۲ء کو وفات پائی۔ آپ ایک عظیم جرنیل اور سیاست داں تھے۔ ●●●

حصولِ علم کا سفر

ڈاکٹر انیس الرحمٰن کے بچپن کی کھٹی میٹھی یادیں

پڑھیے صفحہ نمبر 73

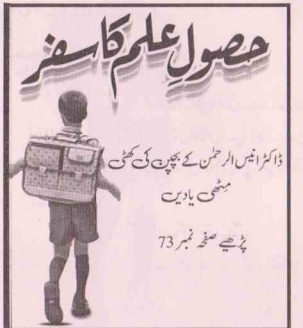

اُردو کہاوتیں

اُردو میں مستعمل کہاوتیں اور ضرب الامثال کا بے بہا خزانہ

دلچسپ حکایات اور کہانیوں کے ذریعے بیان کیا گیا تاریخی پس منظر

﴿تو پہلے بھی بکری تھی، تُو اب بھی بکری ہے﴾

تو پہلے بھی جائز تھی، تو اب بھی جائز ہے۔ تو پہلے بھی یہی تھی تو اب بھی یہی ہے۔ جب کوئی شخص کسی حرام چیز کو علی الاعلان اپنے اُوپر حلال کرلے یا کسی ایسی چیز کو یا معاملہ کو جھٹلائے جس پر اکثریت کا اتفاق ہو۔ اس کہاوت کے تعلق سے ایک حکایت اس طرح بیان کی جاتی ہے:

حکایت:

ایک شخص بہت زیادہ گوشت خور تھا۔ اتفاق سے اسے کئی روز تک گوشت نہیں ملا اور کئی روز تک اس نے ٹھیک سے کھانا نہیں کھایا۔ ایک روز وہ گوشت کی فکر میں غلطاں اپنے چبوترے پر بیٹھا تھا کہ اس کی نظر گھر کی پالتو کتیا پر پڑی۔ دفعتاً اس کے دماغ میں خیال آیا کہ کتیا کے گوشت سے اپنی خواہش کو پورا کیا جاسکتا ہے۔ فوراً اٹھا، گھر کے اندر سے تیز چھری لایا اور کتیا کے پاس آکر کہنے لگا:

''تو پہلے بھی بکری تھی، تُو اب بھی بکری ہے''۔

کتیا جیسی منہ بنائے کیوں پڑی ہے۔ یہ کہہ کر اس نے اس کو تیز چھری سے ذبح کردیا۔

☆☆☆☆☆

ڈاکٹر انیس الرحمٰن

''میں نے آپ کے بیٹے کو چوتھی جماعت کے لیے تیار کر دیا ہے۔ اب آپ ان کو کسی پرائمری اسکول میں داخل کرا کر

حصولِ علم کا سفر

میرے حصولِ علم کی غیر شعوری اور غیر رسمی ابتدا تو پنگھوڑے میں ہی ہوگئی تھی لیکن شعوری اور رسمی طور پر اس کی ابتدا میری بسم اللہ کی رسم کے بعد شروع ہوئی۔ والد صاحب نے حسبِ دستور مجھے کسی پرائمری اسکول میں داخل کروایا۔ ایک ماسٹر صاحب نے مجھے گھر پر آکر پڑھانا شروع کیا۔ وہ، ڈھائی سال مجھے پڑھانے کے بعد انھوں نے والد سے کہا:

توفیق، باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

چوتھی جماعت کا امتحان دلوا کر سرٹیفکیٹ حاصل کر سکتے ہیں تاکہ ان کا کسی ہائی اسکول میں داخلہ ہو سکے۔"

چنانچہ میرے والد نے میرا داخلہ، جو بہا کے جتھہ میں ایک چھوٹے سے مکان میں قائم پرائمری اسکول کی چوتھی جماعت میں کروا دیا۔ یہ اسکول ہمارے گھر کے قریب ہی واقع تھا۔ میرے پرائمری کا امتحان پاس کرنے کے ساتھ ہی میرے والد کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول دہلی سے گورنمنٹ ہائی اسکول جھجھر بطور ہیڈ ماسٹر ہو گیا۔

یہ 1939ء کا واقعہ ہے۔ دوسری جنگ عظیم شروع ہو چکی تھی۔ جھجھر اس وقت ایک چھوٹا سا شہر اور تحصیل کا صدر مقام تھا۔ آج کل اسے ضلع کا درجہ مل چکا۔ یہ دہلی کے شمال مغرب میں کوئی پینسٹھ کلومیٹر کے فاصلہ پر واقع ہے۔

مجھے جھجھر گورنمنٹ ہائی اسکول میں پانچویں جماعت میں داخل کرا دیا گیا۔ دہلی کے چوہیا کے جتھہ کی تنگ گلیوں اور گنجان آبادی میں واقع ایک چھوٹے سے اسکول سے ایک کھلی فضا میں طویل و عریض کھیلنے کے میدان سے ملحق جھجھر کے اسکول کی تر و تازہ ہوا میرے لیے ایک بہت خوشگوار تبدیلی تھی اور پھر اس خیال سے کہ اس اسکول کے ہیڈ ماسٹر میرے والد ہیں، میرا سینہ فخر سے پھول جاتا۔ چھوٹا سا تحصیل ٹاؤن ہونے کی وجہ سے میرے والد کی بہت عزت تھی۔ والد جھجھر کے ہائی اسکول میں تقریباً ساڑھے تین سال تعینات رہے۔ اس عرصہ میں انھوں نے اسکول کی حالت بدل کر رکھ دی۔ بچوں کے دانتوں کی صفائی، ناخنوں کی کٹائی سے لے کر کمرا جماعت اور کھیلنے کے میدان کی صفائی کے باعث اسکول نکھرا نکھرا لگنے لگا۔

انھوں نے اسکول کے طلبا کو عمودی طور پر چار گروہوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر گروہ کی پہچان کے لیے انھیں مغل شہنشاہوں کے نام تفویض کر دیے مثلاً اورنگزیب، جہانگیر، اکبر اور بابر۔ ان گروہوں کے درمیان تقریری اور کھیلوں کے مقابلے منعقد کرا کر، جیتنے والے گروپ اور طلبا کو ٹرافی، تمغے اور سرٹیفکیٹ دیے جاتے۔ مجھے بھی میرے والد نے ایک تقریری مقابلے میں شرکت کرنے کے لیے کہا اور تقریر لکھنے میں، میری مدد کی۔ میں اس وقت چھٹی جماعت میں تھا۔ قد اور عمر میں سب سے چھوٹا تھا۔ جج صاحبان نے اس تقریری مقابلہ میں مجھے دوسرا انعام دینے کی سفارش کی۔

جھجھر ہائی اسکول، میری زندگی کا پہلا اسکول تھا۔ اس کے ساتھ میرے حافظے میں چار یادیں ابھی تک محفوظ ہیں۔ ایک جھجھر کا نیا اور کشادہ مکان، جس کے نزدیک سبزیوں کے لہلہاتے کھیت تھے۔ ان کھیتوں سے کچے کھیرے اور ککڑیاں توڑ کر کھانے میں بہت لطف آتا۔ دوسرے جھجھر کا ہائی اسکول اور اس کا وسیع اور عریض کھیلنے کا میدان، تیسرے تقریری مقابلہ میں میری تقریر۔ اتنے بڑے مجمع کے سامنے یہ میری زندگی کی پہلی تقریر تھی۔ تقریر کرنے کے لیے روسٹرم تک جانے اور تقریر شروع کرتے وقت میں بہت گھبرایا ہوا تھا۔ اگر جج صاحبان کو میری اندرونی کیفیت کا اندازہ ہو جاتا تو شاید وہ میری تقریر کو، دوسرے نمبر پر قرار نہ دیتے!

چوتھی یاد اس وقت کی ہے جب میں ساتویں جماعت میں تھا۔ ایک دن ہماری جماعت کے اُستاد، لڑکوں کا گھر کے لیے دیا ہوا کام یعنی ہوم ورک چیک کرتے ہوئے میرے پاس آئے۔ میں نے کہا کہ گھر کے لیے دیا ہوا کام تو میں نے کر لیا تھا، لیکن کاپی گھر بھول آیا۔ ماسٹر صاحب نے کہا تم جھوٹ بولتے ہو۔ تم نے ہوم ورک نہیں کیا اور کاپی گھر پر بھول آنے کا بہانہ کر رہے ہو۔ اس دن میں روتا ہوا گھر واپس آیا اور والدہ سے کہا کہ ماسٹر صاحب نے مجھ پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا ہے۔ اس کے بعد مجھے بخار چڑھ گیا اور میں دو، تین روز بخار میں مبتلا رہا۔

والدہ نے میرے والد کے چہرے سے، جو روز ہمارے گھر گوشت ترکاری دینے آیا کرتا تھا، کہا کہ انیس کی کلاس

کے ماسٹر کی طبیعت اچھی طرح صاف کرو۔ اس نے میرے بیٹے پر جھوٹ بولنے کا الزام لگایا اور میرا بیٹا بیمار پڑ گیا ہے!

پانچویں بات جو منجھر کے اسکول کے حوالے سے مجھے یاد رہ گئی، وہ عربی کے استاد مولوی حمایت علی شاہ کی شخصیت ہے۔ شاہ صاحب ناک میں بولتے۔ لہجے میں گنگناہٹ تھی۔ اپنی علمیت کا اظہار کرنے اور مرید بنانے کا شوق تھا۔ عربی زبان میں شعر گوئی کا شوق بھی تھا۔ میں نے ان سے عربی پڑھی۔ اب سوچتا ہوں کہ نہ پڑھتا تو ہی اچھا تھا۔ عربی کی جگہ فارسی لے لیتا تو شاید فارسی زبان میں کچھ شدبد آ جاتی۔ شاہ صاحب سے عربی پڑھنے کا یہ اثر ہوا کہ شاہ صاحب یاد رہ گئے اور عربی کی گردانیں بھول گئیں۔

جھجھر کے بعد میرے والد کا تبادلہ بہادر گڑھ کے گورنمنٹ ہائی اسکول میں کر دیا گیا۔ بہادر گڑھ، جھجھر کا ایک قصبہ تھا۔ اسکول چھوٹا تھا اور اس میں کھیلنے کا میدان بھی نہیں تھا۔ آج کل بہادر گڑھ کو تحصیل کا درجہ حاصل ہو چکا۔ یہ دہلی سے دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع اور بذریعہ ریلوے لائن اور دہلی میرٹھ سسٹم کے ذریعے جڑا ہوا ہے۔

یہ انڈسٹریل اور معلوماتی ہب (Hub) کے طور پر مشہور ہے۔ یہاں ایک یونیورسٹی، کئی انجینئرنگ کالجز اور متعدد اسکول ہیں۔ دہلی کا مضافاتی (Sub-urb) شہر ہونے کی وجہ سے اس کی آبادی کافی بڑھ گئی ہے۔

میرے والد بہادر گڑھ کے ہائی اسکول میں سات آٹھ ماہ ہی رہے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول رہتک کر دیا گیا، جو ضلع کا صدر مقام تھا۔ بہادر گڑھ کی مجھے تین باتیں یاد ہیں۔ ایک تو یہ کہ بہادر گڑھ ہائی اسکول کے انگریزی کے استاد بہت خوش اخلاق تھے اور انگریزی بہت محبت سے پڑھاتے۔ دوسرے بہادر گڑھ کی حویلی جو میرے والد نے وہاں کرائے پر لی تھی اس میں لمبائی کے رخ پر چار پانچ کمرے، سامنے ایک پتلا سا چبوترہ اور ایک کچا صحن تھا جو چوڑائی اور لمبائی زیادہ تھا۔ صحن میں چار پانچ درخت لگے ہوئے تھے۔ چبوترے کے آخر میں بیت الخلا، باورچی خانہ اور ایک زینہ تھا۔ اس کے آخر میں دوسری منزل پر ایک کمرا تھا۔ اس گھر میں منتقل ہونے کے بعد ایک ہمسائی والدہ سے ملنے آئیں اور انھوں نے بتایا کہ دوسری منزل پر بنے ہوئے کمرے کی صفائی کا خاص خیال رکھیے گا۔ اس میں سید صاحب رہتے ہیں۔ بہت نیک اور صفائی پسند ہیں۔ کسی کو پریشان نہیں کرتے۔ خیال رکھیے گا کہ بچے اس کمرے میں گندگی نہ پھیلائیں۔ ہر جمعرات کو اگر بتیاں جلا دیا کریں تو بہت اچھا ہے۔

والدہ نے والد سے گھر بدلنے پر اصرار کیا اور کہا کہ میرا چھوٹے بچوں کا ساتھ ہے۔ میں اس آسیب زدہ گھر میں نہیں رہ سکتی۔ بہادر گڑھ اس وقت ایک گاؤں تھا۔ وہاں مکانوں کی کمی تھی۔ والد کو چھوٹا سا ایک منزلہ گھر مل گیا اور ہم اس میں منتقل ہو گئے۔ اتنے چھوٹے سے گھر میں ہم کبھی نہیں رہتے تھے۔ اللہ کا شکر ہے کہ بہادر گڑھ میں میرے والد صرف سات آٹھ ماہ ہی تعینات رہے۔ اس کے بعد ان کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی اسکول رہتک ہو گیا۔

تیسرے، بہادر گڑھ میں مجھے منشی یوسف کی شخصیت یاد ہے۔ وہ بہادر گڑھ کے ایک پرائمری اسکول کے صدر مدرس تھے۔ بے حد مرنج جامرنج، متقی، تہجد گزار اور صوفی صفت شخصیت کے حامل تھے۔ کبھی کبھار میرے والد سے ملنے ہمارے گھر آ جایا کرتے۔ والد ان کی بہت عزت و خاطر مدارت کیا کرتے۔ ان سے میرے والد کا تعلق پاکستان بننے کے بعد بھی قائم رہا۔

وہ بھی لاہور منتقل ہو گئے تھے۔ میرے والد کی منشی یوسف سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب میں امریکا پڑھنے کے لیے جانے لگا تو منشی یوسف کو میرے لیے دعا مانگنے کے لیے مدعو کیا اور انھوں نے کرشن نگر لاہور میں ہماری بیٹھک میں

میرے لیے دعا فرمائی اور میرے گرد حلقہ کھینچ کر والد سے کہا:

''اب آپ اسے بے فکر ہو کر دنیا میں جہاں چاہیں بھیج دیں، انشاءاللہ اس کا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔''

میرے والد کو خالیہ کی یہ فکر تھی کہ بیٹا امریکا میں کسی امریکن لڑکی کے چکر میں نہ پڑ جائے!

رینک کا گورنمنٹ ہائی اسکول کافی بڑا تھا۔ کھیل کے میدان بھی خاصے کشادہ تھے۔ ضلع کا صدر مقام ہونے کی وجہ سے رینک خاصا گنجان آباد شہر تھا۔ اس لیے کوئی کشادہ مکان نہ مل سکا۔ والد نے اس کے نزدیک دوسری منزل پر ایک فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا۔ اب رینک خاصا بڑا شہر ہو چکا۔ اس کی اپنی یونیورسٹی اور انڈسٹریل ٹاؤن تھیں ہیں۔

ایک واقعہ مجھے ابھی تک یاد ہے۔ رینک کا ایک سیاسی چودھری میرے والد کے پاس ایک فیل شدہ لڑکے کو پاس کروانے کے لیے لایا۔ والد کے انکار کرنے پر وہ رعونت کے ساتھ اپنے مطالبے پر مصر ہوا۔ والد نے اسے اپنے دفتر سے نکلوا دیا۔ اپنی بے عزتی کا بدلا لینے کے لیے چودھری صاحب انبالہ میں ڈویژنل انسپکٹر آف اسکولز کے پاس میرے والد کی شکایت کرنے پہنچے، لیکن وہاں ان کی دال نہیں گلی۔ واپس آ کر انھوں نے میرے والد کے خلاف مہم چلائی۔ مجھے اس کا پتا ایک دن اس وقت چلا جب میں اسکول پہنچا۔ میں نے دیکھا اسکول کی دیواروں اور گلیوں میں بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے جن پر جلی حروف میں یہ شعر لکھا ہوا تھا:

ننگ آ کر تو افسر سے شکایت کی تھی
وہ بھی اس کمبخت کا جانے والا نکلا

رینک میں تقریباً دو سال ہیڈ ماسٹر رہنے کے بعد میرے والد کا تبادلہ کرنال بطور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز کر دیا گیا اور مجھے گورنمنٹ ہائی اسکول کرنال میں داخل کروا دیا گیا۔ یہ میرا چوتھا ہائی اسکول تھا۔ پچھلے تین اسکولوں کے ہیڈ ماسٹر تو میرے والد تھے۔ یہ 1944ء کا سال تھا۔ گورنمنٹ ہائی اسکول کرنال کی دو شخصیات مجھ پر بہت اثر انداز ہوئیں۔ ایک تو فزکس کے استاد اور دوسرے اسکول کے ہندو ہیڈ ماسٹر جنھوں نے فلسفہ میں ایم اے کیا ہوا تھا۔ میں اس وقت دسویں جماعت کا طالب علم تھا۔ فزکس کے ماسٹر صاحب سے میرے والد نے پوچھا: ''کیا میرے بیٹے کی میٹرک میں فرسٹ ڈویژن آجائے گی؟''

انھوں نے جواب دیا: ''انشاءاللہ آجائے گی۔''

جب میٹرک کا نتیجہ آیا تو پوری کلاس میں صرف دو طلبہ کی فرسٹ ڈویژن تھیں۔ ایک ہندو لڑکے کی اور دوسری میری۔

ہندو ہیڈ ماسٹر جو دسویں جماعت کو انگریزی پڑھاتے تھے، بڑی فلسفیانہ باتیں کرتے تھے۔ ایک دن انھوں نے ہمیں بڑے رازدارانہ انداز میں بتایا کہ اب جو میں تم لوگوں کو بات بتانے لگا ہوں وہ تمھیں کسی کتاب میں نہیں ملے گی۔ یہ میری اپنی اختراع ہے۔ یہ جو لوگ کہتے ہیں کہ خدا نے ہر شخص کی عمر سالوں کے پیمانے پر مقرر کی ہے کہ فلاں شخص 50 سال جیے گا و رفلاں شخص 65 سال، یہ درست نہیں۔ دراصل اللہ نے ہر شخص کی عمر سالوں کے بجائے سانسوں کی تعداد میں مقرر کی ہے کہ یہ شخص دنیا میں اتنے بلین سانس لے گا اور یہ شخص اتنے بلین ٹریلین سانس لے گا۔ اب یہ تم پر منحصر ہے کہ جلدی جلدی سانس لے کر ان کی طے کردہ تعداد ختم کرتے ہو یا آہستہ آہستہ لمبے لمبے سانس لے کر اپنی صحت دراز اور بہتر کرتے ہو!

اس ہندو ہیڈ ماسٹر کی بات میرے دل کو اتنی لگی کہ میں اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہوں۔ اس کا طریقہ میں نے یہ اختیار کیا کہ ''سبحان اللہ وبحمدہ، سبحان اللہ العظیم'' کا ورد، دو لمبے سانسوں میں کرتا ہوں۔ ہر سانس کو میں دو حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ پہلے سانس کے پہلے حصے میں، میں دل میں ''سبحان اللہ'' کا ورد کرتا ہوں پھر تھوڑی دیر توقف کے بعد ''وبحمدہ'' کا ورد کرتے ہوئے، دوسرے حصے میں آہستہ آہستہ

ہوا خارج کرتا ہوں۔ اسی طرح دوسرے سانس کے پہلے حصے میں ''سبحان اللہ'' کا ورد کر کے، دوسرے حصے میں ''الاعظیم'' کا ورد کرتے ہوئے ہوا خارج کرتا ہوں۔

یہ دو لمبے لمبے سانس لیتے ہوئے میں اپنے آپ کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہوں۔ پہلے حصے کا تعلق ماضی سے، دوسرے کا زمانہ حال سے اور تیسرے کا مستقبل سے ہوتا ہے۔

پہلے حصے میں اللہ کا شکر ان باتوں کے لیے جو میرے دائرہ اختیار سے باہر تھیں۔ مثلاً اللہ سبحان و تعالیٰ نے مجھے دیندار اور تعلیم یافتہ خاندان میں پیدا کیا۔ اگر مجھے کسی شودر یا بیچ خاندان میں پیدا کر دیا جاتا تو یہ میرے دائرہ اختیار سے باہر تھا اور پھر مجھے نیک، صحتمند اور صالح اولاد سے نوازا گیا۔

دوسرے حصے میں، میں ان چیزوں کا تصور کرتا ہوں جن کے لیے میں نے تگ و دو کی اور اللہ سبحان و تعالیٰ نے مجھے کامیابی سے نوازا۔ تیسرے حصے میں، مستقبل کے ان خوابوں اور تمناؤں کا تصور کرتا ہوں جن کے شرمندۂ تعمیر ہونے کا میں خواہشمند ہوں۔ یہ آہستہ آہستہ لمبے لمبے سانس شکر اور آرزوؤں کے سیاق و سباق میں لینے سے مجھے بے حد سکون ملتا ہے اور شاید یہ اس ہندو ہیڈ ماسٹر کی تھیوری کے مطابق یہ درازی عمر کا باعث بھی بنتے ہوں۔

1945ء میں میٹرک کر لینے کے بعد میرے والد نے مجھے دہلی پولی ٹیکنیک (Dehli Polytechnic) میں پری انجینئرنگ (Pre-Engineering) کی جماعت میں داخل کروا دیا۔ یہ پولی ٹیکنیک، کشمیری گیٹ دہلی میں نیا بنا تھا۔ اس کورس میں (F.Ss. Non-Med) کے ساتھ انجینئرنگ کے ابتدائی مضمون بھی شامل تھے۔ اسے پاس کرنے کے بعد یا تو پولی ٹیکنیک کا ڈپلوما حاصل کیا جا سکتا تھا یا پھر کسی انجینئرنگ کالج میں داخلہ لیا جا سکتا تھا۔ میرے والد کیونکہ کرنال میں تعینات تھے، اس لیے مجھے دہلی میں رہنے کے لیے اپنی نانی کے پاس بھیج دیا گیا۔ میں دوبارہ دریا گنج میں اسی حویلی میں رہنے لگا جہاں بھی میں نے اس دنیا میں پہلی بار آنکھ کھولی تھی۔

دریا گنج، کشمیری گیٹ سے خاصے فاصلے پر تھا۔ میرا مسئلہ روز دریا گنج سے کشمیری گیٹ جانے کا تھا۔ والد نے ایک پرانی سائیکل کے حصول کے لیے اپنے شکار کھیلنے کے ایک دوست عسکری صاحب سے رابطہ کیا۔ عسکری صاحب دہلی کے ڈپٹی کمشنر کے توشہ خانہ کے انچارج تھے اور اس میں مال مسروقہ کے سیاہ سفید کے مالک تھے۔ توشہ خانہ میں پرانی سائیکلوں کا انبار لگا ہوا تھا۔ عسکری صاحب نے کہا:

''جو بھی سائیکل پسند ہو منتخب کر لو۔'' میں اس کی مناسب قیمت لگا کر، ڈپٹی کمشنر صاحب سے اس کی ملکیت تمہارے نام تبدیل کرانے کی منظوری لے لوں گا۔ میرے چھوٹے ماموں نے ایک پرانی جرمنی کی بنی ہوئی سائیکل مرمت کرنے والے سے اس کے زنگ آلودہ پرزے تبدیل کرا کر اسے غسل صحت دلوا کر چلنے کے قابل کروا دیا اور یوں میرا دریا گنج سے کشمیری گیٹ کی آمد و رفت کا مسئلہ حل ہوا۔

1947ء میں جب میں نے دہلی پولی ٹیکنیک کا پری انجینئرنگ کورس مکمل کیا تو دو بادل چکی تھی۔ ہندوستان کا بٹوارہ ہو چکا تھا اور پاکستان وجود میں آ گیا تھا۔ میرے والد نے چونکہ پاکستان کو منتخب کیا تھا، اس لیے ان کی تعیناتی بطور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز، گوجرانوالہ کر دی گئی اور انھیں گوجرانوالہ کی سول لائنز میں واقع دیوان لاج رہائش کے لیے الاٹ ہو گئی جو اکیس کنال زمین کے پلاٹ پر بنی ہوئی تھی۔ کوٹھی کا باغ، مالٹوں، امرود، فالسہ اور دیگر قسم کے پھلوں سے لدا ہوا تھا۔ یہ کوٹھی ہماری ضرورت سے زیادہ بڑی تھی اس لیے اسے بعد میں دو حصوں میں تقسیم کر کے، ایک حصہ ایک مجسٹریٹ صاحب کو الاٹ کر دیا گیا۔

یہاں تک تو سب اچھا تھا لیکن میری تعلیم کے سلسلے میں

دو مشکلات تھیں۔ ایک تو یہ کہ اگرچہ میں نے دہلی پولی ٹکنیک کا دو سالہ پری انجینئرنگ کورس مکمل کرلیا تھا لیکن ہندوستان کے بٹوارے کی وجہ سے اس کا امتحان پاس نہ کرسکا۔ دوسرے گوجرانوالہ کے بعد پرائیویٹ کالج بند ہوگیا تھا۔ پہلی مشکل کا حل تو یہ نکلا کہ میں نے پرائیویٹ ایف ایس سی کا امتحان دے دیا۔

کالج کا مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ ایک متروک شدہ کالج کی عمارت میں اسلامیہ کالج قائم ہوگیا لیکن وہاں سائنسی تجربہ گاہیں نہ ہونے کے باعث سائنسی مضامین کا آغاز نہ ہو سکا۔ اس لیے مجھے بی اے میں ڈبل میتھیمیٹکس کے مضامین لینے پڑے۔ نئے کالج کے لیے پروفیسروں کا ملنا بھی کار دارد تھا۔ حساب پڑھانے کے لیے جن صاحب کا بطور پروفیسر تقرر کیا گیا تھا، اگرچہ انھوں نے حساب میں ایم اے کیا ہوا تھا لیکن وہ ساری عمر ہائی اسکول میں حساب پڑھاتے رہتے تھے، اس لیے بی اے کے حساب کے مضامین ان کے لیے قصۂ پارینہ بن چکے تھے۔ کالج کے ہاسٹل میں انھوں نے اپنی رہائش اختیار کرلی تھی۔ رات کو کورس کی کتاب پڑھ کر صبح کالج میں آکر لیکچر دیتے دیا کرتے۔ جس رات ہاسٹل میں بجلی غائب ہوتی تو دوسرے دن لیکچر نہیں ہوتا تھا۔

گوجرانوالہ میں لڑکیوں کا کالج بھی نہیں تھا۔ اس لیے میری بڑی بہن کے لیے میٹرک کے بعد آگے تعلیم حاصل کرنا ممکن نہ تھا۔ یہ مسئلہ اس طرح حل ہوا کہ میں نے اپنی بہن کو ایف اے کے نصاب کی چار کتابیں گھر پڑھا کر پرائیویٹ طور پر ایف اے پاس کروادیا۔

میرا حصول تعلیم کا بندوبست بھی بے حد غیر تسلی بخش تھا لہٰذا میرے والد نے دو کام کیے۔ ایک تو فوری طور پر میرا داخلہ گورنمنٹ کالج لاہور میں کروا کر میری رہائش کا انتظام لاہور میں اپنی منہ بولی بہن محمودہ بیگم کے پاس کردیا، جو اپنی عرفیت لیڈی سر ذوالفقار علی خان کے نام سے جانی جاتی تھیں۔ دوسرا کام میرے والد نے یہ کیا کہ کوشش کر کے اپنا تبادلہ لاہور بطور ڈسٹرکٹ انسپکٹر آف اسکولز، لاہور کروالیا اور کرشن نگر لاہور میں سکونت اختیار کرلی۔

میں پھوپھو محمودہ بیگم کے پاس سے اپنے گھر میں منتقل ہو گیا۔ بھائیوں کا داخلہ سنٹرل ماڈل اسکول لاہور میں کروادیا۔ اس زمانہ میں سنٹرل ماڈل اسکول میں داخلہ بہت مشکل تھا لیکن وہاں میرے والد کے دوست ہادی صاحب ہیڈ ماسٹر تعینات تھے۔ انھوں نے کہا اگر اس اسکول میں تمہارے بچے داخل نہ ہوئے تو کس کے ہوں گے؟ بہنوں کے داخلے والد نے لیڈی میکلیگن کالج اور اسکول میں کروادیے۔

والد کی دیرینہ خواہش تھی کہ میرا داخلہ میکلیگن انجینئرنگ کالج میں ہوجائے لیکن وقت یہ تھی کہ ہندوستان کے بٹوارے کے بعد میں نے ایف ایس سی کا امتحان سپلیمنٹری میں دیا تھا۔ جب تک نتیجہ آیا، انجینئرنگ کالج کے داخلے کی آخری تاریخ نکل چکی تھی۔ یہ تاریخ بند بھی نکلی ہوتی تو غالباً میرے نمبر بھی اتنے نہیں تھے کہ میکلیگن انجینئرنگ کالج میں داخلہ ہوجاتا۔

نیبی امداد اس طرح ہوئی کہ میرے والد کے محکمہ تعلیم میں ایک دوست کے بیٹے نے، جو انجینئرنگ کالج میں لیکچرار لگ چکے تھے، والد کو بتایا کہ گورنمنٹ نے ہندوستان سے آنے والے طلبا کے لیے پانچ اضافی نشستیں منظور کی ہیں۔ ان نشستوں میں داخلہ مقابلہ کے امتحان کے نتیجہ کی بنیاد پر ہوگا۔ میرے والد نے مجھے اس امتحان میں بیٹھنے کی ترغیب دی اور ان کے دوست کے بیٹے نے میری مدد کی۔

اللہ کی کرم نوازی سے میرا داخلہ میکلیگن انجینئرنگ کالج میں ہوگیا۔ اب داخلہ تو ہوگیا تھا لیکن کتابیں خریدنے اور فیس ادا کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔ میرے والد کثیر الاولاد تھے۔ ان کے دس بچے تعلیم کی مختلف منازل میں تھے۔ یہ مشکل میرے والد کے ایک اور دوست نے حل کردی جو ڈائریکٹر محکمہ تعلیم کے دفتر میں وظائف کے انچارج تھے۔

انھوں نے سال بہ سال کے لیے میرا وظیفہ میری کالج کے امتحانوں میں کارکردگی کی بنیاد پر جاری کروادیا۔ اللہ کے فضل سے میری ہر سال یونیورسٹی کے امتحان میں فرسٹ ڈویژن آتی رہی اور یہ وظیفہ چلتا رہا۔

انجینئرنگ پاس کرلینے کے بعد پی ڈبلیو ڈی کے محکمہ میں تقرری کے فوراً بعد میرا تبادلہ ٹاؤن پلاننگ کے محکمہ میں کردیا گیا، کیونکہ وہاں ٹاؤن پلانر (منصوبہ ساز) کی کمی تھی اور وہ کوشش کر کے واپس پی ڈبلیو ڈی کے محکمہ میں واپس آتے رہتے تھے۔ میرے سامنے بھی دو راستے تھے۔ ایک تو پی ڈبلیو ڈی میں واپس جانے کا اور دوسرا پاکستان سے باہر جا کر ٹاؤن پلاننگ میں ڈگری حاصل کرنے کا، کیونکہ اس زمانہ میں پاکستان میں ٹاؤن پلاننگ کا مضمون کسی پاکستانی یونیورسٹی میں نہیں پڑھایا جاتا تھا۔ میں نے دوسرا راستہ اختیار کیا۔

اس زمانہ میں کولمبو پلان کے تحت ٹروپیکل آرکیٹیکچر (Tropical Architecture) کی ایک فیلوشپ، ٹاؤن پلاننگ کے محکمہ میں موصول ہوئی۔ مظہر منیر جو میرے افسر تھے، انھوں نے مجھے بلا کر پوچھا:

''اس کورس پر انگلستان جانا چاہو گے؟'' اندھا کیا چاہے؟ دو آنکھیں۔ میں نے فوراً اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا۔ لہٰذا میرا نام محکمانہ طور پر اس فیلوشپ کے لیے تجویز کردیا گیا۔ مظہر منیر صاحب کو یہ آمید نہیں تھی کہ اس کورس میں میرا داخلہ ممکن ہو سکے گا، کیونکہ چند سال پہلے انھوں نے بھی اس کورس میں داخلے کے لیے درخواست بھجوائی تھی، جو منظور نہیں ہو سکی تھی۔

اللہ کا کرم ہوا کہ مجھے اس کورس میں داخلہ مل گیا اور اس کا خرچ کولمبو پلان کے تحت منظور کرلیا گیا۔ میری انگلستان جانے کی تیاری سب سے زیادہ میری والدہ نے کی۔ اس زمانے میں سفر پر جانے کے لیے اپنے ساتھ بستر باندھ کر لے جانے کا دستور تھا۔ والدہ نے سوچا کہ انگلستان میں میرے بیٹے کو سردی لگے گی، اس لیے انھوں نے بڑے اہتمام سے میرے لیے بہت ساری روئی والا لحاف سلوایا۔ اس میں بڑی محنت سے نزدیک نزدیک گنڈیاں ڈالے گئے۔ میرے انگلستان جانے والے سوٹ کیس کا زیادہ حصہ اس لحاف نے لیا۔

مزے کی بات یہ کہ جب میں کورس کی تکمیل کے بعد پاکستان لوٹنے لگا تو پیچھے رہ جانے والے پاکستانی طالبعلموں نے مجھ سے اس لحاف کو ان کے لیے چھوڑ جانے کی التجائیں کیں۔

اس کورس میں شرکت کرنے کے لیے جب میں پہلے روز اے اے اسکول آف آرکیٹیکچر (A A School of Arhitecture) میں گیا تو اس کورس کے جرمن نژاد یہودی ڈائریکٹر ڈاکٹر کوئین اگزبرگر (Dr. Koenigsberger) نے مجھے اپنے دفتر میں بلا کر پوچھا کہ تم نے آرکیٹیکچر کی تعلیم کہاں سے حاصل کی ہے؟

میں نے جواب دیا کہ میں آرکیٹیکٹ نہیں، سول انجینئر ہوں۔ اس پر وہ بے حد ناراض ہوا اور پوچھا کہ تمہیں اس کورس میں داخلہ کیسے ملا؟ میں نے آج تک کسی سول انجینئر کو اس کورس میں داخلہ نہیں دیا۔ یہ آرکیٹیکچر کا پوسٹ گریجوایٹ کورس ہے۔ ساری ٹروپیکل دنیا (Tropical World) سے سینئر آرکیٹیکٹس اس کورس پر آئے ہیں اور تم سرے سے آرکیٹیکٹ ہی نہیں ہو۔ میں نے جواب دیا کہ مجھے نہیں معلوم کہ مجھے اس کورس میں داخلہ کیسے ملا؟ مجھے صرف اتنا پتا ہے کہ میں نے اس میں داخلے کے لیے درخواست بھیجی اور مجھے داخلہ مل گیا۔ ڈاکٹر کوئین اگزبرگر نے کہا اب چونکہ تم لندن پہنچ چکے، اس لیے میں تمہیں واپس پاکستان نہیں بھیجنا چاہتا، لیکن براہِ مہربانی تم اپنے ہم جماعتوں کو یہ نہ بتانا کہ تم آرکیٹیکٹ نہیں۔

مجھے اس کورس میں بہت محنت کرنی پڑی۔ یہ جو انگریزی کی کہاوت ہے کہ کامیابی کی طرح کوئی نہیں جیت سکتا

(Nothing Succeeds Like Success) یہ بالکل بے معنی کہاوت ہے۔ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ دراصل ہونا یہ چاہیے کہ محنت کی طرح کوئی کامیاب نہیں ہو سکتا (Nothing Succeeds Like Hardwork)۔

اس کورس کے آخر میں ڈاکٹر کوئین اگز برگر نے مجھے کورس کے پہلے انعام سے نوازا۔

جب میں انگلستان سے اس کورس کی تکمیل کے بعد پاکستان واپس آرہا تھا تو مجھے اپنے والد کا خط ملا کہ لاہور پہنچنے والی پرواز اور وقت سے مطلع کرو، تاکہ ہم سب تمھیں ہوائی اڈے پر لینے آئیں۔ میں نے جواب دیا کہ گھر کے دروازے پر لگی گھنٹی، جس دن تین بار بجے تو سمجھ لیجیے گا کہ میں دروازے کے باہر کھڑا ہوں۔ اور یہی ہوا۔ انگلستان سے واپسی پر ہوا سازگار تھی اور پاکستان کی طرف چل رہی تھی۔ اس لیے پانی کا جہاز اپنے طے شدہ دن سے ایک دن پہلے ہی کراچی پہنچ گیا اور لاہور کے لیے بھی مجھے ایک دن پہلے روانہ ہونے والے ہوائی جہاز میں جگہ مل گئی اور میں نے گھر کے دروازے پر تین گھنٹیاں بجادیں۔

میرا انگلستان میں لیور پول (Liverpool) کی بندرگاہ سے کراچی کا سفر تقریباً اٹھارہ روز کا تھا۔ مجھے حصولِ علم کے سفر میں نئے دروازے اور نئے راستے کھلنے کی مخفی اور ظاہر بشارتیں بالواسطہ اور بلاواسطہ طور پر اللہ سبحان وتعالیٰ کی طرف سے گاہے گاہے ہوتی رہیں۔ انگلستان سے واپسی کے سفر میں جہاز کے عرشے پر مجھے ایک صاحب ملے۔ انھوں نے میرا ہاتھ دیکھ کر بتایا کہ تم کوئی ڈیڑھ سال بعد دوبارہ پڑھنے کے لیے بیرونی سفر کروگے۔ بہرحال یہ بات آئی گئی ہوگئی۔

پاکستان واپسی پر میرا مسئلہ برقرار تھا۔ اگرچہ میں نے ٹروپیکل آرکیٹیکچر کا کورس پاس کر لیا تھا لیکن ٹاؤن پلاننگ کے محکمے میں ابھی بھی میں ترقی کے لیے نااہل تھا کیونکہ میرے پاس ٹاؤن پلاننگ کی کوئی ڈگری نہیں تھی۔ اس لیے میں نے امریکا کی مختلف یونیورسٹیوں میں داخلے کے لیے درخواستیں بھیجنا شروع کردیں۔ اگرچہ میرے پاس امریکا جاکر پڑھنے کے لیے مالی وسائل بھی نہ تھے!

حصولِ علم کے سفر کے اپنے خوابوں کو بے سروسامانی کے عالم میں عملی جامہ پہنانے کی ضمن میں مجھے غالب کے مندرجہ ذیل شعر نے بہت حوصلہ دیا۔

توفیق، با اندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

(جاری ہے)

ڈاکٹر انیس الرحمٰن......ایک نظر میں

مصنف ڈاکٹر انیس الرحمٰن انجینئر، معمار اور شہری و علاقائی منصوبہ ساز کے طور پر ایک معروف و مشہور شخصیت ہیں۔ انھوں نے امریکا، برطانیہ، نیدرلینڈ، سعودی عرب اور پاکستان کے تعلیمی اداروں سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی، نیز تحقیقی کام کرنے کے ساتھ اُستاد کے پیشے سے بھی وابستہ رہے۔

کنگ عبدالعزیز یونیورسٹی جدہ نے انھیں بہترین پروفیسر کے ایوارڈ سے بھی نوازا۔ 1960ء کی دہائی میں انھوں نے گریٹر لاہور کے لیے پہلا ماسٹر پلان تیار کیا جو نہ صرف لائبریری آف کانگریس بلکہ امریکا کی بڑی یونیورسٹیوں میں بھی پیش کیا گیا۔ ڈاکٹر انیس الرحمٰن نے متعدد سال پاکستان میں پنجاب اور شمال مغربی صوبوں کے ٹاؤن پلاننگ کے ڈائریکٹر کی حیثیت سے کام کیا اور سعودی عرب میں اقوامِ متحدہ کے مشیر برائے شہری اور علاقائی منصوبہ بندی کے طور پر بھی وابستہ رہے، نیز متحدہ عرب امارات اور پاکستان میں اقوامِ متحدہ کے مشیر کی حیثیت سے دس سال کام کیا۔ مدینہ کے ماسٹر پلان کی تیاری میں حصہ لینے کے علاوہ وہ سعودی عرب کے مختلف شہروں اور علاقوں کے ماسٹر پلانز کی تیاری میں بطور نگران بھی مامور رہے۔

1999ء میں ان کا نام WHO'S Who In The World میں شائع ہوا۔ فی الوقت وہ معاشرتی بنیادوں پر تعلیمی اور پیشہ ورانہ تربیتی پروگراموں کے ذریعے معاشرتی ترقی اور غربت کے خاتمے کے لیے کوشاں ہیں۔

زادِ راہ

ایک باہمت لڑکی کی داستان، پہاڑ جیسے مسائل جس کے ارادوں کو شکست نہ دے سکے

''نہیں! مجھے آپ کی پیش کردہ امداد نہیں چاہیے۔'' کہہ کر وہ بے اعتنائی سے چل دی۔

اس کے یہ الفاظ سن کر میں حیران و پریشان کھڑی رہ گئی۔ میں سوچ رہی تھی کہ کیا یہ وہی لڑکی ہے جس کے بارے میں، میں نے اہلِ محلہ سے سنا تھا کہ وہ بہت مشکل حالات میں اپنے خاندان کی کفالت کررہی ہے۔

میں جہاں کام کرتی ہوں وہ ایک غیر سرکاری فلاحی ادارہ ہے جس کا مقصد دکھی انسانیت خاص طور پر بوڑھے، لاچار ضرورت مند لوگوں کی خاموش خدمت ہے۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ ایسے بے وسیلہ طلبہ کی مالی اعانت بھی کرتا ہے جو اعلیٰ تعلیم کے اخراجات برداشت نہیں کرسکتے۔

مجھے اپنے ادارے کی طرف سے ایک ذمہ داری تفویض کی گئی کہ میں اپنے اردگرد ایسے خاندان تلاش کروں جنھیں کرونا جیسی وبا نے فاقے کرنے پر مجبور کردیا مگر وہ ہرحال

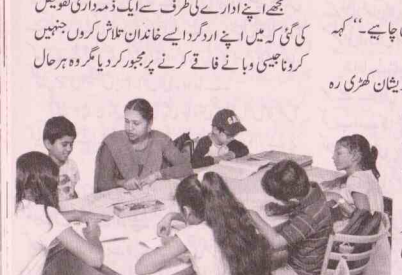

میں اپنی سفید پوشی کا بھرم بھی قائم رکھے ہوئے اور کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے۔

میں نے اپنے اردگرد نگاہ دوڑائی تو کچھ گھرانے ایسے نظر آئے جو زبان سے تو اپنی تنگدستی کا اظہار نہیں کرتے مگر ان کے حالات اس بات کی غمازی کر رہے تھے کہ انھیں مشکل کی اس گھڑی میں مدد کی ضرورت ہے۔ میں نے ان میں سے ایک گھر کا انتخاب کیا اور اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنانے چل پڑی۔

سُننے میں آیا تھا کہ ایک ایسا خاندان ہے جسے ایک لڑکی چلا رہی ہے اور وہ کسی سے مدد لینا بھی پسند نہیں کرتی۔ وہ اکیلی ہی اپنے گھر کی کشتی کی پتوار تھامے تند و تیز تھپیڑوں کا مقابلہ جوانمردی سے کر رہی ہے......وہ زارا تھی۔

میں پورے راستے عجیب گومگو کا شکار رہی کہ پتا نہیں میرے پوچھنے پر اس کا ردِعمل کیا ہو؟ کیا وہ میری پیش کردہ امداد لینے کے لیے تیار ہو جائے گی؟ دل کہتا وہ مصیبت میں ہے، ضرور لے گی۔ دماغ کے کسی کونے میں یہ خیال بھی اُبھرتا کہ اس نے آج تک اپنی انا اور خودداری کا بھرم قائم رکھا، کہیں میری پیشکش پر ناراض ہی نہ ہو جائے۔

انھی سوچوں میں غلطاں چلی جا رہی تھی کہ اُس کا گھر آ گیا۔ میں نے اپنی سوچیں دماغ سے جھٹک کر دروازے پر دستک دی۔

دروازہ ایک نو سالہ بچی نے کھولا اور مجھے ایک چھوٹے مگر صاف ستھرے اور سلیقے سے سجے کمرے میں لے آئی۔ گھر کی حالت گو غربت کا پتا دے رہی تھی مگر کمرے میں رکھے ایک پرانے سے صوفے پر پڑے سفید کروشیے کے غلاف اس گھر کی خواتین کی نفاست کی کہانی سنا رہے تھے۔ میں صوفے کے ایک کونے پر بیٹھ کر اُس کا انتظار کرنے لگی۔

میرے سامنے زارا کا سراپا گھوم رہا تھا۔ ستواں ناک

ثمینہ ملک

میں چمکتی لونگ کسی کے بھی دل میں محبت جگا سکتی تھی۔ گلاب کی پنکھڑیوں جیسے ہونٹ، کالی سیاہ آنکھیں جن میں ہیرے کی سی چمک ایک الگ ہی کہانی بیان کر رہی تھی۔ لمبے گھنگھریالے بال اس کے کندن جیسے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ چھریرا بدن جس پر چار بچوں کی پیدائش نے بھی کوئی خاص فرق نہیں ڈالا تھا لیکن وہ تھی کہ بھرپور جوانی میں جوگ لیے بیٹھی تھی۔ میں کافی دیر اس کے بارے میں سوچتی رہی لیکن کوئی سرا ہاتھ نہ آیا تو میں نے سر جھٹک دیا۔

مجھے انتظار کرتے کافی دیر ہو چکی تھی۔ جب زارا نہ آئی تو میں نے آگے بڑھ کر دروازے کا پٹ ذرا سا کھول کر دیکھا۔ سامنے والا منظر میرے لیے بہت حیران کن تھا۔ ایک عمر رسیدہ عورت چارپائی پر نڈھال پڑی تھی جبکہ زارا اُس خاتون کے فشارِ خون کا جائزہ لے رہی تھی۔ وہ میری طرف دیکھ کر مسکرائی اور میں کمرے میں داخل ہوگئی۔

زارا نے بتایا کہ یہ عورت اس کی ساس ہیں جو ایک طویل عرصے سے دل کے عارضے میں مبتلا ہیں۔ اس نے مجھے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ میں چارپائی کے پاس پڑی ہوئی لکڑی کی کرسی پر جا کر بیٹھ گئی۔ زارا نے اپنی ساس کا بلڈ پریشر چیک کیا، شوگر کی ریڈنگ لی، انھیں دوا دی اور پھر میری طرف پلٹی۔

''معاف کیجیے گا! اماں کی طبیعت اچانک بگڑ گئی تھی، اس لیے آپ کو انتظار کی زحمت اُٹھانا پڑی۔ آیئے بیٹھک میں چلتے ہیں۔'' یہ کہہ کر وہ میرے آگے آگے چل پڑی۔

تین مرلے کے اس دومنزلہ مکان کے کونے کونے سے غربت ٹپک رہی تھی۔ پرانی عمارت کا پلستر جگہ جگہ سے اُکھڑ چکا تھا اور مرمت کا تقاضا کر رہا تھا۔ دو سال سے آٹھ سال تک

کی عمر کی تین بچیاں انتہائی سادہ سی فراک پہنے کمرے کے ایک کونے میں بیٹھی کھیل رہی تھیں۔ داخلی دروازے کے پاس ہی باورچی خانہ تھا جہاں معمولی سے لباس میں ملبوس اٹھائیس انتیس سال کی ایک کمزور، زرد رنگت مگر پیاری سی لڑکی برتنوں کو یہاں سے وہاں پٹک رہی تھی۔ بعد میں پتہ چلا وہ زارا کی بڑی نند تھی جو پیدائشی طور پر ابنارمل تھی۔ میں ان سب کو نظرانداز کرتے ہوئے بیٹھک میں داخل ہوگئی۔ اُس نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بھی میرے برابر بیٹھ گئی۔ میں نے اُس کی خیریت دریافت کی تو وہ یک دم افسردہ ہوگئی۔ مہمان نوازی کی پُرتپاک مسکراہٹ کی جگہ گمبھیر اداسی نے لے لی۔ میں اُسے دکھی دیکھ کر پریشان ہوگئی۔

''زارا! کیا بات ہے؟ تم اداس کیوں ہوگئیں؟ سب خیریت ہے ناں؟''

میرے استفسار پر وہ کہنے لگی: ''آج کل اماں کی طبیعت بہت خراب رہنے لگی ہے۔ ان کا بائی پاس آپریشن ہو چکا۔ بلڈ پریشر اور شوگر کنٹرول میں نہیں آ رہے۔ ادھر شہر میں کرونا وائرس پھیلا ہوا ہے جس کی وجہ سے میں انھیں ڈر کے مارے کسی ہسپتال میں نہیں لے جا پا رہی اور اس پر مستزاد یہ کہ شہر میں لاک ڈاؤن کی وجہ سے سواری ملنا بھی بہت مشکل ہے۔ بہرحال، آپ بتائیں، خیریت سے تشریف لائی ہیں؟''

میں بات شروع کرنے کے لیے الفاظ تلاش کرنے لگی۔

''میں نے گھر میں داخل ہوتے ہی تمہارے حالات کا اندازہ لگا لیا۔ تم بہت مشکل میں ہو، لہٰذا میری بات غور سے سننا اور ناراض نہیں ہونا۔ میرا مقصد تمہاری دل آزاری نہیں، انسانیت کے ناتے صرف مدد کرنے کا ارادہ لے کر آئی ہوں۔ دراصل میں ایک ایسے ادارے میں کام کرتی ہوں جو طویل عرصے سے آپ جیسے سفید پوش خاندانوں کی انتہائی خاموشی سے مدد کرنے میں مصروف ہے۔ کرونا کی وجہ سے ملک میں بڑھتی ہوئی تنگدستی کو دیکھتے ہوئے میرے ادارے نے لوگوں کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا اور میری ڈیوٹی لگائی کہ میں اپنے علاقے میں ایسے خاندان تلاش کروں جو واقعی حقدار ہیں، لیکن ان کی خودداری انھیں ہاتھ پھیلانے نہیں دیتی۔

میں چاہتی ہوں کہ آپ مجھے اپنے خاندان کے کوائف سے آگاہ کریں تاکہ ہم آپ کی پریشانی کم کر سکیں۔''

میں نے اپنی بات مکمل کر کے اُس کی طرف دیکھا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گئی کہ اب میرے سامنے ایک نرم و نازک لڑکی نہیں بلکہ عزم و ہمت کی ایک چٹان کھڑی تھی، جس کے منہ سے نکلنے والے فقرے اس کے متعلق لوگوں سے سُنی باتوں کی تائید بھی کر رہے تھے۔ مجھے اس کے الفاظ نے گنگ کر دیا۔ وہ کہہ رہی تھی:

''مس ثمینہ میں آپ کی اور آپ کے ادارے کی بے حد شکرگزار ہوں کہ آپ نے ہمارے بارے میں سوچا لیکن میں سمجھتی ہوں کہ جب میں خود کما کر اپنے گھر والوں کی ضروریات پوری کر سکتی ہوں تو پھر اپنی انا اور خودداری کو کرونا کی بھینٹ کیوں چڑھاؤں؟ یہ ایک وقتی آزمائش ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صرف اس بات کا فیصلہ کرنے کے لیے کہ ہم میں سے کون ثابت قدم رہتا اور کون ان مصائب سے گھبرا کر ہمت ہار جاتا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے کہ دنیا میں جس قدر بھی مخلوق ہے اللہ نے اسے رزق دینا ہے تو پھر واویلا کیسا؟ میرا اپنے رب پر کامل بھروسا ہے کہ وہی ہماری مشکلیں آسان کرے گا۔ لہٰذا میں اپنے رب کے علاوہ کسی کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاؤں گی۔ جس دن میں نے ایسا کیا وہ میری خودداری کا آخری دن ہوگا۔''

میں معذور نہیں، لاچار نہیں اور بیمار بھی نہیں۔ اللہ کا مجھ پر بڑا کرم ہے۔ کیا ہوا جو میں یتیم ہوں۔ میرے اللہ نے میرے ناتواں کاندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری ڈال رکھی ہے۔ پھر کیا ہوا جو میرے گھر میں کمانے والا کوئی ''مرد'' نہیں اور کیا ہوا جو میرے گھر میں دو مستقل مریض خواتین ہیں۔ میں گھبرانے

والوں میں سے نہیں۔ میں جوان ہوں، تعلیم یافتہ ہوں۔ میرے اللہ نے مجھے تندرست و توانا ہاتھ پاؤں سے نوازا اور سب سے بڑی بات مجھے خودداری اور قناعت کی دولت سے مالا مال کیا۔ اللہ بھی اُسی پر ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالتا ہے جو ان کو اُٹھانے کی اہلیت رکھتا ہو۔ میں اپنے آپ کو اس قدر خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے ان ذمہ داریوں کے لیے میرا انتخاب کیا۔ آپ ان لوگوں کی مدد کیجیے جو اس کے صحیح حقدار ہیں، جن کا کوئی آسرا اور کوئی کمانے والا نہیں۔ میرے لیے میرا اللہ کافی ہے۔ وہ ہمیشہ، ہر مشکل میں میرے ساتھ ہوتا ہے۔ مجھے اگر مانگنا ہے تو صرف اپنے پروردگار سے۔''

میں حیران و پریشان اس ہمت و حوصلے سے بھرپور لڑکی کو دیکھ رہی تھی جس کی جیب میں کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی آنکھوں میں یقین کے چراغ جل رہے تھے۔

''زارا مجھے پتا ہے کہ آپ بہت خوددار ہیں اور میں بھی ایک خوددار گھرانے سے تعلق رکھتی ہوں۔ میں نے بھی کبھی کسی کی مدد لینا گوارا نہیں کیا لیکن میں آپ جیسی بہادر خاتون کی کہانی لکھنا چاہتی ہوں تاکہ وہ خواتین جو اپنی انا اور خودداری کو تج کر گھناؤنے کام کرنے پر مجبور ہو جاتی یا معاشرے کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں آپ کی کہانی پڑھ کر اپنی زندگی نئے عزم سے شروع کریں اور معاشرے کے لیے ایک مثال بن کر اُبھریں۔''

میرے بے حد اصرار پر وہ اپنی کہانی سنانے کے لیے تیار ہو گئی۔ اس نے اپنی کہانی کا آغاز کچھ اس طرح کیا:

''میرے والد ایک انتہائی پسماندہ گاؤں گنگاپور کے رہنے والے تھے۔ تحصیل جڑانوالہ چک نمبر ۵۹۱ گ ب گنگاپور میرے گاؤں کا پتا ہے۔ اس کی تاریخ کچھ اس طرح ہے کہ مانگٹاں والا سے چند میل دُور ایک زمیندار ہندو گھرانے میں ایک بچہ پیدا ہوا، جس کا نام گنگارام رکھا گیا۔ یہ ہندو بچہ ایک کھاتے پیتے گھرانے کا چشم و چراغ تھا جس کی وجہ سے اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دی گئی۔ وقت گزرتا گیا اور یہ بچہ ایک ذہین انجینئر بن کر اُبھرا۔ ترقی کرتے کرتے اسے مجسٹریٹ کے اختیارات بھی مل گئے اور وہ دفعہ ۳۰ کا مجسٹریٹ مقرر ہوا۔ اسے سر کا خطاب ملا تو وہ سر گنگارام کے نام سے مشہور ہو گیا۔ چونکہ اس کی پیدائش ایک پسماندہ علاقے میں ہوئی تھی، اس لیے اپنے علاقے کی فلاح اور ترقی کے بارے میں سوچتا رہتا۔ چونکہ وہ ایک کامیاب انجینئر تھا لہٰذا اس نے اپنے علاقے کی بنجر زمین استعمال میں لانے کا منصوبہ بنایا۔

اس مقصد کے لیے اس نے انگریز حکومت سے سو مربع زمین کرائے پر لی اور ایک گاؤں آباد کیا جس کا نام اس نے اپنے نام پر ''گنگاپور'' رکھا۔ اب اس گاؤں کو ماڈل ویلج بنانے کے لیے پانی کی ضرورت تھی۔ کیونکہ گنگاپور کی نہر سطح زمین سے نیچے اور اس کا رقبہ نہر کی سطح سے بہت بلند تھا۔ سر گنگارام نے اس مسئلے کا حل یہ نکالا کہ حکومت برطانیہ سے اجازت لے کر انجن امپورٹ کیا۔ چونکہ گنگاپور میں آمد و رفت کا کوئی ذریعہ نہ تھا، لہٰذا اس انجن کو گاؤں تک پہنچانے کے لیے ایک خاص قسم کی ٹرانسپورٹ بنائی گئی۔

گنگارام نے بچیانہ سے گنگاپور تک ریلوے لائن کی طرز پر ایک چھوٹی پٹڑی بچھائی اور ٹرالی چلا کر اس کے ذریعے یہ انجن گنگاپور پہنچایا گیا۔ اس انجن کی بدولت گنگاپور کی زمین سیراب کی گئی۔ اس علاقے کی زمین اتنی زرخیز ہے کہ اس پر جو فصل کاشت کی جائے وہ اعلیٰ معیار کی حامل ہوتی ہے۔ اس بنجر زمین کو سیراب کر کے زیرِ کاشت لانے کا تجربہ اس قدر کامیاب ثابت ہوا کہ اس نے حکومت برطانیہ میں ہلچل مچا دی۔ پوری دنیا سے لوگ اس جدید گاؤں کو دیکھنے آنے لگے۔ جب تک سر گنگارام زندہ رہے انھوں نے گنگاپور کو اپنی رہائش گاہ بنائے رکھا۔ اس کے بعد یہ علاقہ پھر روایتی دیہہ میں شامل ہو گیا۔

وہی پرانی روایات، فرسودہ رسوم و رواج اور انتہائی تنگ

نظر سوچ۔ اس علاقے میں لڑکیوں کو تعلیم دلوانا گناہ سمجھا جاتا لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ سوچ تبدیل ہوتی گئی اور آج گنگاپور میں کوئی گھر ایسا نہیں جہاں لڑکی تعلیم یافتہ نہ ہو۔

میرا تعلق بھی اُسی گاؤں سے ہے۔ والد کی اسی دیہاتی ماحول میں تربیت ہوئی اور تعلیم یافتہ نہ ہونے کی وجہ سے ان کا کوئی خاص ذریعۂ معاش بھی نہ تھا۔ وہ چھوٹے موٹے کام کر کے گھر چلا رہے تھے۔ والدہ انتہائی دیندار اور گھریلو خاتون تھیں۔ ہم چار بہنیں اور ایک بھائی ہیں۔

میرے گاؤں میں لڑکیوں کو تعلیم دلوانا گناہ سمجھا جاتا تھا لیکن ان پڑھ ہونے کے باوجود میرے والد صاحب کو ہم سب بہن بھائیوں کو پڑھانے کا بہت شوق تھا۔ اپنے والد کی یہ خواہش صرف میں نے پوری کی۔ میرے سب بہن بھائیوں نے واجبی سی تعلیم حاصل کی جبکہ میرا مشن کچھ اور تھا۔ سب بہنوں کی شادیاں قریبی عزیزوں میں ہو گئیں تو والدہ کو میری شادی کی فکر لاحق ہوئی۔

اس دوران میں نے میٹرک اعلیٰ نمبروں سے پاس کر لیا تھا۔ اب میں قریبی شہر جا کر مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن میری والدہ مجھے لڑکی ہونے کی وجہ سے دُور جانے نہیں دینا چاہتی تھیں۔ میں نے والد صاحب سے اپنی خواہش کا اظہار کیا۔ وہ فوراً راضی ہو گئے اور میں نے جڑانوالہ کالج میں داخلہ لے لیا۔ زندگی کی گاڑی آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ میرے گھر میں اوّل دن ہی سے بھوک اور غربت کا ڈیرہ تھا لیکن میرے والد نے ہم سب بہن بھائیوں کی تربیت ایسی کی کہ ہمیں اپنی غربت سے کبھی کوئی شکوہ نہیں ہوا۔ میں نے دورانِ تعلیم ہی اپنے سے چھوٹی کلاس کی بچیوں کو ٹیوشن دینا شروع کر دی اس لیے مجھے اپنے کالج کے اخراجات کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہونا پڑا اور یوں میں نے بی۔ اے میں بھی پہلی پوزیشن حاصل کر لی۔

اب میں مزید تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی لیکن گھر والوں خصوصاً والدہ چاہتی تھیں کہ میں اس خواہش سے دستبردار ہو کر شادی کے لیے حامی بھر لوں۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں تھی کہ ایک دن والد صاحب کو دل کا دورہ پڑا اور وہ ہم سب بہن بھائیوں کو چھوڑ کر اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

میں اپنے گھر میں سب سے چھوٹی اور غیر شادی شدہ تھی اور جب سر پر والد کا سایہ بھی نہ رہا تو والدہ اور میں خاندان والوں کے سامنے بے بس ہو گئیں اور یوں لاہور میں رہائش پزیر میرے بڑے چچا کے بیٹے جنید سے والد کے چہلم پر ہی خاموشی سے میرا نکاح کر دیا گیا اور میں نکاح کے بعد لاہور آ گئی۔

یہاں میری ایک الگ ہی زندگی شروع ہوئی۔ سسرال کی ایسی بہت سی باتیں جو دُور رہنے کی وجہ سے ہم سب کے علم میں نہیں تھیں، اب سامنے آنے لگیں۔ میرے شوہر اپنے گھر کے واحد کفیل تھے اور کوئی خاص ذریعۂ معاش بھی نہ تھا۔ سسر صاحب کا عرصہ پہلے انتقال ہو چکا تھا۔ گھر میں ایک معذور بہن، ایک بیمار ساس اور میرے شوہر تھے۔ باقی تین نندیں اپنے اپنے گھروں میں خوش تھیں۔

زندگی ایک نئی ڈگر پر رواں دواں تھی۔ اللہ نے مجھے یکے بعد دیگرے چار بچوں سے نوازا، جن میں ایک لڑکا اور تین لڑکیاں ہیں۔ میرے شوہر ڈرائیور تھے اور تعلیم بھی واجبی سی تھی۔ میرے والد نے چونکہ بچپن ہی سے قناعت کی عادت ڈالی تھی، اس لیے یہ سب بھی چپ چاپ سہہ لیا لیکن دل کے کسی کونے میں مزید تعلیم حاصل کرنے کی خواہش اکثر چٹکیاں لیتی لیکن دُور دُور تک یہ خواہش پوری ہونے کے امکانات نظر نہ آتے۔

چونکہ میں ایک طویل عرصے تک معلمی کے پیشے سے وابستہ رہی تھی اور اپنی ساری تعلیم کے اخراجات میں نے خود ہی برداشت کیے تھے اور یہ بھی جانتی تھی کہ میرے شوہر اپنی کم آمدنی میں بچوں کو وہ تعلیم نہیں دلوا سکیں گے جو میرا خواب

تھے۔ اس لیے میں دن رات اپنے بچوں کے بارے میں سوچتی رہتی۔

گھر میں بیمار ساس، معذور نند اور چھوٹے بچوں کی وجہ سے میں گھر سے باہر قدم نہیں رکھ سکتی تھی لیکن مجھے کچھ کرنا تھا 'کیا؟ یہ میں نہیں جانتی تھی۔

ایک دن میرے دل میں ایک خیال آیا کہ کیوں نہ میں گھر میں دوبارہ سے ایک ٹیوشن سنٹر کھول لوں؟ اس سے ایک تو میرے اندر اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کرنے کی تشنگی پوری ہوجائے گی دوسرے میں اپنے شوہر کی مدد بھی کرسکوں گی تا کہ ہم دونوں نہ صرف مل کر گھر چلا سکیں بلکہ اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم بھی دلوا سکیں۔

میرے سسر کا ہم سب پر ایک بہت بڑا احسان یہ ہے کہ انھوں نے اچھے وقتوں میں جمع جوڑ کر کے ایک گھر بنا لیا تھا۔ میں نے اپنے اس ارادے کا ذکر شوہر سے کیا۔ پہلے تو وہ نہیں مانے لیکن جب میں نے انھیں آنے والے وقت کی سنگینی کا احساس دلایا تو وہ راضی ہوگئے۔ یوں میں نے اپنے گھر کی اُوپر والی منزل کا سامان سمیٹا اور اسے اکیڈمی میں تبدیل کر دیا۔

رفتہ رفتہ چھوٹے بچے آنا شروع ہو گئے اور مجھے اپنا خواب جو میں نے اپنے بچوں کی اعلیٰ تعلیم کے بارے میں دیکھ رکھا تھا، پورا ہوتا نظر آنے لگا۔''

یہاں تک اپنی کہانی سنانے کے بعد زارا ایک دم خاموش ہوگئی اور اس کی آنکھیں نمی سے بھر گئیں۔ میں خاموش بیٹھی اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کر رہی تھی۔

وہ کچھ دیر چپ چاپ آنسو اپنے اندر اُتارتی رہی پھر گویا ہوئی۔

''یہ جنوری کی ایک بھیگی ہوئی شام تھی۔ میرے شوہر جنید کو فون آیا کہ ہوائی اڈّے سے ایک صاحب کو لے کر شاہ عالمی چھوڑنا ہے۔ سخت سردی کی راتیں تھیں اور سرِ شام ہی دھند نے پورے علاقے کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس دن میرے دل میں ایک دھڑکا لگا ہوا تھا۔ عجیب طرح کے وسوسے دل کو گھیرے ہوئے تھے۔ میں نے شوہر سے ذکر کرنا مناسب نہ سمجھا، مبادا وہ بھی پریشان ہوجائیں۔

وہ اپنے مقررہ وقت پر رات دو بجے کے قریب گھر سے رکشا لے کر ہوائی اڈّے روانہ ہوئے اور میں دوبارہ بستر میں دبک گئی۔ سردی بھی آج اپنا آپ منوا رہی تھی۔ میں نے ایک مرتبہ پھر رب سے ان کی زندگی کی دعا کی اور نیند کی وادیوں میں اُتر گئی۔

مجھے سوئے ابھی دو گھنٹے بھی نہیں گزرے تھے کہ سرہانے رکھا ہوا فون بج اُٹھا۔ بے وقت فون کی گھنٹی نے مجھے لرزا دیا۔ میں نے کانپتے ہاتھوں سے فون اُٹھایا۔

''ہیلو! یہ جنید احمد کا گھر ہے؟''

''جی۔''

''ان کے رکشے کا ایکسیڈنٹ ہوگیا ہے اور وہ اس وقت سروسز ہسپتال کے آئی سی یو میں ہیں۔ آپ جلدی سے آ جائیں۔''

یہ سُننے کے بعد مجھے نہیں پتا کہ میں کب اور کیسے وہاں پہنچی؟ بس اتنا یاد ہے کہ میری دنیا اندھیر ہو چکی تھی۔ مجھے نہیں پتا کہ کب جنید کی میت گھر آئی اور کب انھیں دفنایا گیا؟ بس اتنا یاد ہے کہ اب گھر اپنے اکلوتے سربراہ سے محروم ہو چکا تھا۔ گھر کے واحد کفیل کا رکشا بھی چکنا چور ہو چکا تھا۔ جب میں اپنے حواس میں واپس آئی تو پتا چلا تجہیز و تکفین کے اخراجات اہل محلہ نے ادا کیے لیکن عزیز واقارب کی آمدورفت اور مہمان داری کا بوجھ اب مجھ پر ہی آن پڑا تھا۔ میں نے کسی نہ کسی طرح یہ اخراجات محلے کے ایک گھر سے لے کر ادا کیے۔

سب رشتے دار اپنے گھروں کو لوٹ چکے تھے۔ گھر میں اب میں، میرے چار بچے، ساس اور نند...... پہاڑ سی زندگی سر

کرنے کے لیے ہر ایک کو خوراک، لباس، دوائیاں۔ الغرض ہر قسم کی ضروریاتِ زندگی درکار تھیں لیکن کچھ پس انداز نہ تھا۔

اہل محلہ بھی افسوس کر کے جا چکے تھے۔

اب میں تھی، میری لامتناہی سوچیں اور بے رحم زندگی۔

بہت دن سوچنے میں بسر کیے لیکن جب گھر کے باورچی خانے میں رکھا راشن کا آخری خالی ڈبہ بھی منہ چڑانے لگا تو دل نے یک دم ہی فیصلہ کرلیا۔ ایک اٹل اور مضبوط فیصلہ......

اگلی صبح...... میرے فیصلے کی پہلی صبح تھی۔ ایک نیا جوش، ایک نیا ولولہ لیے میں نے ساس سے مشورہ کیا اور اپنے مشن پر نکل کھڑی ہوئی۔ وہ اکیڈمی جو صرف چھوٹے بچوں پر مشتمل تھی، اب آہستہ آہستہ اس میں بڑی جماعتوں کے بچے بھی آنا شروع ہو گئے اور میری زندگی کی گاڑی ایک نئی ڈگر پر چل پڑی۔

اکیڈمی کو کامیاب بنانے میں اہل محلہ نے میری بہت مدد کی۔ شروع شروع میں سارے محلے داروں نے میری مالی مدد کرنے کی کوشش کی لیکن میرا دل اس پر آمادہ نہ ہوا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے بچے صدقے خیرات پر پلیں۔ جب میں زندہ اور تندرست ہوں تو اپنی زندگی کی گاڑی کو خود چلانے کی کوشش کیوں نہ کروں؟ ہاں! میں نے ان سے اتنا ضرور کہا کہ اگر آپ میری مدد کرنا ہی چاہتے ہیں تو اکیڈمی چلانے میں میری مدد کر دیا کریں۔ اپنے بچے میرے پاس بھیجیں۔ میں سخت محنت کروں گی اور آپ کے بچوں کو اچھی تعلیم دوں گی۔

اللہ کا شکر ہے کہ انھیں میری بات سمجھ میں آ گئی۔ میری اکیڈمی نے اچھا رزلٹ دینا شروع کر دیا۔ میں اپنے بچوں کی فیس بھی ادا کر رہی تھی، ساس اور نند کی دوائیوں کا خرچ بھی پورا ہونے لگا تھا اور ہم اچھی زندگی بھی گزارنے لگے۔

یہاں آپ کو ایک اچھی خبر سناؤں۔ میری خواہش تھی کہ میں مزید تعلیم حاصل کروں۔ اس مقصد کے لیے میں نے علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی سے ایم اے پارٹ ون کا امتحان بھی دے دیا ہے۔ آپ دعا کریں اللہ مجھے کامیاب کرے آمین۔''

''زارا تم واقعی ہمت والی خاتون ہو لیکن یہ پہاڑ جیسی زندگی اکیلے کیسے اتنے بڑی ذمہ داری کو لے کر چل پاؤ گی؟ تم جوان اور خوبصورت ہو۔ تمہیں جلد یا بدیر ایک ساتھی کی ضرورت محسوس ہوگی اور ویسے بھی ہمارا معاشرہ اکیلی عورت کو کبھی برداشت نہیں کرتا۔''

''جی میں آپ کا مطلب سمجھ گئی لیکن آپ خود سوچیں، میں اکیلی نہیں، بھرا پُرا گھر ہے، بچے ہیں۔ انشاء اللہ ہم ایک دوسرے کا سہارا بنیں گے۔ میں نہ صرف اپنے بیٹے بلکہ تینوں بیٹیوں کو بھی اعلیٰ تعلیم دلوا کر معاشرے پر یہ ثابت کردوں گی کہ ضروری نہیں صرف مرد ہی گھر چلا سکتے ہیں۔ اب عورتیں بھی ہر قسم کے کام اور ذمہ داری احسن طریقے سے پوری کر رہیں اور اپنے خاندان کی کفیل ہیں۔''

''پورے ملک میں کرونا وائرس اپنے پنجے گاڑے بیٹھا ہے۔ ان حالات میں آپ کی اکیڈمی بھی گزشتہ دو ماہ سے بند پڑی ہے۔ ہر کوئی معاشی تنگدستی میں مبتلا ہو چکا۔ آپ اپنے گھر کے معاملات کیسے چلائیں گی؟'' میرے اس سوال پر وہ مسکرائی اور بولی؛

''میں آج آپ کو ایک بڑے راز کی بات بتاتی ہوں۔ جو لوگ مانگنے کے عادی ہو جاتے ان کی غربت کبھی ختم نہیں ہوتی۔ آپ اپنے اندر خودداری کی شمع روشن کر کے دیکھیں، یقین جانیے اللہ آپ کو کبھی مایوس نہیں کرے گا کیونکہ اللہ نے آپ کو جو رزق دینے کا وعدہ کیا ہے وہ اس نے ہر صورت دینا ہے۔ چاہے اسے آپ اللہ سے مانگ لیں یا پھر لوگوں سے۔ تو پھر میں اپنے رب سے کیوں نہ مانگوں؟''

زارا کی باتوں نے میرے اندر ایک نئی روح پھونک دی تھی۔ میں اپنے رب پر اپنا ایمان مزید مضبوط کرتے ہوئے ہلکے پھلکے انداز میں اپنے گھر کی طرف روانہ ہوگئی۔ ●●●

خیالِ واصِف

رحمت

رحمت کا تصور یا اس کے وجود کا ثبوت اللہ تعالیٰ نے خود عطا فرمایا۔ اس کا ارشاد ہے اور یہ ارشاد بڑے زور دار لہجے میں آیا ہے کہ میری رحمت سے مایوس نہ ہونا یعنی خبردار میری رحمت سے مایوس نہ ہونا۔ اگر انسان کے اعمال اپنے منطقی نتیجے پر منتج ہوں تو رحمت کا لفظ کوئی معنی نہیں رکھتا۔ انسان محنت کرے گا، حاصل کر لے گا۔ بدی کرے گا، سزائے پالے گا۔

نیکی ہوگی، انعام پائے گا۔ ہر وجہ کا ایک نتیجہ ہے اور ہر نتیجے کیلئے کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔ اگر وجوہ اور نتائج صرف وجوہ اور نتائج ہی ہوتے تو غالباً انسان کے دل سے امید، آس اور رحمت کا تصور ختم ہو جاتا۔ رحمت ہوتی ہی انسان کو اس کی بداعمالیوں کی سزا سے بچانے کے لیے، یعنی حال کی غلطی جو مستقبل میں اپنے لیے سزا مرتب کر چکی ہے یا لکھ چکی ہے، اس سے بچانے والی شے رحمت کہلائے گی۔

الفاظ

ہر خیال اپنے مخصوص پیرہن میں آتا ہے۔ یہ پیرہن الفاظ سے بنتا ہے۔ خیال نازل فرمانے والے الفاظ نازل فرماتے ہیں۔ الفاظ ہی کے دم سے انسان کو جانوروں سے زیادہ ممتاز بنایا گیا۔ انسان اشرف ہے، اس لئے کہ وہ ناطق ہے۔ انسان کو بیان کی دولت سے نوازا گیا اور بیان الفاظ کی ترتیب کا نام ہے۔ حسنِ ترتیب الفاظ کی اپنی صفت ہے۔ انداز بیاں بے شک انسان کا ہی ہے لیکن یہ خوبی دراصل الفاظ کی ساخت میں پنہاں ہوتی ہے۔

موزوں الفاظ کا انتخاب ہی انسان کو صاحب طرز بناتا ہے۔ سنگ تراش کا فن یہ ہے کہ وہ پتھر میں چھپے ہوئے نقش کو اجاگر کرتا ہے۔ یہ کام بڑا کام ہے۔ ہر آدمی کے بس کا نہیں..... اسی طرح الفاظ سے مضمون اور مضامین سے الفاظ کے رستوں کا علم ہی انسان کو مصنف بناتا ہے۔

الٰہی، یا الٰہی

اے خاموشی کی زبان سننے والے مالک، اے اپنی مخلوق کے ہر حال سے ہمہ حال باخبر رہنے والے مولا، ہم پر رحم فرما، تو ہی تو جانتا ہے کہ ہم کس چیز سے محروم رہے ہیں، اے بنانے والے ہمیں پھر سے بنا..... ہم شاید ہم نہیں رہے۔ سب کچھ وہی ہے لیکن سب کچھ بدل سا گیا ہے..... ہمارا آسمان خوبصورت ہوتا تھا مگر اب وہی آسمان ہمارے سر پر وزن ڈال رہا ہے۔ پاؤں تلے سے زمین نکلا چاہتی ہے۔ ہم تیرے دیرینہ التفات سے محروم سے ہوتے جا رہے ہیں۔ ہماری زندگی تیرے محبوب ﷺ کے بتائے ہوئے راستے سے بھٹک گئی ہے۔ ہم انسان کی محبت سے محروم ہیں۔ انسان، انسان کے قریب آئے تو یوں لگتا ہے کہ خطرہ، خطرے کے قریب آ گیا ہے..... بھائی، بھائی کیلئے خوف پیدا کر رہا ہے۔ ہم پر بے یقینی کی وبا نازل ہو چکی ہے۔ ●●●

سلمیٰ اعوان

قرنطینہ کے شب و روز

20 مارچ

پہلی بات تو یہی تھی کہ جس ناگہانی صورت نے جنم لیا اُس نے پریشان ہی نہیں دماغ ماؤف بھی کر دیا تھا۔ بستا رستا شہر ہنگاموں سے پُر گلی کوچے، سڑکیں، بازار، پارک سب ویرانیوں کی گود میں جا بیٹھے تھے۔ کام کرنے والے لوگوں کا گھروں میں بیٹھنا کوئی مذاق تھا؟

گزشتہ صدیوں میں دنیا نے بہت سی مہلک بیماریوں کو بھگتا۔ بہت ساری آفات کا سامنا کیا۔ بیسویں صدی میں طاعون نے شہر کے شہر موت کی بھینٹ چڑھا دیے مگر وہ سب تو کتابی باتیں تھیں۔ کتابی باتیں کتنی ہی خوفناک کیوں نہ ہوں عہدِ رفتہ کی کہانیاں ہی لگتی ہیں۔

سچ تو یہ کہ ہم نے کبھی ایسی سنگین صورت کا پل بھر کے لیے بھی تصور کیا تھا۔ ہرگز نہیں۔ پہلے چند دن تو ہونقوں کی طرح سوچنے سمجھنے میں گزار دیے۔ گھر کے اندر چکروں نے ہی بے حال کر

اے پروردگار! ہمارے پاس سوائے تیرے آسرے اور رحم کی اُمید کے، اور کچھ نہیں...

دیا۔ پھر موبائل کھولا تو احساس ہوا کہ کرونا کے حوالے سے رنگا رنگ موضوعات کی بہار آئی پڑی ہے۔ کرونا وائرس کے وبائی دنوں میں محبت، پھر تجدید محبت۔ پھر خود سے ملنے کے دن، اپنے آپ کو پہچاننے کے دن وغیرہ وغیرہ۔

آمنہ مفتی نے لکھا ان وبائی دنوں میں گھر پر رہیے اور خود سے ملیے۔ اب اپنے آپ سے باتیں کرتی اور پوچھتی ہوں بھئی یہ خود سے ملنا کیا ہوا؟ ہم جیسے اُجڈوں نے تو ساری زندگی خود کا نہیں سوچا۔ اب زندگی کے آخری پہر کیا اس پر غور کریں گے؟ وہی مثال صادق کہ عمر گزری اس کوچۂ بتاں میں اب کیا خاک مسلماں ہوں گے؟

اب خود سے ملنے کا ایک مطلب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ خود پر توجہ دیں۔ اپنی ویئر ٹیر Wear Tear کو دیکھیں۔ اب پھر سوچیں تھیں۔ یہ کام بھی ساری زندگی نہیں کیا۔ ہم نے تو بھنوؤں سے بھی کبھی چھیڑ خانی نہیں کی۔ حتیٰ کہ شادی والے دنوں میں بھی وہ کچھ نہیں کیا جو بہر حال ہمارے وقتوں میں سکہ رائج الوقت تھا۔ بیوٹی پارلروں کا تو تب کہیں دُور دُور نام و نشان تک نہ تھا۔ ہاں اُبٹن جیسے دیسی ٹونے ٹوٹکے بہتیرے تھے۔ رنگ چونکہ کالا تھا۔ اس لیے اسے گورا کرنے کے لیے پانی والے تالاب کے حکیم سید ظفر عسکری کی جان نہیں چھوڑتی تھی۔ وہ بھی خاندانی حکیم تھے۔ پُڑوں کے بغیر اُن کی حکمت بھی مکمل نہیں ہوتی تھی۔ میرے کونڈی ڈنڈے اور پُڑوں کی غرض و غایت سب سے پہلے چھوٹی خالہ کو سمجھ آئی تو اس نے بھی یہ طعنہ دینا فرض بنا لیا۔

کالے کدی نہ ہوندے بگھے
بھانویں نو من صابن ملّے

اور میں شدت سے چاہنے کے باوجود وہ کونڈی ڈنڈا نہ کبھی اپنے سر پر مار سکی اور نہ چھوٹی خالہ کے۔

اب رہی محبت بھئی ہوئی ہوگی۔ کسی نے تجدید محبت کا مزہ بھی چکھا ہوگا۔ یا کسی کو کسی کی تجدید محبت کی داستان سننے کو ملی ہوگی۔

وبائی دنوں میں محبت پر کون سے جوڑے فٹ بیٹھتے ہیں؟ اگر تجزیہ کریں تو شاید ایک بھی نہیں۔ نو بیاہتے بیچاروں کے ارمانوں پر تو اوس پڑ گئی ہوگی۔ خوابگاہ کے سوا گھر میں کون سی جائے عافیت ہے اُن کے لیے۔ باہر نکلنے اور ہنی مون کے راستے جائے ممنوعہ بن چکے۔ محبت کا تو گھنا خوبصورت سر اس ناگہانی آفت کے نزول سے ہی گنجا ہوگیا ہے۔ اب رہے ہم......

ہنڈائے ہوئے، زمانہ کھائے ہوئے، پرانے بوسیدہ، قریب المرگ کے قریب پہنچنے والے جوڑے جن کی کوئی سر تال نہیں ملتی، ایک دوجے سے بیزار۔ ہم جیسوں کے لیے تو یہ فرصت کے دن عذاب بن چکے۔ ایک عذاب باہر دوسرا گھر کے اندر۔

ہماری زندگیوں میں گھر کے اندر رہنے کی سکون بھری عیاشی تو کہیں ہے ہی نہیں۔ اب پونے پانچ یا پانچ بجے اُٹھ کر اس کے حضور جھکنے کے بعد کا وقت تو جیسا راؤنڈ دی کلاک جیسا ہی ہوتا۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہائے ہماری بھی کیا زندگی ہے۔ کھوتوں کی طرح جتے رہتے ہیں۔ سکون سے ناشتا بھی نصیب نہیں۔ ہاں البتہ اگر کبھی اتفاق سے تین چار چھٹیاں اکٹھی آ گئیں تو سیاپا ہی پڑ گیا۔ انسان بھی کتنا ناشکرا ہے۔ ہر اُس چیز کے لیے مرتا ہے جو میسر نہیں اور جب وہ میسر آ جائے تو پھر اِسی کے لیے بیزاری کا عمل شروع۔

میاں کی اپنی سرگرمیاں دل جلانے والی۔ لان کی فضول کانٹ چھانٹ، اچھے بھلے پودوں کا ستیاناس مارنا شروع کر دیا۔ کچھ کہنے کا بھی فائدہ نہیں کہ کون سی سُننی ہے؟ بولتے جاؤ۔ کرتے جاؤ آپ بکواس۔

کسی کام میں مشورہ نہیں، کوئی صلاح نہیں۔ بچوں کے دودھ کے لیے پہلے ایک بھینس رکھی۔ دھیرے دھیرے اِس ریوڑ میں کٹے، کٹیوں اور بچھے بچھیوں کا اضافہ ہوگیا۔ ملازم اوّل درجے کا ہڈ حرام۔ چار ماہ میں پہلے بچھا مرا، پھر کٹی مری۔

اب کچھ کہنا بھینس کے آگے بین بجانے والی بات۔ دودھ سونے کے بھاؤ پڑ رہا ہے۔ حساب کتاب کا پلندہ اُٹھا کر آنکھوں کے سامنے لہرایا کہ ذرا دیکھو تو سہی، پر وہاں مجال جو کان پر جوں بھی رینگ جائے۔

اب میں کیا کروں؟ باورچی خانے میں گئی۔ بچوں کے لیے چپس تلنے والی کڑاہی دیکھی۔ حشر نشر ہوا پڑا تھا۔ صافیاں گندی، ایک ایک دراز کھولی۔ اتنی قابل رحم حالت کہ غصّے سے خون کھولنے لگا۔ جانے کب سے صفائی نہیں ہوئی تھی۔ نوکروں اور بہوؤں کی بات بعد میں کروں گی پہلے تو اپنی کروں۔ پر اپنی کیا کروں؟ سلیقہ شعار تو خیر کبھی نہ تھی مگر ایسی پھوہڑ کو چجّی بھی نہ تھی۔ ہاں البتہ اماں نے کو چجّی بنانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ اپنی ماں کی اکلوتی لاڈو بیٹی جس کے ہاتھ میں وہ سدا کتابیں اور ڈگریاں ہی دیکھنا چاہتی تھی۔ جب کبھی کام کرنے کو جی چاہا۔ امّاں نے فوراً کہا۔

”ارے چل چھوڑ، میں کرلوں گی۔ تو جا پڑھ۔“

یہ نہ کبھی سوچا کہ اِسے بیاہنا بھی ہے۔ سچی بات ہے سسرال ایسی ملی جو لڑکوں سے بھری ہوئی تھی۔ جہاں خاتون خانہ بڑی ہی سلیقے طریقے والی تھی۔ گھونگھٹ اُٹھنے کی دیر تھی کہ انھوں نے کونڈی ڈنڈا ہاتھ میں پکڑا دیا۔ ساتھ ہی ارشاد فرمایا کہ ہمارے ہاں بازار کی مرچیں ہنڈیا میں ڈالنے کا رواج نہیں۔ اب میں بیٹھی گھوٹنا ٹھک ٹھک مار رہی ہوں۔ آنسو رخساروں پر مچلنے کے لیے تیار بیٹھے ہیں۔ انھیں لعن طعن کر رہی ہوں۔

”کمبختو دم تو لو۔ غسل خانے میں تو جانے دو۔ پھر آ جانا شوق سے۔“ ساتھ دعاؤں کا ورد بھی جاری ہے۔

”ہائے اللہ! مجھے تو تپ چڑھ آئے۔ جان چھٹ جائے میری۔“ ایک دو بار پیاز کی گٹھی بغل میں دبا کر دھوپ میں جا بیٹھی کہ سُنا تھا اس سے بخار چڑھ جاتا ہے۔

تو بس جب ڈگریاں جھونکو چولہے میں جیسی صورتِ حال سے انسان کو گزرنا پڑ جائے اور فطرتاً جثے میں پھرتی ہوشیاری بھی ہو تو گھر داری کا دال دلیا کرنا کچھ آ ہی جاتا ہے۔ میں بھی طاق تو نہیں پر اچھے خاصے گزارے لائق ہو ہی گئی تھی مگر ال‍ا ماشاء اللہ بہوؤں کو کیا کہوں۔ کچھ کہتے ہوئے بھی ڈرتی ہوں۔ خیر سے اللہ رکھے دو ہیں۔ ایک تو بالکل اللہ میاں کی گائے اور دوسری ماشاء اللہ سے بڑی زمانہ ساز۔

اب کیا کروں؟ بیکار اندر باہر کے چند چکر کاٹے۔ پہلے سوچا جُت جاؤں، پھر ڈھے گئی۔ سامنے تو پنبہ کجا کجا نہم والا معاملہ تھا۔ داغ دھبوں، کیل مہاسوں سے سب کچھ اٹا پڑا تھا۔ کلینزنگ آپریشن کرنے کی میرے اندر کہاں ہمت تھی؟ بھاڑ میں جائیں سب۔ نوکر بھی موج میں اور گھر والیاں بھی۔

صبح پژمردہ سی تھی۔ گو لان میں ہر سو بہار ہی بہار تھی۔ گلاب مسکراتا اور کلیاں ہنستی تھیں۔ گیندا قہقہے لگاتا اور چمپا چوٹی سے نیچے چھلانگیں مارتا تھا۔ پر ان سب کا کیا کروں؟ میرا تو دل ڈوبتا اور اردگرد مایوسیاں بھنگڑے ڈالتی تھیں۔ کمرے میں آ کر بیٹھی۔ لکھنا چاہا لیکن دل مائل ہی نہ ہوا۔

شاپروں کی گٹھڑیاں نکالیں۔ اب پٹارے کھولے بیٹھی ہوں۔ عمرو عیار کی زنبیل ہے میرے سامنے۔ بیٹی بہو جس نے جو اچھا بھلا کرتا پاجاما فالتو سمجھ کے پھینک دیا، وہ میری گٹھڑی میں سماتا گیا۔ بیٹی کی اچھی بھلی قمیصیں جن کے نیچے لگی قیمتی لیسیں بالکل نئی تھیں۔ کتنی فضول خرچ ہیں یہ آج کی لڑکیاں۔ کچھ سوچتی ہی نہیں۔ کپڑے پر کپڑے خریدتی چلی جاتی ہیں۔ یہی حال بہوؤں کا ہے۔

اب اللہ سمجھے اِس آن لائن شاپنگ کو۔ گھروں میں بیٹھی آرڈر کرتی ہیں۔ دروازے پر دستک ہوتی ہے، ٹی سی ایس کا بندہ پیکٹ تھماتا اور ساتھ ہی ڈھیر سارے پیسوں کا مطالبہ کرتا ہے۔ ایسے میں خون کھولتا ہی ہے نا اور تو اور اب یہ کام بیجنگ میں بیٹھی نواسی نے بھی شروع کر دیا ہے۔ وہ وہیں سے آرڈر کرتی ہے۔ اب بولتی ہوں۔

"کہ اے ہے ابھی کل تو پیکٹ آیا تھا آج پھر آ گیا ہے۔"

پوتی فوراً کہتی ہے۔" دادو یہ تو فاطمہ آپی نے منگوایا ہے۔"

اب ایسے میں بولوں کہ نہ بولوں۔

تو بھئی بولتی ہوں کہ اِسے وہاں بیٹھی چین نہیں۔ پاکستان آنا ہی ہے نا تو خرید لے۔ اِن کا تو وہ حال ہے۔ کھوں پیا ویڑ کاء ہن اے کھسی کرلو۔ (یعنی بچھڑا کنویں میں گر گیا ہے بس فوراً خصی کرلو۔)

اب خود کو بھی کیا کہوں۔ فضول اور بے تکے شغل سے باز نہیں آؤں گی۔ لنڈے کے سویٹروں کو اُدھیڑنا، گولے بنانا، انھیں نئے بنانے کی کوشش کرنا اور پھر زچ آ کر اُدھورے چھوڑ دینا، بریزے کی دکان سے کٹ پیس خریدنا اور پھر ان کے جوڑ توڑ کرنا بھی میرے محبوب مشغلوں میں سے ایک ہے۔ ایسی کمینی ہوں کہ ڈھیروں ڈھیر وقت ضائع کردوں گی پر اِس فضول اور بے تکے شغل سے باز نہیں آؤں گی۔

اب ایک بازار کھلا پڑا ہے سامنے۔ اِن میں کچھ اچھے نگ بانٹے جا سکتے ہیں۔ ملازموں کی بیویاں بچیاں۔ بچیوں کے لیے تو دل فوراً منکر ہو گیا۔ ماشاء اللہ سے جیتی رہیں۔ یہ لڑکیاں جو سب اسکولوں کالجوں میں پڑھتی ہیں۔ زمانے کے رنگ ڈھنگ سے آشنا ہیں۔ ماشاء اللہ دیکھیں تو جی خوش ہو۔ پندرہ سولہ سو میں اچھا نیا سوٹ خریدتی ہیں۔ اُترن کا ہے کو پہنیں۔ اللہ نیک نصیب کرے سب کے۔ چلو ماؤں کی بات اور ہے۔ وہ پہن لیں گی۔

رات کچھ اضطراب میں گزری۔ عمران خان کی حکومت گرانے کی افواہیں، بیوروکریسی کے شہباز شریف سے رابطوں بارے سرگوشیاں، بزدار، اعظم خان اور زلفی بخاری سے متعلق عمران خان کی حماقتیں اور اُن سے جڑے رہنے کی وجوہات اور ان سے پیدا شدہ خرابیوں پر مختلف یوٹیوب چینلز پر تبصرے، حاشیہ آرائیاں۔ بیچ میں بوٹوں والوں کی آمد کے امکانات، اسمبلیوں کے ٹوٹنے اور مارشل لاء کا لگنا سب کے بارے لن ترانیاں سنتے سنتے کہیں اچاروں کی ترکیبیں دیکھتے دیکھتے سو گئی۔ نیند تو بس اِن ابتر حالات جیسی ہی تھی۔

صبح دم دیر سے آنکھ کھلی۔ نماز قضا تھی۔ باہر رم جھم کا سلسلہ تھا۔ ایک اور ہوک دل میں اُٹھی۔ خدایا پاکستان اس وقت دوہری آزمائش میں ہے۔ میرے کسانوں کا سارا سرمایہ کھلے کھلیانوں میں پڑا ہے۔ مولا رحم کر اُن پر۔

بندہ کیسے سیاپے میں پڑ گیا ہے؟ کہاں کہاں جان بچاتا پھرے؟ اخبارات کا مطالعہ کرنا عادت ہے۔ ملازم لاتا ہے۔ چولہے پر تیز آگ پر ہاتھوں میں پکڑ کر اُسے اور اپنے ہاتھوں کو پکاتی ہوں۔ اب یہی کہہ سکتی ہوں کہ دل کو بہلانے کو یہ خیال اچھا ہے۔ پہلے صفحے پر چپکے جراثیموں کو چتا رسید کر دیا تو اندر کے صفحات کا کیا ہوگا؟ تو بس پھر اُس اُوپر والے کو ہی پکارنا ہے۔ ویسے تو سچی بات ہے اپنے رب کے بڑے پن کا ڈنکا جس شان سے بجا ہے، اُس پر میں تو بڑی مسرور ہوں۔ ان بڑے ملکوں نے جس طرح ہم تیسری دنیا کے لوگوں کو خانوں میں بانٹا ہوا تھا۔ وہ سب برابر ہو گیا۔

5 اپریل

سوچتی ہوں گلزار کو الہام ضرور ہوتا ہے جو وہ آنے والے وقت کی چاپ سُن لیتا ہے۔ آنکھوں کو ٹھنڈک دیتا گہرا سبزہ، سُرخ، بسنتی، نیلے، پیلے پھول اور گھاس پر بیٹھا دلفریب پروں والا اجنبی سا پرندہ جسے کہیں بچپن میں دیکھتے تھے۔ اندر کہیں ہوک اُٹھی تھی۔ آنکھیں گیلی ہوئی تھیں۔ خوشی اور دکھ دونوں کیفیات کی بیک وقت زد میں تھی۔

میرے خوبصورت پرندو! واپسی کا کتنا بڑا تاوان لیا تم نے؟ آسمان انسانوں سے، ہوائیں اور فضائیں شوروغل سے خالی ہیں۔ زندگی منجمد ہے۔ کہیں اگر منظر میں حسن ہے تو وہیں خوف اور یاس کا زہر بھی گھلا ہوا ہے۔ اندر کے ہر مو، ہر مسام سے صدائے احتجاج ہے۔ میں گھر پر نہیں بیٹھ سکتی۔ منیرہ شمیم نے گلزار کی نظم شیئر کر کے گویا کلیجہ مٹھی میں جکڑ لیا۔

بے وجہ گھر سے باہر نکلنے کی ضرورت کیا ہے
موت سے آنکھیں ملانے کی ضرورت کیا ہے
سب کو معلوم ہے باہر کی ہوا قاتل ہے
یونہی قاتل سے الجھنے کی ضرورت کیا ہے
زندگی ایک نعمت ہے اِسے سنبھال کے رکھ
قبرستانوں کو سجانے کی ضرورت کیا ہے
دل کے بہلانے کو گھر میں وجہ کافی ہے
یونہی گلیوں میں بھٹکنے کی ضرورت کیا ہے

نظم کے آخری شعر پڑھتے ہوئے جی چاہا کہ گلزار سے اتنا ضرور کہوں، "گلزار! جب گلیوں میں بھٹکنے کے چسکے اور لتیں لگ جائیں تو گھر میں ٹکنا مشکل ہوتا ہے۔ مشقت کے گودے سے بھری ہڈیوں کو آرام کی لطافت راس نہیں آتی۔ بیچاریاں چیخنے لگتی ہیں۔"

پھر دیر تک سوچیں تھیں۔ لاؤنج سے آتی ایک اور گھائل کرنے والی آواز نے اُداسی بڑھا دی تھی۔

شہر خالی، جادہ خالی، کوچہ خالی، خانہ خالی
جام خالی، سفرہ خالی، ساغر و پیمانہ خالی

چلو اللہ کا شکر ہے گھر خالی نہیں۔ ہاں محمود شام کی حمد نے رُلا دیا ہے۔

درس گاہوں پر ہیں غالب وحشتیں ویرانیاں
بند ہیں رحمت کے در ہم کھٹکھٹا سکتے نہیں

سچی بات ہے ہمیں تو اِس نیو ورلڈ آرڈر کے قصابوں نے گزشتہ دہائیوں سے جس خوف اور عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے، اس نے ہی ہمارا ستیاناس مارا ہوا تھا۔ اب بیچ میں اِس کمبخت مارے کرونا ورلڈ آرڈر کی کمی رہ گئی تھی کہ یہ بھی اپنا لُچ تلنے آ گیا۔ اب بندہ پوچھے کہ کیا یہ بھی اِن قصابوں کی کوئی سازش ہے؟ ویسے تو سپر پاور کے بڑے بڑے گماشتے بذاتِ خود اعتراف کرتے ہیں کہ جب وہ کوئی کام کرتے ہیں تو اس کے ہونے کا جواز پیدا کر لیتے ہیں اور جب دنیا اُن کے الفاظ کی بھول بھلیوں میں اُلجھ رہی ہوتی ہے، ان کی ترجیحات کا رخ بدل جاتا ہے۔ وہ یعنی (امریکی) تاریخ کے اداکار ہیں اور لوگ (یعنی دنیا) صرف یہ جاننے میں ہی لگی رہتی ہے کہ ہم کر کیا رہے ہیں؟

اب یہ بھی ان کی سازش کا حصّہ ہے یا پھر سب سے بڑی سپر پاور اپنے بلونگڑوں بچونگڑوں کو تھوڑا سا جھٹکا دے رہی ہے کہ پھٹے پڑ رہے تھے۔ فلسطین، عراق، شام، افغانستان میں ان کے عزائم نے کیا کیا نہ ستم ڈھائے۔

شام کا وہ عظیم انقلابی شاعر جس کی نظم "میں دہشت گردی کا حامی ہوں۔" (I Am With Terrorism) بے اختیار یاد آ گئی ہے۔

جب تک نیو ورلڈ آرڈر
امریکا اور اسرائیل کے درمیان منقسم رہتا ہے
یہ میرے بچوں کا خون کرتا رہے گا
ان کے ٹکڑے کتوں کے آگے ڈالتا رہے گا
جب تک یہ نئی دنیا قصاب کی گرفت میں ہے
میں دہشت گردی کا حامی ہوں اور رہوں گا

ابھی تو شاعر نائن الیون کی تباہ کاریاں دیکھنے سے پہلے ہی رُخصت ہو گیا تھا۔ فلسطینیوں کے انتفادوں نے ہی اُس کے تن من میں آگ لگا رکھی تھی جس کے اظہار کی انقلابی گونج مشرق وسطیٰ کیا پوری دنیا میں بلند ہوئی تھی۔ امریکا کے ایوانوں میں کھلبلی مچی تھی۔ جیتا رہتا تو نائن الیون پر جانے کتنے بین لکھ مارتا کہ بغداد کے اسپتالوں کے مناظر نے مجھ جیسی کا حشر نشر کر دیا تھا۔

انسانیت بستروں پر لیٹی بلک رہی تھی۔ جی چاہتا تھا امریکا کو کچا چبا جاؤں۔ آگ لگا دوں۔ کمزور کی اوقات کیا، اس کے غُصے کی حقیقت کیا۔ سارا شور طاقتوں کی سپر میسی کا۔ ایک دوسرے پر الزام تراشیاں۔ دو تجارتی حریف۔ حال کی

سُپر پاور اور مستقبل کی بظاہر جگہ لیتی طاقت۔ کس کس کی منصوبہ بندی، پہل کہاں سے ہوئی؟ کس نے کس کو نشانہ بنایا؟ حقائق تو کھل جائیں گے لیکن تھوڑا وقت لگے گا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ طاقت کے اِس کھیل میں اپنے لوگوں کو مروانا بھی تو پروگرام کا حصّہ ہی ہوتا ہے۔

یہ تو ہوئیں دل اور دنیا کی باتیں۔ اب کچھ گھر کی باتیں بھی سُن لیں۔

شروع کے دنوں میں طبیعت لکھنے اور نہ پڑھنے پر مائل ہوتی تھی۔ دنیا کی بے ثباتی کا عجیب سا رنگ مزاج پر سایہ کیے ہوئے تھا۔ حمید شاہد کی پوسٹ دیکھی۔ کچھ ایسے ہی جذبات کا اُن کے ہاں بھی اظہار تھا۔ آصف فرخی نے فوراً نوٹس لیا۔ انھیں جوابی برقی پیغام بھیجا۔ چلیے اُن کی دیکھا دیکھی ہمیں بھی حوصلہ ہوا۔

وہ تو لائقِ فائق بندے لیپ ٹاپ پر بیٹھ گئے۔ سعادت مند بیٹے نے دروازوں، کنڈیوں کی ساری ذمہ داری سنبھال لی۔ ہم کیا کرتے؟ سارے زمانے کے اناڑی۔ کمپوزروں کے محتاج۔ وہ جیسے چاہیں ہمیں بے وقوف بنائیں۔ اولاد نے حکم امتناعی جاری کر دیا تھا کہ باہر نہیں جانا۔ اب کمپوزر کو بلایا۔ ملازم کو بھیجا۔ کاغذ لے کر جاؤ۔ ٹائپ کروا کر لاؤ۔ وہ دو گھنٹے بعد آیا۔ ڈیٹونول بارے بتایا کہ جتھے میڈیکل سٹوروں پر پھرا، نہیں ملا۔ اب کاغذ اٹھا کر چولہے پر جاتی ہوں۔ دفعتاً جنابِ حفیظ طاہر یاد آئے جنھوں نے بتایا تھا کہ میں کاغذوں اور کرنسی نوٹوں پر استری پھیر لیتا ہوں۔ بس تو انھیں استری کی بھٹی میں پکاتے ہوئے خود سے کہتی ہوں کہ پروردگار میں کیا اور میرے حفاظتی بند کیا؟ بس مولا میں تو اپنی سی تدبیر کر رہی ہوں۔ صابن سے تو انھیں نہلانے سے رہی۔ ڈیٹونول کا تجھے پتا چل ہی چکا کہ غائب ہے۔ اپنے حساب سے جراثیموں کو مار رہی ہوں۔ بس مریل سا۔ میرا تو اوٹ بھی کمزور، میرا رسہ کمزور اور کھونی بھی نکی سی اور میں بڑی مست الوجود۔ میں کس کو ہاتھ نہ لگاؤں؟ کتنی بار۔ باقی تو بچانا اور مارنا تیرے ہاتھ میں ہے۔ رحم مانگتی ہوں۔

رات کو دیکھ رہی تھی جاوید چودھری کو، وہ جو ایک ایرانی سو سالہ خاتون اور کرمان کا بوڑھا مرد دونوں صحت یاب ہو گئے۔ مغربی میڈیا بھاگا پھرتا تھا کہ کیسے بچے؟ خاتون نے بس ایک بات کہی۔

''مجھے خدا کی حفاظت پر پختہ یقین تھا۔ میں ہر روز کہتی تھی۔ مجھے کرونا سے نہیں مارنا۔ میرا ایمان ہے کہ میری پکار رائیگاں نہیں جائے گی۔'' بس تو اِس یقین اور اعتماد کو قائم رکھنا۔ میرا ایمان مضبوط ہوا۔

صبح اسکول کے لیے نکلی۔ منڈی گئی پھل خریدا۔ سبزیاں خریدیں۔ پیاز دکان پر ہی بھول آئی۔ اب ہاتھ دھوتی ہوں اور دعائیں مانگتی ہوں۔ کمپوزر نے کاغذ ٹائپ کر کے دیے ہیں تو انھیں زبان کے لعاب سے انگلی گیلی کرتے پلٹ دیتی ہوں۔ چیخیں چلاتی ہے۔ ''اے ہے بوجان! کیا کر رہی ہیں؟ صابن سے ہاتھ دھوئیں۔ اٹھتی ہوں، ہاتھ دھوتی ہوں، چہرہ دھوتی ہوں مگر تھوڑی دیر بعد پھر وہی حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔

پروردگار بس ہمیں تو تیرا سہارا۔ بگڑے تگڑے ہوئے ہیں۔ کہیں ہنگامی اذان ہو رہی ہے۔ پروردگار کچھ پاس نہیں۔ بڑے الّلے بلّلے لوگ ہیں۔ بس صرف تیرا رحم درکار ہے۔

انسانیت کا عکس ''ماں''

☆ میں زندگی کی کتاب میں سوائے ''ماں'' کے اور کسی کی تصویر نہیں دیکھتا۔ (ڈاکٹر ہیوگو)

☆ ہر شخص انسانیت کی حقیقی تصویر اپنی ''ماں'' کے چہرے پر دیکھ سکتا ہے۔ (اکبر اعظم)

☆ دنیا کی تمام مسرتیں پیارسے ''ماں'' کہتے ہی مل جاتی ہیں۔ (نادر شاہ)

عافیہ مقبول جہانگیر

پوچھیے تو مجھے کورونا جیسی وبا نے خوفزدہ کیا نہ لاک ڈاؤن سے میری زندگی میں کوئی بڑی تبدیلی آئی۔ کیونکہ میں عدت کے لاک ڈاؤن میں مقید شاید قرنطینہ کی شکر گزار تھی جس نے مجھے وقت بے وقت لوگوں کی آمد، ہمدردی کے مخمل میں لپٹے مگر پتھر کی طرح لگتے اظہارِ افسوس جیسے رسمی جملوں اور مگرمچھ کے آنسوؤں سے بچائے رکھا۔ میری یک دم ڈگمگا جانے والی زندگی کو سہارے کے لیے نام نہاد رشتے داروں کی روایتی

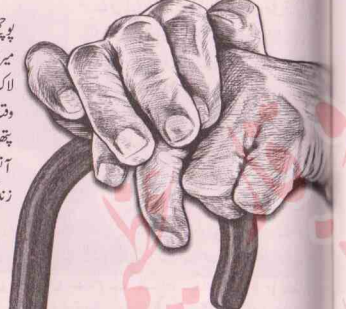

اگر زندہ رہے...؟

ملی نہیں پناہ ہمیں جس زمین پر
اک حشر اس زمین پہ اُٹھا دینا چاہیے

گزشتہ چند ماہ سے کورونا اور پھر لاک ڈاؤن نے سماجی اور معاشرتی زندگی تقریباً مفلوج کیے رکھی۔ میرے شب و روز تو پہلے ہی تقریباً دنیاوی معاملات سے گریز اں ایک کمرے میں گزر رہے تھے۔ میں کورونا کو کیا روتی کہ میرے پاس رونے کے لیے شوہر کا داغِ مفارقت دے جانا ہی کافی تھا۔ سچ

مغرب سے آئی ایک ''بدعت'' وبا کی صورت وطنِ عزیز کو بھی اپنی لپیٹ میں لے چکی

لاگاوٹ کی قطعاً ضرورت نہ تھی سوائے وہ چند ایک جو میرے انتہائی قریبی اور میرے دکھ میں واقعی شریک تھے اور جنہیں دکھاوے اور لفظوں کے سہارے کی چنداں ضرورت نہ تھی کہ میرا غم ان کا بھی تھا اور میرا ناقابلِ تلافی نقصان انھیں بھی نڈھال کر گیا تھا۔ لوگ کرونا کے خوف سے خاموش تھے اور میں..... خاموش!

وقت کا کام ہے گزرنا سو گزرتا گیا اور مجھے ایسے کڑے وقت میں گھر میں دفتری مصروفیات جاری رکھنے اور ادارے کی بھرپور حوصلہ افزائی کے صحیح معنوں میں سہارا ملا کہ مجھے ۴ مہینے کی مدت میں کسی قسم کی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا نہ انھوں نے مجھے کسی قسم کے ذہنی دباؤ سے دوچار ہونے دیا۔ یوں سب نے میرا بھرپور ساتھ دیا اور یہ مشکل وقت میں نے سب کی دعاؤں کے سہارے گزار لیا۔

***

کوویڈ ۱۹ اور لاک ڈاؤن اور پھر اندرون و بیرونِ ممالک کی ہولناک دل دہلا دینے والی خبریں سامنے آتی رہیں اور بار بار دل مچلتا رہا کہ میں کچھ حساس موضوعات پر قلم اُٹھاؤں۔ لکھنے بیٹھتی تو لگتا الفاظ ساتھ چھوڑ گئے اور دماغ میں کچھ یادیں کچھ باتیں گردش کرنے لگتیں اور میں تھک ہار کر قلم واپس رکھ دیا کرتی۔

ان دنوں میں سب سے زیادہ خوفناک حقائق یہ سامنے آئے کہ جب مصیبت اور کسی وبا کا سامنا کرنے کی باری آئی تو نام نہاد انسانیت کی پہلی ترجیح کیا تھی؟ کسے ترجیحاتی بنیادوں پر بچایا جائے؟ بچے، بزرگ یا جوان؟ اور اس حقیقت پر دل کٹ کر رہ گیا کہ ہماری ترجیحات میں بزرگ کہیں شامل نہیں۔ وہ بزرگ، جنہوں نے ہمیں پالا پوسا، ہمیں اس قابل بنایا کہ آج ہم ڈاکٹر، سائنسدان اور انجینئر بن کر یہ فیصلہ کرنے کے "قابل" ہو چکے کہ اگر مصیبت آئے تو ہمیں کس کو فوقیت دینی ہے؟ بزرگ تو اپنی زندگی گزار چکے، زندگی کی تمام اونچ نیچ، خوشیاں غم دیکھ چکے، تو انھیں اب جینے کا کوئی حق نہیں لہٰذا محدود وینٹی لیٹر صرف جوانوں کے نام کیے گئے۔ اور بچے.....؟ ان کا کیا ہے؟ زندگی رہی تو اور پیدا ہو جائیں گے۔ اصل میراث اور اثاثہ بس نوجوان ہیں۔ واہ ری انسانیت۔

یہ بات کورونا اور لاک ڈاؤن سے شروع نہیں ہوئی۔ اس وبا کی بدولت تو صرف انسانیت کا کریہہ چہرہ کھل کر سامنے آیا ہے جبکہ بزرگوں کے ساتھ اس ناانصافی اور غیر انسانی سلوک کی شروعات تو تب ہی ہو گئی تھی جب دنیا میں پہلا "اولڈ ہوم" وجود میں آیا تھا۔

اولڈ ہوم کی شروعات

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ شروعات 1795ء میں ہوئی جب شمال مغربی ممالک میں نابینا، محتاج اور بے سہارا بزرگوں کی دیکھ بھال کے قوانین وجود میں آئے۔ اس قانون کے تحت ہر بوڑھے، کمزور اور بے سہارا افراد کی دیکھ بھال کی ذمہ داری صرف ایک فرد یا خاندان نہیں بلکہ پورے معاشرے پر عائد ہوتی تھی۔ 1796ء میں امریکا کا شہر کلیولینڈ جب وجود میں آیا تو اس قانون کے تحت انیسویں صدی کے اوائل کے دوران، کلیولینڈ کے محتاجوں بشمول بوڑھوں سمیت، کی امداد بنیادی طور پر روایتی ذرائع، خاندانی، نجی احسان اور عوام کے ذریعے کی جاتی رہی۔

پہلے اولڈ ہوم کا قیام

انیسویں صدی کے اوائل تقریباً 1855ء میں اس قانون میں تھوڑا ردّوبدل کیا گیا۔ ساتھ ہی معذور، غریب، بے کس بوڑھوں اور پاگل افراد کی مستقل دیکھ بھال کے لیے ایک چھوٹا سا مقامی گھر وجود میں آیا۔ یہ گھر "لٹل سسٹرز آف دی پوور" (Little Sisters Of The Poor) کی معاونت سے بنایا گیا۔

لٹل سسٹرز ادارے کا آغاز 1839ء میں فرانس میں ہوا۔ سات بہنیں مئی 1870ء میں کلیولینڈ آئیں اور ایک ریسٹ ہاؤس کی بنیاد رکھی۔ یہ 1868ء سے 1872ء کے درمیان آرڈر کے ذریعے کھولے جانے والے 13 امریکی گھروں میں سے ایک تھا۔ اس میں صرف 12 افراد رہائش پزیر تھے۔ 1871ء میں یہ بہنیں مزید بڑے گھر میں قیام پزیر ہوئیں جہاں اب افراد کی تعداد 63 ہو چکی تھی۔

عمر رسیدہ لوگوں کا یہ گھر 1877 میں اور پھر 1890 میں اور پھیل گیا۔ 1896 میں 16 راہباؤں نے اس میں رہنے والے 100 مردوں اور 98 خواتین کے لیے کھانا، لباس اور نرسنگ کیئر فراہم کی۔ اس گھر میں کسی بھی نسل، مذہب یا فرقے کے لوگ رہ سکتے تھے صرف ان کا بے سہارا اور غریب ہونا ضروری تھا اور جو جرائم پیشہ نہ ہوں۔

تاریخ یہی کہتی ہے کہ بے سہارا اور لاچار بوڑھوں کے لیے اس خدمت کا سلسلہ شروع ہوا جو اپنی اصل ہیئت اور مقصد سے بٹتے بٹتے آج محض روایت، کلچر یا آزادی سے زندگی گزارنے والوں کی ضرورت بن چکا۔ کوئی بھی نیا کام یا اقدام ہمیشہ معاشرے کی بھلائی اور مثبت پہلوؤں کو مدِنظر رکھ کر ہی شروع کیا جاتا ہے۔ یہ تو ہم جیسے خود غرض انسان اُن نیک لوگوں کی تمام محنت اور بھلائی کا ناجائز فائدہ اُٹھاتے ہوئے ایک نیک مقصد کو قابلِ نفرت عمل میں بدل دیتے ہیں۔

یورپ میں اولڈ ایج ہوم کیوں بڑھتے گئے؟

یورپ کی ترقی سے کسی کو انکار نہیں مگر یہ ترقی کس حد تک

اخلاقیات پر پورا اُترتی ہے، سوچنے کا وقت کسی کے پاس نہیں۔ ترقی یافتہ ممالک نے ہماری اچھی چیزیں اپنا لیں اور ہم نے ہمیشہ ان کی بری عادتیں اپنانے میں فخر محسوس کیا۔

> جب مصیبت اور کسی وبا کا سامنا کرنے کی باری آئی تو نام نہاد انسانیت کی پہلی ترجیح کیا تھی......؟ ہماری ترجیحات میں بزرگ کہیں شامل نہیں آخر کیوں......؟؟؟

غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ یورپی ممالک نے سائنس و جدید علوم میں تو بے پناہ ترقی حاصل کر لی مگر اس ترقی سے انسانیت کا معیار کہیں نہ کہیں نیچے گرتا چلا گیا۔ دن رات کام کرنے کی دُھن میں مگن یہ اقوام خاندانی ترجیحات کو پیچھے چھوڑتی چلی گئیں۔ ان کے لیے زندگی صرف پیسہ کمانا، عیاشی کرنا اور ہر من چاہی چیز دولت سے حاصل کرنے کا دوسرا نام بن گئی۔ ایسے میں انھیں کسی قانونی و معاشرتی بندھن میں بندھے رہنا پسند رہا نہ جنم دینے والے ماں باپ کی اہمیت کا احساس۔

جدید تعلیم و ترقی اخلاقیات سے عاری

جدید علوم اور سائنس نے انسان کو خلاء میں چلنے کا ہنر تو سکھا دیا، لیکن والدین کے ساتھ کیسا برتاؤ کرنا چاہیے؟ انسان اس ہنر اور سلیقے سے عاری رہ گیا اور ہم جیسے ناسمجھ، دین سے دور کم عقل، ان کی تقلید میں اپنے دین کے احکامات اور قرآن کی تعلیمات اور سنت نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و یکسر فراموش کر بیٹھے۔ یورپ میں جو کتابیں اخلاقیات کے نام پر اسکولوں میں پڑھائی جاتی ہیں اس میں والدین کے حقوق کے تعلق سے کوئی باب نہیں لیکن ہمیں تو شعور کی آنکھ کھلتے ہی نصابی اور غیر نصابی کتب نے ہمیشہ اپنے والدین، بزرگوں کی خدمت کرنے کا درس دیا اور اسی میں ہماری ترقی مضمر ہے۔ اب حال یہ ہے کہ ان یورپی ممالک کی تقلید میں ہماری حالت دھوبی کے کتے جیسی ہو چکی جو گھر کا نہ گھاٹ کا رہا۔

ہم ترقی بھی حاصل نہ کر سکے اور بزرگوں کی خدمت ٹھکرا کر اللہ کی ناراضی بھی مول لیتے ہیں اور دعاؤں کی راہیں بھی کھوٹی کر رہے۔ ہاتھ میں کچھ نہیں اور نعرے ترقی کے لگاتے ہیں۔

ہم بھول چکے کہ اخلاقیات کا علم صرف اللہ کی کتاب اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت میں مضمر ہے۔ جسے ہم یکسر فراموش کرتے جا رہے۔

بزرگوں سے دوری...... آزادی یا بربادی

مادر پدر آزاد اقوام کا ماننا ہے کہ مشترکہ خاندانی نظام ان کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنتا ہے۔ والدین، جو اپنی عمر گزار چکے اور جنھوں نے اپنی اولاد کو پال پوس کر کسی مقام تک پہنچایا وہ ان کا احسان نہیں بلکہ فرض اور محض ڈیوٹی تھی کیونکہ انھیں پیدا کرنے کے ذمہ دار بھی وہی تھے تو احسان کیسا؟

۱۸ سال کی عمر تک پہنچ کر ایک بچہ قانوناً خود مختار ہو جاتا ہے کہ اسے والدین سے الگ رہنے اور اپنے فیصلے اپنی مرضی سے کرنے کا پورا اختیار دیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ انسانیت اور اخلاقیات کا پرچار کرنے والی یہ اقوام بچے کو یہ حق بھی دیتی ہیں کہ اگر ماں یا باپ میں سے کسی نے اسے تھپڑ مار دیا تو وہ ان کی رپورٹ درج کروا کر سزا بھی دلوانے کا مجاز ہوتا ہے۔

جیسا کرو گے ویسا بھرو گے

کیا یہ انسان کی آزادی اور ترقی ہے یا اخلاق کے معیار کی سب سے کمتر سطح کو چھوتی ہوئی بے حیائی؟ ان ممالک کے نوجوان اپنے والدین پر ہاتھ اُٹھانے سے بھی دریغ نہیں کرتے کہ قانوناً انھیں شہ ملی ہوئی ہے کہ وہ اپنی مرضی کی آزاد زندگی گزارنے کے حقدار ہیں۔ وہ اپنے بوڑھے ماں باپ کو بوجھ سمجھتے ہیں اور اپنی آزادی میں رکاوٹ اور پھر وہ انھیں اولڈ ہوم میں داخل کروا دیتے ہیں تا کہ ان کی بے جا روک ٹوک اور ذمہ داری سے بچا جا سکے۔ وہاں کے بزرگ ذہنی طور پر اس

بات کے لیے تیار بھی ہوتے ہیں کیونکہ جو بوؤ گے وہی کاٹو کے مصداق انھوں نے بھی اپنے والدین کے ساتھ یہی کیا تھا اور یہ وہاں کا کلچر بن چکا تو وہ ان کے لیے معیوب بات نہیں مگر ہم......؟ ہم کس راستے کے مسافر ہیں؟

ہمارے باپ دادا نے تو اپنے والدین کو کسی اولڈ ہوم میں نہیں بھیجا تھا؟ انھوں نے تو راتوں کو جاگ جاگ کر ہمیں پالا، ہمارے لیے رب کریم سے دعائیں مانگیں، ہمیں اپنی دعاؤں اور کانپتے بوڑھے ہاتھوں سے سر پر محبت بھرا لمس دے کر گھروں سے باہر بھیجا۔ ماؤں نے ہماری سلامتی کے لیے دن رات اللہ کے حضور دعائیں مانگیں۔ ہم انھیں کس بات کی سزا دے رہے؟

پاکستان میں اولڈ ہومز کی بڑھتی تعداد

مغرب کے ٹوٹے پھوٹے خاندانی سسٹم کے باعث جہاں بزرگ والدین کو اولڈ ایج ہومز میں داخل کرانے کا رجحان اپنے عروج پر ہے وہیں اب یہ ''وبا'' پاکستان میں بھی عام ہو چکی۔ وطنِ عزیز میں اولڈ ایج ہومز کی شروعات بھی انھی مقاصد کو ذہن میں رکھ کر کی گئی تھی جو مقاصد لٹل سسٹر آف دی پوورز کے تھے یعنی اُن بے سہارا، بیمار، محتاج غریب بزرگوں کی دیکھ بھال اور حفاظت اور گھر جیسا ماحول دینے کی سعی کرنا جن کا اپنا کوئی موجود نہ ہو۔

بڑھتے بڑھتے یہ تعداد اب ایک دو سے کئی سو تک تجاوز کر چکی۔ قابلِ افسوس بات یہ کہ اب ان میں رہائش پزیر بزرگوں میں سے بیشتر کی جوان برسرِ روزگار اور کامیاب اولاد موجود ہوتی ہے اور وہ اولڈ ہوم میں رُلتے زندگی کے آخری دن انتہائی بے بسی اور دکھوں کے جھولے ہنڈولتے گزارتے ہیں۔

کمزور بینائی والی بوڑھی آنکھوں میں جوان اولاد اور پوتے پوتیوں کے چمکتے چہرے نہیں بلکہ صرف ان کے ناختم ہونے والے انتظار کی اذیت ناک کیفیت موجزن ہوتی ہے۔ یہ وہ بدنصیب ہیں جنھیں آج کی نئی نسل، اپنی گھر گرہستی شروع کرتے ہی کسی کاٹھ کباڑ کی طرح اولڈ ایج ہومز میں پھینک آتی ہے۔

یورپ سے مستعار لی ہوئی برائیوں میں سے یہ شاید سب سے بھیانک، بدصورت اور کڑوی تلخ سچائی پر مبنی برائی ہے۔ ہم بہت فخر سے کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں اولڈ ایج ہومز کا معیار اور ماحول بہترین ہے۔ میرا یہ سوال ہے کہ ہمیں یہ کہنا ہی کیوں پڑتا ہے کہ ہمارے یہاں اولڈ ایج ہومز ہیں۔ بحیثیت مسلمان، ہم یہ کہتے ہوئے شرم سے مر کیوں نہیں جاتے۔

مسلمان ہونے کے ناتے اور سب سے بڑی بات کہ ایک اسلامی ملک کے شہری ہونے کے ناتے، وہ ملک جو کلمے کے نام پر حاصل ہوا، اس میں اولڈ ایج ہوم کا پایا جانا اس معاشرے کے ماتھے پر ہمارے کردار اور ہم سب کے مسلمان ہونے پر سب سے بڑا سوالیہ نشان ہے۔ جو ملک بنا ہی اسلام کے نام پر ہو، وہاں اولڈ ایج ہوم کی موجودگی کا مطلب ہمارے مذہب اسلام اور نبی پاکؐ کی تعلیمات اور احکامات سے انحراف کرنا ہے۔ یورپی باشندوں، عیسائیوں، یہودیوں، کافروں کو کیا معلوم کہ والدین کی خدمت کا کتنا بڑا اجر اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے رکھا اور جنت کی بشارت ماں کی خدمت اور اس کے قدموں تلے رکھ کر دی گئی۔ پھر ہم کیسے اولڈ ایج ہوم تک پہنچ گئے؟

اولاد کا والدین کے ساتھ نامناسب رویہ

کورونا کی وبا نے جب لاک ڈاؤن کی صورتِ حال سے دوچار کیا تو کئی نوجوانوں کو اس تکلیف کا ادراک ہوا جو وہ کئی

برسوں سے اپنے بوڑھے والدین کو تنہائی اور بند کمرے تک ان کی زندگی مقید کر کے، انھیں دیتے چلے آ رہے تھے۔ اولاد کے پاس اپنے بزرگوں کے ساتھ غیر مناسب اور قابل افسوس رویہ روا رکھنے کی ''وجوہ'' کئی ہیں۔

☆وقت کی کمی

آج کل تیز رفتار زمانے کے ساتھ بھاگنے کی کوشش میں ہلکان ہوتے نوجوانوں کے پاس وقت کی کمی کا رونا بہت عام سی بات ہے۔ وہ محض پیسہ کمانے کی مشین بن چکے۔ دولت کی ہوس اور ہر ایک سے آگے نکلنے کی دوڑ میں شامل ہونے کا لالچ انھیں اپنے والدین، اپنے رشتوں سے دور کر رہا ہے لیکن ابھی وہ اس کی سنگینی سے واقف نہیں۔ اپنے والدین اور بچوں کو نظر انداز کر کے اندھا دھند پیسہ کمانے والے بل کو جب بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھیں گے تو انھیں اپنے والدین کی تنہائی کا احساس ہوگا اور تب ان کی اولاد انھی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے انھیں بھی کسی اولڈ ہوم میں داخل کروا آئے گی۔

☆سوشل میڈیا اور جدید ٹیکنالوجی کا بے جا استعمال

جدید ایپلی کیشنوں، موبائل کے سستے پیکجز، انٹرنیٹ کا چسکا، فیس بک، انسٹا، ٹوئٹر بہت وسیع دنیا رکھتے ہیں۔ انھیں استعمال کرنے والا کئی کئی گھنٹے اس میں صرف کرتے ہوئے اپنے اردگرد کے ماحول اور بڑوں سے لاتعلق ہو جاتا ہے۔ نئے نئے ڈیجیٹل دوست بنانے کے چکر میں وہ رب کے عطا کردہ خوبصورت رشتوں کو نظر انداز کرنا شروع کر دیتا ہے۔ مدرز ڈے، فادرز ڈے جیسے اور بے شمار دن وہ انٹرنیٹ پر تو مناتا ہے مگر پاس بیٹھے ماں باپ سے بات کرنا فضول سمجھتا ہے۔

☆خود غرضی اور بے حسی

بزرگ والدین کو نظر انداز کرنے اور انھیں بوجھ سمجھنے کی ایک وجہ معاشرے میں پھیلتی خود غرضی اور بے حسی بھی ہے۔ آج کی نسل ہر رشتے کو اپنے مطلب اور کامیابی کا ذریعہ سمجھتے ہوئے استعمال کرنے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتی۔ جب وہ کسی کام کے نہیں رہتے تو انھیں دودھ میں سے مکھی کی طرح نکال باہر کیا جاتا ہے۔ جن والدین نے اپنی ساری عمر اولاد کے نام کر دی، ان کو بہترین زندگی کی، ان کی تعلیم پر پیسہ لگایا انھیں کسی مقام تک پہنچایا کراہ وہ چونکہ ریٹائر، بوڑھے اور بیمار ہو چکے تو ایسے والدین اولاد کے لیے صرف ذمہ داری یا بوجھ بن کر رہ جاتے ہیں اور اولاد انھیں ناکارہ پرزہ سمجھ کر اولڈ ایج ہوم بھجوا دیتے۔

ڈیجیٹل رشتوں نے اولاد کو والدین کے اصل مقام و اہمیت سے بے نیاز اور محروم کر دیا ہے

کچھ بزرگ ایسے بھی ہیں جو خود ہی اولاد کے ہاتھوں تنگ آ کر اولڈ ہوم جانے کو ترجیح دیتے ہیں جبکہ کچھ کو اولاد زبردستی یا بہلا پھسلا کر چھوڑ آتی ہے اور پھر مڑ کر ان کی خبر نہیں لیتی۔

ترقی یافتہ ممالک میں کورونا اور بزرگ شہری

کورونا کی وبا میں بھی بزرگوں کو بُری طرح نظر انداز کیا گیا۔ کئی ممالک میں اس سے متعلق بدترین صورتحال دیکھنے کو ملی جو نہ صرف ایسے ممالک کی ترقی کے منہ پر کالک کے مانند ہے بلکہ ان مہذب ملکوں میں انسانیت کا پرچار کرنے کے نعروں کا پول بھی کھل گیا۔

> جدید علوم اور سائنس نے انسان کو خلاء میں چلنے کا ہنر تو سکھا دیا مگر انسانیت کے مقام سے گرا دیا

ان میں سویڈن، برطانیہ، اٹلی، امریکا جیسے اور کئی ممالک بھی شامل ہیں جہاں کورونا کے علاج میں نوجوانوں کو بزرگوں پر ترجیح دی گئی اور انھیں کسی بھی قسم کی سہولیات یا آکسیجن اور وینٹی لیٹر تک مہیا نہ کیے گئے۔ سویڈن جو ترقی یافتہ و مہذب ممالک کی فہرست میں فوقیت رکھتا ہے، وہاں اولڈ ہوم میں جن بوڑھے لوگوں کو اس وبا نے آن لپیٹا، ان کا سرے سے علاج ہی نہ کروایا گیا اور نہ ہی ان کی آخری رسومات کے بارے میں کسی کو اطلاع دی گئی۔ انھیں سسک سسک کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ سویڈن کے وزیر اعظم نے اعتراف کیا کہ ان کا ملک بزرگوں کے لیے اقدامات کرنے میں ناکام رہا۔ یہ اعتراف ایک ترقی یافتہ ملک کے منہ پر طمانچہ ہے۔ کبھی سویڈن بزرگوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنے والے بہترین ممالک کی فہرست میں اوّل نمبر پر تھا اور شرم کی بات یہ کہ بدترین ممالک میں ہمارا پیارا پاکستان تیسرے اور چھٹے نمبر کے درمیان قلابازیاں لگاتا رہتا ہے۔

ابھی تک سویڈن میں کورونا وائرس سے ہلاک ہونے والے 6,698 افراد میں سے زیادہ تر کی عمر ۷۰ برس کے قریب تھی۔ مزید برآں سویڈش پبلک ہیلتھ ایجنسی نے بی بی سی کو دی گئی رپورٹ میں بتایا ہے کہ ۱۴ مئی ۲۰۲۰ تک ہونے والی اموات کا 9.48 فیصد اولڈ ہومز میں رہائش پزیر ہے۔

اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ۳۱ مارچ سے سویڈش حکومت نے اولڈ ایج ہومز کے دوروں پر سختی سے ممانعت عائد کر دی تھی اور وہاں بیمار ہوئے بزرگ مریضوں کو بچانے یا ان کی دیکھ بھال کرنے ڈاکٹروں کا کوئی عملہ نہ گیا۔ یہ بے حسی اور مردہ معاشرے کی جیتی جاگتی اور بدترین مثال ہے۔

حال ہی میں برطانیہ کے بارے میں ایک رپورٹ میں روح فرسا انکشاف یہ سامنے آیا ہے کہ وہاں کورونا سے مرنے والے بزرگوں کی اموات کا اندراج تک نہیں کیا گیا۔ گویا انھیں سرے سے انسان کا درجہ ہی نہ دیا گیا۔ یہ وہ ممالک ہیں جہاں جانوروں کی زندگیوں کو بھی تحفظ حاصل ہے چاہے وہ ایک کتا ہی کیوں نہ ہو اسے گھر کے دوسرے افراد جتنی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ جو مالکان کے ساتھ ان کے بستر میں سوتے، گاڑی کی اگلی نشست پر بیٹھتے اور کھانے کی میز پر ان کے ساتھ کھانا کھاتے ہیں لیکن انھی گھروں میں بوڑھے والدین کے لیے کوئی جگہ نہیں۔

ان ممالک کے شہری اپنے انجام سے باخبر ہوتے ہیں لہٰذا وہ تمام عمر کی اپنی پونجی اور مخصوص رقم بطور پنشن ایسے اداروں میں خود جمع کروا دیتے ہیں جہاں انھیں ریٹائرمنٹ کے بعد رہنا ہوتا ہے۔

اقوام متحدہ کی حالیہ رپورٹ کے مطابق 2050ء تک دنیا بھر میں معمر افراد کی تعداد دو ارب سے زائد ہو جائے گی۔ اور ایک تازہ ترین تحقیق سے یہ حقائق بھی سامنے آئے ہیں کہ جو لوگ بوڑھوں کے لیے منفی رویہ رکھتے ہیں، ان میں دل کی بیماریوں کے خدشات بڑھ جاتے ہیں۔

حدیث نبوی ﷺ ہے کہ جو جوان کسی بوڑھے کی سن رسیدگی کے باعث اس کی عزت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس جوان کے لیے کسی کو مقرر فرما دیتا ہے جو اس کے بڑھاپے میں اس کی عزت کرے۔

والدین اور اسلامی احکامات

اسلامی تعلیمات کا بغور مطالعہ کرنے سے ہمیں دو حقوق کا پتہ ملتا ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد۔ خدا کو ایک ماننا تنہا اس کی عبادت کرنا، نماز پڑھنا، روزے رکھنا وغیرہ یہ سب حقوق اللہ ہیں، والدین کے ساتھ حسن وسلوک، اولاد کے ساتھ رحم وکرم، یتیموں مسکینوں اور مریضوں کے ساتھ ہمدردی وغیرہ یہ سب حقوق العباد ہیں۔

تاریخ کہتی ہے کہ بے سہارا اور لاچار بوڑھوں کی خدمت کا سلسلہ شروع ہوا جو آج اپنی اصل ہیئت و مقصد کھو بیٹھا

قرآن اور والدین کے حقوق

حقوق العباد میں سب سے بڑا حق یہی ہے کہ والدین کے ساتھ اچھا سلوک اور برتاؤ کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ پروردگار عالم نے ایک طرف بندوں کو شرک سے روکا تو ساتھ ہی دوسری جانب ''ولاتقل لہما اف ولاتنہر ہما'' کا درس دیکر والدین کو اُف تک کہنے سے منع فرما دیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

ترجمہ: ''اور تمہارے رب نے حکم فرمایا کہ اس کے سوا کسی کو نہ پوجو، اور والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرو اگر تیرے سامنے ان میں سے کوئی ایک یا دونوں بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان سے اُف تک نہ کہنا اور نہ جھڑکنا اور ان سے تعظیم کی بات کہنا اور ان کے لیے عاجزی کا بازو بچھا نرم دلی سے، اور عرض کر کہ اے میرے رب! تو ان دونوں پر رحم کر جیسا کہ ان دونوں نے مجھے چھوٹے میں پالا۔ (سورہ بنی اسرائیل آیت، ۲۳، ۲۴)(۲)

دوسری جگہ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

''اور جب ہم نے بنی اسرائیل سے عہد لیا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ پوجو، اور والدین کے ساتھ بھلائی کرو''۔ (سورہ بقرہ، آیت، ۸۳)(۳)۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

''اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کا شریک نہ ٹھہراؤ اور والدین کے ساتھ بھلائی کرو''۔ (سورہ نساء آیت، ۳۶)

ان تمام احکامات کے بعد کیا کسر باقی رہ جاتی ہے کہ ہم والدین کے ساتھ اچھا سلوک کرنے میں کوتاہی کریں۔ خصوصاً جب ان کے اُوپر ضعف کا غلبہ ہو، اعضا میں قوت نہ رہے اور جیسے بچپن میں ہم ان کے پاس بے بس اور ان کے محتاج تھے، اُسی طرح آخر عمر میں جب وہ ناتواں ہو جائیں تو

ان کی مدد کریں اور انھیں اُف تک نہ کہیں یعنی ایسا کلمہ نہ نکالیں جس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کی طرف سے طبیعت پر کچھ گراں ہو۔

رسول کریم ﷺ کے ارشادات

والدین کے حقوق اور حسن وسلوک کے تعلق سے بے شمار احادیث کریمہ ہیں جن میں حضور ﷺ نے بہت تاکید کے ساتھ حکم دیا کہ اچھا سلوک کریں اور انھیں تکلیف نہ دیں۔

(۱) مشہور صحابیِ رسول حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ ایک شخص نے سرکار ﷺ سے پوچھا کہ بیٹے پر والدین کا کیا حق ہے؟''

آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا، یہ دونوں تیری جنت بھی اور دوزخ بھی، یعنی اگر تم ان کے حق میں رحم وکرم اور عجز و انکساری کے پیکر بن گئے تو تمہارے لیے جنت ورنہ دوزخ کے مستحق ہو گے (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۴۲)

(۲) حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ اپنے ماں باپ کا اطاعت شعار وخدمت گزار فرزند، جب ان کی طرف رحمت ومحبت کی نگاہ سے دیکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لیے ہر نگاہ کے بدلے میں حج مبرور کا ثواب لکھتا ہے، صحابۂ کرام نے پوچھا:

''یارسول اللہ! اگر چہ وہ ہر روز سو بار دیکھے؟ آپ نے فرمایا! ہاں، اگر چہ وہ سو بار دیکھے، اللہ تعالیٰ بڑا پاک اور بہت بڑا ہے (مشکوٰۃ شریف صفحہ ۴۲۱)

(۳) حضرت ابوبکرہؓ سے مروی ہے کہ سرکار ﷺ نے فرمایا کیا میں تمہیں تین بڑے گناہوں کی خبر نہ دوں؟ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا کیوں نہیں یارسول اللہ؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کے ساتھ شریک ٹھہرانا اور والدین کی نافرمانی کرنا، جھوٹ بولنا اور جھوٹی گواہی دینا۔

(۴) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور سرکار ﷺ

یہ ممکن نہیں تھا کہ ایسے حساس موضوع پر میں قلم اُٹھاؤں اور فاؤنٹین ہاؤس لاہور کے ایم ایس ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ اور مایہ ناز ماہر نفسیات اور اُردو ڈائجسٹ کے مستقل لکھاری ڈاکٹر فیاض ہرل میرا ساتھ نہ دیں۔

ان کی فراہم کردہ معلومات اور راہنمائی نے یہ مضمون لکھنے میں بے حد معاونت کی۔

ڈاکٹر سید عمران مرتضیٰ کا کہنا ہے کہ کلمے کے نام پر بنے اس پاک ملک میں اولڈ ایج ہومز کا تصور ہی روح فرسا ہونا چاہیے کجا یہاں اتنی بڑی تعداد میں ان کا پایا جانا، ہمارے لیے بحیثیت مسلمان، بہت شرمناک صورتحال اور اس بات کی غماز ہے کہ ہم اپنے رسول ﷺ کی تعلیمات اور دین اسلام کے احکامات یکسر فراموش کر بیٹھے۔

ڈاکٹر فیاض ہرل کہتے ہیں کہ یہ حقیقت بہت تکلیف دہ اور قابل افسوس ہے کہ ایک ماہر نفسیات کی خدمات تب حاصل کی جاتی ہیں جب انسان مکمل طور پر پاگل ہو چکا ہوتا ہے۔ جبکہ اسے اصل علاج اور ایک ماہر نفسیات کی ضرورت تب ہوتی ہے جب وہ تنہائی کے خول میں خود کو بند کر رہا ہوتا ہے۔ اس وقت لاک ڈاؤن اور بزرگوں کی ذہنی حالت کے پیش نظر انھیں سب سے زیادہ ایک ہمگسار اور ماہر نفسیات کی ضرورت ہے جو انھیں اپنائیت کا احساس دلا سکے اور انھیں کورونا اور لاک ڈاؤن جیسی آفات کے بارے میں بہتر گائیڈ کر کے انھیں الجھنوں سے بچا سکے لیکن کبھی اولڈ ہوم میں ہر نفسیات کو کونسلنگ کے لیے آج تک نہیں بلایا گیا۔ اقدمات تب کیے جاتے ہیں جب بات بگڑ چکی ہوتی ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے۔

☆☆☆

نے فرمایا: تین لوگوں کی دعا قبول ہونے میں کوئی شک نہیں۔ مظلوم کی دعا، مسافر کی دعا اور اولاد کے خلاف والدین کی دعا۔ لہٰذا اولاد کو چاہیے کہ ہمیشہ ایسی حرکت سے پرہیز کرے، جس کے سبب والدین کو اس کے خلاف بددعا کرنی پڑے اور والدین کو بھی چاہیے کہ حتی المقدور ان پر بددعا کرنے سے بچیں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعودؓ نے فرمایا کہ والدین کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔ کعبہ کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔ قرآن کی طرف دیکھنا عبادت ہے۔ بھائی کے لیے اللہ سے محبت کے سبب شفقت بھری نظر ڈالنا عبادت ہے۔

والدین کی ناراضی مول لینے پر وعید

جو والدین کو ناراض کرے ان کے حقوق کو ادا نہ کرے۔ ان کے بارے میں سرکار دو عالم فرماتے ہیں۔

"تین افراد ایسے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کے فرض کو اور نہ نفلوں کو قبول کرتا ہے ماں باپ کو ایذا دینے والا اور صدقہ دے کر احسان جتانے والا، اور تقدیر کا جھٹلانے والا۔

ماں کا حق باپ کے حق پر مقدم ہے۔

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ انھوں نے فرمایا: کہ ایک شخص حضور ﷺ کے پاس آیا اور پوچھنے لگا۔ "اے اللہ کے رسول ﷺ سب سے زیادہ کس کا حق ہے؟ کہ اس کے ساتھ حسن وسلوک کروں۔ آپ نے فرمایا: "تیری ماں کا۔" پوچھا، پھر کس کا؟ "آپؐ نے فرمایا: تیری ماں، پوچھا، پھر کس کا؟ آپ نے فرمایا تیری ماں کا۔ (مسلم شریف)

کیونکہ حمل وضع حمل اور دودھ پلانے کی شفقت اور صعوبت صرف ماں اٹھاتی ہے باپ نہیں۔ اس وجہ سے ماں کا حق زیادہ ہے۔

اولاد پر والدین کے حقوق بعد وفات:

اسلام کی تعلیمات میں جہاں بار بار دنیاوی زندگی میں والدین کے ساتھ حسن وسلوک کی تاکید کی گئی، وہیں دوسری طرف یہ درس بھی دیا کہ جب وہ دنیا سے چلے جائیں تو ان کے ساتھ حسن وسلوک کرو۔ ان کے لیے ہمیشہ دعاء واستغفار کرو، صدقہ خیرات واعمال صالحہ کا ثواب انہیں پہنچاتے رہو۔ ماں باپ کا وجود کتنی بڑی نعمت ہے اس کی قدر وہی جانتے ہیں جو اس نعمت سے محروم ہیں۔ اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا ہے کہ ہمیں والدین کی خدمت کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

نیم بسمل چھوڑ کر جاتے ہو تم افسوس ہے
سخت جاں کو کم سنی کے دن گنانے کے لیے
شام ہوتی ہے چلو گھر جاؤ اُٹھو رو چکے
قبر پر کیوں آ گئے ٹسوے بہانے کے لیے
بار خاموشی کا بسمل سے کب اٹھے گا بتوں
ڈھونڈ لو مزدور کوئی بوجھ اٹھانے کے لیے

(مزمل شیخ بسمل)

> یورپ سے مستعار لی ہوئی برائیوں میں سے یہ شاید سب سے بھیانک، بدصورت اور کڑوی تلخ سچائی پر مبنی برائی ہے۔

سماجی اور اخلاقی طور پر ہمارا معاشرہ کس طرف جا رہا ہے

انسانیت کہاں ہے؟

پڑھیے صفحہ 132 پر

عائشہ تنویر

شہرِ خرابات

ریل کی رفتار کم ہوتے ہوتے بالآخر رک گئی۔ منزل پر پہنچنے کی خوشی میں لوگ سفر کی تکان بھول گئے تھے۔ ڈبے کے ایک کونے میں کھڑا راجو خاموشی سے لوگوں کی دھکم پیل دیکھتا رہا۔ سب کو اُترنے کی جلدی تھی اور اس کا دل گاؤں میں اٹکا تھا۔ جانے کیوں دل کہہ رہا تھا کہ ریل سے اُترتے ہی گاؤں چھوٹ جائے گا۔ ایک لمحے کے لیے اس کا دل چاہا، یہیں سے واپسی کی گاڑی پکڑ لے مگر فوراً ہی سفر کی وجہ یاد آئی تو ڈگمگاتے قدم رُک گئے۔

"نہ جا راجو" رانی کا منت بھرا لہجہ ذہن میں گونجا تھا اور سرمے سے بے نیاز گہری کالی آنکھیں پردۂ دل پر یوں روشن ہوئیں کہ بے اختیار ہاتھ اس کے بہتے آنسو صاف کرنے کے لیے بڑھے تھے۔

"کراچی غریبوں کی ماں ہے رانی۔ تُو دیکھنا! میں کچھ بن کر آؤں گا تو چاچا جتنے میرے ساتھ بخوشی رخصت کر دے گا۔" وہ ہاتھ میں پکڑی قمیص ایک طرف پھینکتا اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

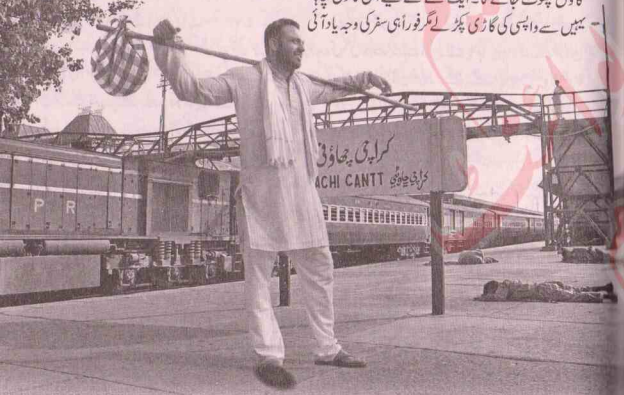

اُس بڑے شہر نے جب کھڑے ہونے کو زمین دی تھی تو کیا مرنے کو قبر نہ دیتا

اُس کا سامان ہی کتنا تھا۔ چار جوڑے کپڑے جنہیں وہ کبھی گھٹری کی طرح باندھتا تو کبھی پلاسٹک کی تھیلی میں بھرنے لگتا۔ رانی ایک چھوٹا سا سفری بیگ چاچی کی الماری سے نکال لائی لیکن جانے کی تیاری میں مدد کرتے ہوئے بھی اسے روکنے کی آخری کوشش کرنا نہ بھولی۔

''تُو تو پردیسی ہو گا راجو۔ آصف کی سوتیلی ماں کی طرح کراچی نے تجھے بھی سوتیلا سمجھ کر کھو دیا تو......؟'' خوف اور وسوسوں نے اس کی گندم کی بالیوں جیسی چمکتی رنگت ماند کر دی تھی۔ بے رونق، بجھی آنکھوں والا چہرہ اس کی رانی کا لگتا ہی نہ تھا۔

''تجھے مجھ پر اعتبار نہیں؟'' راجو نے آس بھرے لہجے میں پوچھا۔

''صرف تجھ پر ہی تو ہے لیکن بڑے شہر بہت ظالم ہوتے ہیں۔ رشتوں کو کھا جاتے ہیں اور کراچی...... وہاں کے تو حالات ہی خراب رہتے ہیں۔ آئے روز گولیاں چلتی ہیں۔'' رانی نے اس کی اُمید نہیں توڑی لیکن اِدھر اُدھر سے سنے قصے خوف بن کر لہجے میں چھلکنے لگے۔ وہ شاید اُسے بھی ڈرا کر جانے کے ارادے سے باز رکھنا چاہتی تھی۔ روشنیوں کا شہر اکثر ہی خبروں میں ماتم کرتا نظر آتا۔

راجو بے چارہ بھی آخر کیا کرتا؟ اسے بھی چوبیس گھنٹے جاگتے کراچی میں رہنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ وہ اپنے چھوٹے سے گاؤں میں بہت خوش تھا۔ جہاں سورج کا مغرب کی طرف سفر شروع کرتے ہی گاؤں کی گلیاں سنسان ہونے لگتیں اور عشاء کے بعد ہی گاؤں میں رات چھا جاتی۔ وہ خود نیند کا شیدائی تھا۔ فصل کو پانی لگانے جاتا تو آنکھیں نیند سے بھری ہوتیں۔ اس کا گاؤں ہی اس کی دنیا تھی اور اماں، ابا کے بعد چاچا ہی اس کا واحد رشتہ تھا۔ چاچی تھوڑی روکھی تھی مگر چاچا کی محبت اور آبائی زمین میں اس کے حصے کی وجہ سے اسے کچھ نہ کہتی۔ وہ چاچا کے ساتھ زمینوں پر سارا کام دیکھتا۔ سانجھا گھر اور سانجھی زمین سے آنے والی کمائی بھی سانجھی تھی۔

رانی سے چھوٹے کاکے کے لیے وہ بڑا بھائی اور رانی کے دل کا چین تھا۔ رانی اس کے بچپن کی منگ تھی۔ اگلی فصل پر ان کی شادی ہو جاتی اگر چوہدریوں کا بیٹا راہ چلتے رانی کی ہنسی کے سحر میں بندھ نہ جاتا۔ بچپن سے ہی چاچی اس بات پر غصہ کیا کرتی کہ راہ چلتے ہنسنے، بولنے سے بھوت چمٹ جاتے ہیں اور رات کو ڈراؤنے خواب آتے ہیں مگر رانی اس پر بھی ہنس دیتی۔

اسے اپنی محبت میں کسی کا دھڑکا نہ تھا۔ وہ بس خوابوں میں راجو کے سنگ اپنی جنت میں رہا کرتی۔ اسے کسی کا کیا خوف؟ پھر چوہدری کے بیٹے نے رانی کی آنکھوں سے سپنے نوچ کر وہاں وسوسے اور بے خواب راتیں سجا دیں۔ ان کی تعبیر مٹھی میں قید پرندے کی طرح اُڑ گئی تھی۔

ان کی زمین کم سہی مگر اپنی تھی۔ وہ کمی نہیں تھے۔ چوہدری بھی بہت بڑے وڈیرے یا جاگیردار نہ تھے مگر ان سے کئی گنا زیادہ زمین ضرور رکھتے تھے۔ چوہدریوں کا اکلوتا بیٹا پُرکھوں کی زمین چھوڑ کر شہر جا بسا تھا۔ وہ بیٹے کی جدائی برداشت کر پا رہے تھے اور نہ ہی زمینیں بیچنے کا حوصلہ پڑتا۔ بیٹے نے جب رانی کے ساتھ شادی کی تمنا ظاہر کی تو والدین کو آس بندھ گئی کہ گاؤں کی لڑکی اُن کے بیٹے کو اپنی مٹی میں واپس لے آئے گی۔

انھوں نے رشتہ نہیں مانگا بلکہ چاچا، چاچی کو بڑی ہوشیاری سے اونچ نیچ سمجھائی۔ رانی کی شادی راجو سے ہو جاتی تو ساری زمین پر راجو کا اختیار ہوتا۔ کاکا چونکہ چھوٹا تھا اس لیے وہ ہمیشہ دست نگر بن کر رہتا۔ اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ وہ جہیز نہیں مانگ رہے تھے۔ انھیں رانی کے حصے سے بھی کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بات چاچی کو سمجھ آ گئی تھی۔ اُدھر بڑی حویلی میں رانی راج کرتی اور یہاں ساری زمین کاکے کی ہو جاتی۔ راجو کو مجبوراً حصہ دینا بھی پڑتا تو کم از کم رانی کی زمین تو کاکے کے پاس ہی رہتی۔

رشتہ ٹوٹنے کا سن کر راجو بوکھلا گیا۔ اس نے ہر ممکن احتجاج کیا۔ اپنے تو پرائے بن ہی چکے تھے لہٰذا اُس نے برادری کے بڑوں کو بیچ میں ڈالا۔

برادری کے سامنے چاچا نے اسے پالنے کے تمام احسان گنواتے ہوئے زمین سے بے دخل کر دیا تھا۔ چاچا کے مطابق اُس زمین پر اب راجو کا کوئی حق نہ رہا تھا۔ اسے اگر رانی سے شادی کرنی ہے تو پہلے اس کے قابل بنے۔ راجو کو اپنے حصے سے کوئی سروکار نہ تھا مگر رانی کے چھن جانے کا غم بہت بڑا تھا۔

بوجھل دل کے ساتھ راجو وہاں سے اُٹھا۔ وہ کیا کر سکتا تھا۔ جفاکش اور محنتی تھا مگر زراعت کے علاوہ اسے کچھ نہ آتا تھا۔ بچپن سے زمین کو سینچ کر ہی رزق پایا تھا۔ اب زمین بھی نہ رہی اور رانی کی محبت کے ساتھ چاچا کی شفقت بھی جاتی نظر آ رہی تھی۔ وہ اپنا حصہ لینے پر اصرار کرتا تو ایک ٹکڑا شاید اسے مل بھی جاتا مگر اس کے بعد کوئی اپنا باقی نہ رہتا۔

اس دن اس نے بہت منتوں کے بعد چاچا سے وعدہ لیا کہ وہ ابھی رشتہ ختم نہ کرے، جب تک وہ اپنے پیروں پر کھڑا نہ ہو جائے۔ وہ زمین میں حصہ بھی نہیں لے گا، صرف اپنے بچپن کی منگ، اپنے والدین کا بنایا رشتہ بچائے گا۔ وہ عروس البلاد میں پیسے کمانے نہیں اپنے چھوٹتے اور ٹوٹتے رشتے بچانے آیا تھا اور اب کراچی ریلوے اسٹیشن پر قدم رکھتے ہوئے راجو تعجب سے لوگوں کا ازدحام دیکھ رہا تھا۔

ہر طرف گہما گہمی تھی۔ وہ گاؤں کا اتھرا لڑکا یہاں اُس پودے کی طرح بے آسرا کھڑا تھا، جسے جگہ نہ ہونے کی وجہ مالی نے جڑوں سمیت زمین سے نکال دیا ہو۔ وہ میٹھے پانی اور زرخیز مٹی میں پلنے والا اب کراچی کی ریتلی زمین اور نمکین پانی میں اپنی جڑیں لگانے آیا تھا۔ زمین اور پودے کی مطابقت ہو گئی تو پھلدار درخت زمین کا غرور بنے گا ورنہ پودا ختم ہو جائے گا اور زمین پرانے پودے کا غم منائے بغیر کشادہ دلی سے نئے آنے والوں کو خوش آمدید کہتی رہے گی۔

''کراچی میں روز اتنے لوگ مرتے ہیں، پھر بھی ہجوم کا یہ حال ہے۔'' خود کو مضبوط بناتے اس نے رانی کی بات زیرلب دہرائی۔ بظاہر وہ آرام سے اردگرد کا جائزہ لے رہا تھا مگر دل کی دھڑکن چاچے دینو کی گدھا گاڑی کی طرح سرپٹ دوڑ رہی تھی۔ لال پیلی پٹیوں سے سجے ہرے کرتے پہنے قلی لوگوں کے ہجوم میں جگہ بناتے یہاں وہاں آ جا رہے تھے۔ اس کا حلیہ دیکھ کر کسی نے اپنی خدمات پیش نہیں کیں۔ قلیوں کو بھی شاید اندازہ ہوا کہ وہ ان کے جیسی مالی حالت سے ہی تعلق رکھتا ہے۔

اپنا سفری بیگ تھامے راجو پلیٹ فارم سے باہر آیا۔ اسٹیشن کے احاطے میں بنی مسجد اور پارکنگ میں کھڑی گاڑیوں کی قطار سامنے ہی تھی۔ اتنی موٹر سائیکلیں تو ان کے پورے گاؤں میں نہ تھیں۔ اسٹیشن خود ایک چھوٹا سا شہر لگ رہا تھا۔ باہر نکل کر بس اسٹاپ کی طرف جاتے اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ ہر طرف رنگا رنگ لوگ تھے۔ دھوتی کرتا پہنے گاؤں کے بابوں جیسے، سادہ سے قمیص شلوار میں عام سے راجو جیسے لوگ، پگڑی، ٹوپی، اجرک پہنے یا پینٹ شرٹ پہنے شہری بابو جن کے لباس سے زیادہ چہرے کی بے نیازی انھیں ممتاز کر رہی تھی۔ مختلف لباس و انداز والے یہ سب لوگ یہاں کے باسی تھے۔ کسی کے چہرے پر ہراس نہیں تھا۔ سب رزق کی تگ و دو میں لگے تھے۔ اس کے اندر کا خوف قدرے کم ہوا تھا۔

ٹی وی ڈراموں میں بڑی بڑی عمارتیں اور چوڑی سڑکیں ہی نہیں بلکہ جدید فیشن کے لباس میں ملبوس ہیرو ہیروئن دیکھ کر کراچی اسے دبئی سے کم نہیں لگتا تھا مگر اب ڈوپٹا گلے میں ڈالے فیشن ایبل لڑکیوں کے ساتھ، سر چادر یا

ڈوپٹے سے ڈھانپے برقعہ پوش خواتین کا حلیہ دیکھ کر اسے اپنائیت کا احساس ہوا تھا۔ سڑک پر پہنچ کر وہ آتی جاتی بسوں اور رکشوں کو دیکھنے لگا۔ سیاہ دھوئیں کے جن اس کا سانس لینا مشکل کررہے تھے۔

مٹھی میں دبا بچپن کے دوست اکرم کے پتے والا کاغذ اس نے آخری اُمید کی طرح تھام رکھا تھا۔ ضروری سامان کا چھوٹا سا بیگ کندھے پر ڈالنے کے بعد آخری متاع کی طرح ہاتھ سے بھی پکڑ رکھا تھا۔ لوٹ مار کے جو قصے اس نے ''جھلی ہے تُو'' کہہ کر اَن سُنے کر دیے تھے وہی اب اس کے اندر عفریت بن کرناچنے لگے۔

اکرم نے اسے علاقے کا نام، پتا اور ساتھ بس کا نمبر بھی بتا دیا تھا۔ تھوڑی دیر وہ لوگوں کو لپک کر بسوں پر چڑھتے، رکشوں کے لیے خوار ہوتے دیکھتا رہا، پھر اپنے مطلوبہ نمبر کی بس آتے دیکھ کر خود بھی لپک کر سوار ہوگیا۔ کنڈیکٹر کو مطلوبہ جگہ کے بارے میں بتاتے ہوئے اُس نے پاس کھڑے آدمی سے بھی گزارش کی کہ اسے اسٹاپ آنے پر بتلا دے۔ آدمی گردن ہلا کر رخ موڑ گیا۔ راجو کو اس سے مدد کی اُمید نہ رہی مگر غیر متوقع طور پر اس نے اسٹاپ آنے سے پہلے بتا دیا۔ بس سے اُتر کر راستہ پوچھتا وہ اکرم کے گھر تک پہنچنے میں خوار ہوکر رہ گیا۔

اکرم ایک کوٹھی میں ڈرائیور تھا اور بیوی بچوں کے ساتھ وہیں سرونٹ کوارٹر میں رہتا۔ بیگم صاحبہ کی بیماری اور ایمرجنسی میں اسپتال جانے کی وجہ سے اسے بے وقت گھر سے نکلنے کی اجازت نہ تھی ورنہ وہ اسے لینے آجاتا۔ راجو کا استقبال اس نے خوشدلی سے کیا اور کھانا کھلایا۔ رہائش کا مسئلہ بدستور تھا۔ وہ صاحب کی مرضی کے بغیر کسی کو گھر میں نہیں رکھ سکتا تھا۔ ایک طرف حقیقت کی تند دھوپ تھی اور دوسری طرف جھلسا ہوا یار سائے کا متلاشی تھا۔ اسے اگر چھاؤں نہ ملتی تو اکرم خود کو کبھی معاف نہ کر پاتا۔ سوچ سوچ کر وہ آخر صاحب سے اجازت لے کر راجو کو نثار کی دکان پر لے آیا۔ نثار، صاحب کا پرانا درزی تھا۔ اکرم کی اس سے برسوں سے دوستی تھی۔

''تھوڑی سی جگہ اس کے سونے کے لیے بنا دے۔''

اکرم نے درخواست کی تو نثار اس پر چڑھ دوڑا۔

''دماغ ٹھیک ہے تیرا؟ ہزاروں کا مال ہوتا ہے دکان میں۔ ایسے قیمتی کپڑے جو تجھ جیسوں نے زندگی میں دیکھے بھی نہ ہوں گے۔ بہت دیکھے ہیں ایسے بچپن کے دوست۔ مال لے کر بھاگ گیا تو......؟''

''چور نہیں ہے بیچارہ۔ تُو نے تو ویسے بھی دکان کو باہر سے تالا لگا دینا ہے۔ بھاگے گا کہاں؟''

اکرم اسے سمجھا رہا تھا اور راجو کچھ فاصلے پر سر جھکائے قطرہ قطرہ ذلت اپنے اندر اُتارتا رہا۔ زندگی ایسی تو کبھی نہ تھی۔ تھوڑی بحث کے بعد نثار مان گیا۔ اکرم اسے چھوڑ کر گیا تو نثار نے اس پر سوالوں کی بوچھار کر دی۔ اس کے ٹوٹے لہجے میں چھوٹے چھوٹے جواب سنتے نثار کو اس کی معصومیت پر یقین آ ہی گیا۔

صبح اس نے اسے مزدوری کی تلاش میں جانے سے روک کر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ دکان کی صفائی سے لے کر نثار کے سکھائے چھوٹے چھوٹے کام کرتے وہ مصروف ہوگیا تھا۔ چاچا کو فون پر خیریت کی اطلاع دی مگر رانی سے بات کی سبیل نہ ہوئی۔ چاچا نے بے رُخی سے بات کر کے فون بند کر دیا تھا۔

وہ دکان میں رہتا تھا۔ جب تک اسے نیند نہ آتی، نثار کے دیے کام کرتا رہتا۔ دن چڑھتا تو کچھ دیر نثار سے پوچھ کر کوئی مزدوری ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوتا۔ اس کا کوئی اور جاننے والا نہ تھا سو مزدوری کا بھی عجب حال تھا۔ مل گئی سو مل گئی ورنہ چھٹی۔ یہ شہر اب اسے بھا گیا تھا۔ وہ اکیلا یہاں سے وہاں گھومتا۔ نئے نئے کام ڈھونڈتا۔

اس کی انتھک محنت سے متاثر ہوکر نثار نے اسے سلائی سکھا دی تھی۔ وہ جلد محنت کر کے اتنا کمانا چاہتا تھا کہ رانی کا

بوجھ اُٹھا سکے، اپنا گھر بنا سکے۔ کراچی نے اس کی محنت اور محبت کا بوجھ اپنے سر نہیں رکھا تھا۔ کچھ وقت لگا مگر وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس نے اپنی الگ دکان کرائے پر لے لی تھی۔ اس کی دکان نثار کی طرح پوش علاقے میں نہ تھی مگر قسمت کا رزق دے جاتی۔

وہ بہت خوش تھا۔ اب وقت آ گیا تھا کہ وہ رانی سے شادی کر کے اسے یہاں لاتا۔ وہ اس شہر میں اپنی خوشیوں بھری زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ چاچا کو آمد کی اطلاع کے لیے فون کیا تو آج پہلی بار چاچا نے اس سے لمبی بات کی۔

''تجھے آنے کی ضرورت نہیں راجو۔ میں نے آج تک تجھ سے جو محبت کی ہے، تجھے اس کا واسطہ دوبارہ یہاں نہ آنا۔ ہم نے رانی کو یقین دلا دیا ہے کہ تو شہر کی چکاچوند میں کھو چکا اور اب اس چھوٹے سے گاؤں اسے بیاہنے نہیں آئے گا۔ تیری چاچی کبھی تجھے رانی کا دلہا نہیں بنائے گی۔ اس نے رانی کی شادی طے کر دی ہے۔ رانی اب بھی تیری آس میں ہے۔ تجھے تیری مری ماں کی قسم یہاں نہ آنا۔''

چاچا کے جملے نہیں آگ کے گولے تھے جو لمحوں میں اس کی دنیا خاکستر کر گئے۔ اس شہر میں وہ اپنے قدم تو جما گیا مگر اپنا وہ رشتہ نہ بچا سکا جس کے لیے وہ یہاں آیا تھا۔ سمندر کی ریت اس کی آنکھوں میں چبھ رہی تھی۔ اس کے گلے میں نمک گھل رہا تھا۔ ڈوبتے لہجے میں اس نے بس اتنا کہا۔

''جیسے تیری مرضی چاچا، رانی کو کراچی کے حالات سے ڈر لگتا تھا، ٹھیک ہی لگتا تھا۔ اسے کہنا کراچی میں راجو کو گولی لگ گئی۔ میرے مرنے کی خبر سنے گی تو اسے صبر آ جائے گا۔''

یہ بے مہر سا لگتا شہر بہت مہربان تھا۔ کھڑے ہونے کو زمین دی تھی تو کیا مرنے کو قبر نہ دیتا؟ رانی غلط کہتی تھی۔ بڑے شہر ظالم نہیں ہوتے۔ ان کا دل بہت وسیع ہوتا ہے۔ ہزار کہانیاں اپنے اندر چھپائے سب کو جگہ دیتے ہیں۔ اب راجو کو تمام عمر یہیں رہنا تھا۔ سارے الزام اپنے وجود پر لیے گھائل سینے پر اپنوں کے دیے زخم گنتے کراچی اور راجو نے ساتھ ہی رہنا تھا۔

◆●●

کالے اقوال

☆......جو لوگ خود اپنی روٹی کے لیے اپنے مزارعوں اور مزدوروں کے دست نگر ہوں، وہ کسی اور کو کیا دے سکتے ہیں؟

☆......انسان کا قدیم ترین پیشہ جسم فروشی نہیں، انسان کشی ہے۔

☆......ہم قوانین کو تو اسلامی سانچے میں ڈالنا چاہتے ہیں......خود اس سانچے میں ڈھلنے کو تیار نہیں۔

☆......اہم ترین دریافت ''پہیہ'' نہیں...... ''دو ہاتھ'' ہیں۔ انسانی زندگی میں وہ لمحہ فیصلہ کن تھا جب انسان ''چوپائے'' سے دو ٹانگوں پر آیا اور اپنے ہاتھ ''دریافت'' کیے۔ ''پہیہ'' تو اس ایجاد کے نتیجے میں پیدا ہوا۔

☆......اس ملک میں کچھ لوگوں کے پاس سارے وسائل......باقی سب کے پاس سارے مسائل۔

☆......شاید قوم کو پیدائش کے وقت حفاظتی ٹیکے نہیں لگوائے گئے تھے۔

☆......دوسری جنگ عظیم ایٹم پر ختم ہوئی تھی، تیسری جنگ عظیم ایٹم بم سے شروع ہوگی اور پھر چوتھی جنگ عظیم کی کبھی نوبت نہ آئے گی۔

☆......ہماری سیاست میں وہ سب کچھ جائز ہے جو عشق اور محبت میں بھی جائز نہیں۔

☆......اینٹ سے اینٹ بجانا آسان لیکن اینٹ پر اینٹ رکھنا مشکل۔

(حسن نثار)

انسانی صفات والا پرندہ

شیخ عبدالحمید عابد

اشرف المخلوقات حضرت انسان کی پہلی ضرورت اس دنیا میں آنے کے بعد روٹی کپڑا اور مکان ہے۔ دوسری مخلوقات خدا کی بھی یہ پہلی ضرورت ہوتی ہے۔ گو ان کے ساتھ سہل یہ ہے کہ وہ کپڑوں سمیت ہی پیدا ہوتے اور ان کی زندگی کا مقصد اپنے لیے کھانا تلاش کرنا، زندگی کی حفاظت کرنا اور اپنی نسل کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ اپنے بچوں کے دانہ پانی کی ذمہ

داری اور حفاظت کرنا، جب تک وہ اپنی حفاظت خود کرنے کے قابل نہ ہو جائیں۔

جانوروں کو خدا نے انسان کی طرح سوچنے، سمجھنے اور منصوبہ بندی کرنے کی صلاحیت تو نہیں دی، مگر انھیں دیگر کافی طاقتور حسوں سے نوازا۔ یہ حسیات ہی ان کی بقا کا بنیادی حصہ ہیں۔ مثلاً سونگھنے، دیکھنے، سننے، خطرے کو پہچاننے کی حس انسانوں سے کہیں زیادہ تیز ہوتا۔ وہ جانور جو انڈے دیتے ہیں، انھیں خدا نے ایک اور حس سے نوازا ہے اور وہ ہے اپنا گھر بنانے کی خواہش اور محبت۔

پرندے ان جانوروں کی اقسام میں سے ہیں جو انڈے دیتے ہیں۔ ان سے نکلنے والے بچوں کی اس وقت تک حفاظت جب تک کہ وہ خود اڑنے کے قابل نہ ہو جائیں، تب تک کے لیے انھیں ایک محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ پرندوں کے اسی گھر کو گھونسلا کہا جاتا ہے۔

رنگوں کی بہار سے سجے اس پرندے کے بارے بیان میں یہ مشکل ہو سکتی ہے کہ اسے اپنی زبان میں کوئی نام دینا مشکل ترین ہے۔ یہ پرندہ بوور برڈ ہے جو پانچ رنگوں کی مختلف اقسام میں پایا جاتا ہے۔ قدرتی تاریخ کے مطابق اس کی درجہ بندی کرتے ہوئے پانچ رنگوں کے

بوور برڈ کی لاتعداد خصوصیات اشرف المخلوقات جیسی ہیں

اختلاف مگر ایک ہی نوع ایک جیسی صفات کی وجہ سے اسے بوور برڈ کا نام دیا جاتا ہے۔ یہ پرندہ صرف آسٹریلیا میں پایا جاتا ہے۔ بعض دوسرے پرندوں کی طرح وہاں سے ہجرت بھی نہیں کرتا۔ جس جگہ رہتا وہیں جیتا اور وہیں مرتا ہے۔ اپنی زمین سے پیوستہ رہتا ہے۔ اسے ''ذہین پرندہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ اس بات کا اظہار اس کے گھونسلا بنانے اور سجانے میں دیکھا جا سکتا ہے۔

گھونسلے کی سجاوٹ

بوور کے لفظی معنی مجلہ آرائش کے ہیں۔ ایسا گھر جسے سلیقے سے سجایا گیا ہو۔ بوور برڈ بھی گھر سجانے کا شوقین ہے۔ اس کا سال بھر سے زیادہ وقت گھونسلا سازی میں گزرتا ہے۔ گھونسلا سجانے میں بہترین ''سامان'' اکٹھا کرنے کی جو مہارت اسے حاصل ہے، وہ دنیا بھر میں اسی نوع کے دوسرے پرندوں میں نہیں۔ بوور برڈ ذوق آرائش کی اسی وجہ سے انسانی صفات والا پرندہ شمار کیا جاتا ہے۔

یہ گھونسلا بنانے میں ایک خاص قسم کی ترتیب ملحوظ رکھتا ہے۔ دیکھنے پر ایسا لگتا ہے جیسے کسی معمار نے نہایت مہارت کے ساتھ بنایا ہو۔

رنگوں کا شوقین

گھونسلا تیار ہونے کے بعد وہ اسے سجانے میں ایسی ایسی رنگدار اشیاء دور و نزدیک سے اُٹھا کر لاتا ہے کہ حیرت ہوتی ہے۔ دوسری حیران کن بات یہ کہ تمام تر اشیاء شوخ رنگوں کی جھلک لیے ہوتی ہیں۔ ان میں دوسرے پرندوں کے رنگین پر، سمندری گھونگے، پھول اور ایسے خوش نما پودوں کے پتے جو تازہ معلوم ہوں۔ حتیٰ کہ اس کے گھونسلے میں پائی جانے والی اشیاء میں چلے ہوئے کارتوسوں کے ڈھکنے جو رنگین ہوں۔

تعمیری صفت اور تکنیک

ایک سائنسدان نے گھونسلا بنانے کی تکنیک میں انسان جیسی تعمیری صفت کا کھوج لگانے کے لیے اس کے گھونسلے میں ایسی اشیاء بھی دیکھیں جنھیں چونچ میں اُٹھا کر لانے کے قیاس پر یقین نہیں آسکتا۔ یہ اشیاء پلاسٹک کی بنی ہوئی چمٹیاں تھیں جو دُھلے کپڑے رسی پر ڈال کر ان کے اُوپر لگا دی جاتی ہیں تاکہ ہوا انھیں نیچے زمین پر نہ گرا سکے۔ یہ چمٹیاں مضبوط اور گرفت دار ہوتی ہیں۔ انھیں رسی سے اُتارنا یا گرنے کی صورت میں زمین سے اُٹھانا بوور برڈ کی خوبی شمار کی جاتی ہے۔

ایک عجوبہ ہینڈی

کلیری ملر ماہر طیور اس پر بہت تحقیق کے بعد کہتا ہے کہ بوور برڈ ''سارنگ فیملی'' سے تعلق رکھنے والا پرندہ بھی کہا جاتا ہے۔ فاختہ جیسی جسامت رکھنے والا یہ پرندہ پانچ رنگوں اور پانچ اقسام کی مختلف جسامتوں نے اسے ماہرین کے نزدیک ایک اعجوبہ بنا رکھا ہے۔ رنگین اشیاء اکٹھی کرنے کے علاوہ یہ بات بھی دیکھنے میں آئی کہ وہ اپنی چونچ میں ''سیال رنگ'' بھی بھر کر لاتا اور اسے اپنے گھونسلے کی ''چوبی دیواروں'' پر ایسے انڈیلتا ہے جیسے اس پر روغن پھیر رہا ہو۔

ایک ذہین انجینئر

یہ اپنا گھونسلا بنانے میں ٹہنیاں ایسی ترتیب کے ساتھ کھڑی کرتا ہے جیسے کسی عمارت کی تعمیر کے لیے چنائی کی جاتی ہے۔ اندر آنے کے لیے راستہ اپنی جسامت کے برابر رکھتا اور اس کی بھی ایسی ترتیب ہوتی ہے جس سے اس کی ذہانت کا پتا چلتا ہے۔ اس کا زیادہ وقت گھونسلا بنانے کے لیے رنگین اشیاء کی تلاش میں انسانی گھروں کے نزدیک رہ کر گزرتا ہے۔

پرانی چیزوں کا رسیا

اگر اسے کسی غسل خانے، روشن دان یا کھڑکی میں رکھا ہوا ٹوتھ برش نظر آ جائے تو اسے اُٹھانے میں وہ وہاں پہروں منڈلاتا رہے گا۔ حتیٰ کہ اسے اٹھا کر نہ لے جائے۔ کسی وجہ سے اُٹھانے میں ناکام رہے تو دوسرے دن پھر اسی کوشش میں لگ جاتا ہے۔ بار بار کوشش کرنا انسان کی کامیابی کی علامت ہے اور اگر یہی عادت ایک پرندے میں بھی موجود ہے تو اسے

ایک مثال بھی کہا جاسکتا ہے۔ جو ایک پرندہ بندے کے لیے پیش کرتا ہے۔

بہار میں 'گھر' کی بنیاد

بوور برڈ گھونسلا بناتے وقت تھکن کی صورت میں گھونسلے کے قریبی درختوں پر ''آرام'' کرنے کے لیے بیٹھ جاتا ہے۔ حالانکہ گھونسلا بنانے کے ''فن'' سے آگاہی اسے نو سال تک ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتی۔ موسم بہار آنے پر اس کی ''ابتدائی اینٹ'' رکھتا ہے۔ ابتدا میں اسے اس قابل بنالیتا ہے کہ اس کے اندر بیٹھ کر انڈے سی سکے اور پھر موسم بہار آنے پر اس کی آرائش کرتا رہتا ہے۔ نومبر اس کی تعمیر میں صرف کرتا ہے۔ موسم بہار میں تعمیر کا آغاز اس لیے کرتا ہے کہ بہار پھولوں کا موسم ہوتا ہے۔ طبع بھی لطیف ہوتی ہے۔ انسان کی طرح یہ پرندہ بھی اس سے متاثر ہوتا ہے۔

مردِ میدان بادشاہ

اکثر پرندوں میں گھونسلا اس کی مادہ بناتی ہے مگر بوور برڈ کو مرد میدان کہنا چاہیے۔ وہ سارا کام خود کرتا ہے۔ اس کے نواع میں دوسرے پرندے بھی گھونسلا بنانے کی تیاری میں لگے نظر آتے ہیں۔ جو جتنا بڑا گھونسلا بنالے، وہی ''بادشاہ'' شمار ہوتا ہے۔

یہ فطرتاً چور بھی ہے

بوور برڈ دوسرے پرندوں کی عدم موجودگی میں ہر ایک کے گھر جھانکتا ہے۔ اسے اگر وہاں رکھی کوئی چیز پسند آجائے تو اسے چرا کر اپنے گھونسلے میں لے آتا ہے۔ جب دوسرا پرندہ یہ چوری بھانپ لے تو اپنی چیز واپس لینے آتا ہے۔ ایسی صورتِ حال میں 'بادشاہ' اور 'رعیت' میں لڑائی ہوجاتی ہے جو وقفے وقفے سے کئی دن جاری رہتی ہے۔ جیت بادشاہ کی ہی ہوتی ہے۔

نیلے رنگ کا بادشاہ

عام طور پر وہ بوور برڈ جس کا رنگ گہرا نیلا ہو، بادشاہ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ باقی قسموں کے رنگ رکھنے والوں میں زیادہ بہادر اور چور بھی ہے۔ اس لیے باقی سب اس کے آگے ہاتھ پیر باندھے نظر آتے ہیں۔

بلیو بوور برڈ کی ایک عادت یہ بھی نوٹ کی گئی ہے کہ وہ نیلے رنگ کے پھولوں کی پتیاں اُتارنے میں گہری دلچسپی رکھتا ہے۔ شاخ پر لگا نیلا پھول اگر کلی جتنا بڑا ہے تو وہ اسے پودے سے نوچ لیتا ہے۔

ایک بار ایک محقق نے نیلے بوور برڈ کے گھونسلے میں دو سو کے قریب نیلے رنگ کے چھوٹے چھوٹے پھول جمع دیکھے جو سب کے سب تازہ تھے۔

اس کی دلچسپ عادات میں ایک قابل ذکر یہ بھی ہے کہ صبح کے وقت اپنے گھونسلے میں پر پھیلا کر بلند ''آواز'' جو مرغ کی آواز سے ملتی جلتی ہے، بولتا ہے۔ جو مادہ اس کے ساتھ گھرداری کے لیے آمادہ ہو، وہ گھونسلے کے دروازے میں آ کر بیٹھ جاتی ہے۔ یوں وہ دو اور پھر دو سے چار بن جاتے ہیں اور یہ عمل جاری رہتا ہے۔

فی زمانہ انسانی ترقی، آبادی کے مسائل، جنگلات کی بڑھتی ہوئی کمی کی وجہ سے بہت سے پرندے اپنی بقا کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ ان میں کئی پرندوں کی اقسام شدید خطرے میں ہیں۔ اگر جلد ہی انسان نے اپنی ترقی کی ہوس سے ہٹ کر ان کی حفاظت کی کوشش نہ کی تو آنے والی نسل ان پرندوں کو صرف کتابوں میں ہی دیکھ سکے گی۔ ●●●

امرود کے چٹخارے

غذائیت سے بھرپور مزیدار اور سدا بہار پھل کے بارے میں مفید اور معلوماتی مضمون پڑھیں
صفحہ 161

بھاگو کا ''کونٹین''

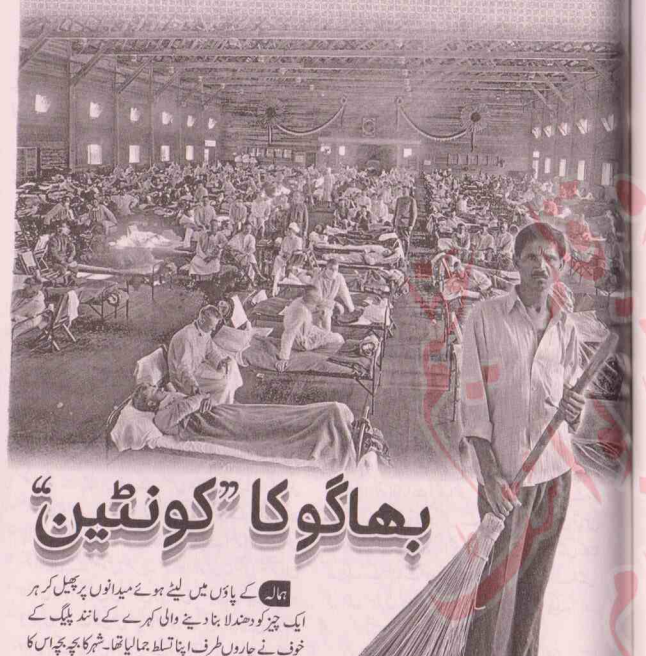

ہمالہ کے پاؤں میں لیٹے ہوئے میدانوں پر پھیل کر ہر ایک چیز کو دھندلا بنا دینے والی کہرے کے مانند پلیگ کے خوف نے چاروں طرف اپنا تسلط جما لیا تھا۔ شہر کا بچہ بچہ اس کا نام سن کر کانپ جاتا۔

پلیگ تو خوف ناک تھی ہی مگر کوارنٹین اس سے بھی زیادہ خوف ناک۔ لوگ پلیگ سے اتنے ہراساں نہیں

ایک ایسے خاکروب کی دلسوز کہانی جو پلیگ کی وبا میں دوسروں کی جان بچاتے ہوئے اپنی ہی بیوی کو کھو بیٹھا

تھے جتنے کوارنٹین سے۔ یہی وجہ تھی کہ محکمۂ حفظانِ صحت نے شہریوں کو چوہوں سے بچنے کی تلقین کرنے کے لیے جو قدآدم اشتہار چھپوا کر دروازوں، گزرگاہوں اور شاہراہوں پر لگایا تھا، اس پر ''نہ چوہا نہ پلیگ'' کے عنوان میں اضافہ کرتے ہوئے ''نہ چوہا نہ پلیگ، نہ کوارنٹین'' لکھا تھا۔

کوارنٹین کے متعلق لوگوں کا خوف بجا تھا۔ بحیثیت ایک ڈاکٹر، میری رائے نہایت مستند ہے اور میں دعوے سے کہتا ہوں کہ جتنی اموات شہر میں کوارنٹین سے ہوئیں، اتنی پلیگ سے نہ ہوئی ہوں گی۔ حالانکہ کوارنٹین کوئی بیماری نہیں، بلکہ یہ اس وسیع رقبہ کا نام ہے جس میں متعدی وبا کے ایام میں بیمار لوگوں کو تندرست انسانوں سے ازروئے قانون علیحدہ کرکے لا ڈالتے ہیں تاکہ بیماری بڑھنے نہ پائے۔

اگرچہ کوارنٹین میں ڈاکٹروں اور نرسوں کا کافی انتظام تھا، پھر بھی مریضوں کی کثرت سے وہاں آجانے پر ان کی طرف فرداً فرداً توجہ نہ دی جاسکتی تھی۔ خویش واقارب کے قریب نہ ہونے سے میں نے بہت سے مریضوں کو بے حوصلہ ہوتے دیکھا۔ کئی تو اپنے نواح میں لوگوں کو پے درپے مرتے دیکھ کر مرنے سے پہلے ہی مرگئے۔ بعض اوقات تو ایسا ہوا کہ کوئی معمولی طور پر بیمار آدمی وہاں کی وبائی فضا ہی کے جراثیم سے ہلاک ہوگیا۔ کثرتِ اموات کی وجہ سے آخری رسوم بھی کوارنٹین کے مخصوص طریقہ پر ادا ہوتیں۔ یعنی سینکڑوں لاشوں کو مردہ کتوں کی نعشوں کی طرح گھسیٹ کر ایک بڑے ڈھیر کی صورت میں جمع کیا جاتا اور بغیر کسی کے مذہبی رسوم کا احترام کیے، پٹرول ڈال کر سب کو نذرِ آتش کردیا جاتا۔ شام کے وقت جب ڈوبتے ہوئے سورج کی آتشیں شفق کے ساتھ بڑے بڑے شعلے یک رنگ ونم آہنگ ہوتے تو دوسرے مریض یہی سمجھتے کہ تمام دنیا کو آگ لگ گئی ہے۔

کوارنٹین اس لیے بھی زیادہ اموات کا باعث ہوا کہ بیماری کے آثار نمودار ہوتے تو بیمار کے متعلقین اسے چھپانے

اُردو افسانہ

راجندر سنگھ بیدی

لگتے، تاکہ کہیں مریض کو جبراً کوارنٹین میں نہ لے جائیں۔ چونکہ ہر ایک ڈاکٹر کو تنبیہ کی گئی کہ وہ مریض کی خبر پاتے ہی فوراً مطلع کرے۔ اس لیے لوگ ڈاکٹروں سے علاج بھی نہ کراتے اور کسی گھر کے وبائی ہونے کا صرف اسی وقت پتہ چلتا، جب جگر دوز آہ وبکا کے درمیان ایک لاش اس گھر سے نکلتی۔

ان دنوں میں کوارنٹین میں بطور ایک ڈاکٹر کے کام کررہا تھا۔ پلیگ کا خوف میرے دل ودماغ پر بھی مسلط تھا۔ شام کو گھر آنے پر میں دیر تک صابن سے ہاتھ دھوتا رہتا اور جراثیم کش مرکب سے غرارے کرتا، یا پیٹ کو جلا دینے والی گرم کافی یا برانڈی پی لیتا۔ اگرچہ اس سے مجھے بے خوابی اور آنکھوں کے چندھے پن کی شکایت پیدا ہوگئی۔ کئی دفعہ بیماری کے خوف سے میں نے تے آور دوائیں کھا کر اپنی طبیعت کو صاف کیا۔ جب نہایت گرم کافی یا برانڈی پینے سے پیٹ میں تخمیر ہوتی اور بخارات اُٹھ اُٹھ کر دماغ کی طرف جاتے، تو میں اکثر ایک حواس باختہ شخص کے مانند طرح طرح کی قیاس آرائیاں کرتا۔ گلے میں ذرا بھی خراش محسوس ہوتی تو میں سمجھتا کہ پلیگ کے نشانات نمودار ہونے والے ہیں..... اُف! میں بھی اس موذی بیماری کا شکار ہو جاؤں گا۔ پلیگ! اور پھر..... کوارنٹین!

انھی دنوں کی بات ہے کہ نوعیسائی ولیم بھاگو خاکروب، جو میری گلی میں صفائی کیا کرتا تھا، میرے پاس آیا اور بولا:

''بابو جی..... غضب ہوگیا۔ آج ایمبولینس اسی محلہ کے قریب سے بیس اور ایک بیمار لے گئی ہے۔''

''اکیس؟ ایمبولینس میں.....؟'' میں نے متعجب ہوتے ہوئے یہ الفاظ کہے۔

''جی ہاں! پورے بیس اور ایک۔ انھیں بھی کوٹھن (کوارنٹین) لے جائیں گے۔ آہ! وہ بے چارے بھی واپس نہ آئیں گے؟''

دریافت کرنے پر مجھے علم ہوا کہ بھاگوات کے تین بچے اُٹھتا ہے۔ آدھ پاؤ شراب چڑھالیتا ہے اور پھر حسبِ ہدایت کمیٹی کی گلیوں اور نالیوں میں چونا بکھیرنا شروع کردیتا ہے، تاکہ جراثیم پھیلنے نہ پائیں۔ بھاگو نے مجھے مطلع کیا کہ اس کے تین بچے اُٹھنے کا یہی مطلب ہے کہ بازار میں پڑی ہوئی لاشوں کو اُٹھا کرے اور اس محلہ میں جہاں وہ کام کرتا ہے، ان لوگوں کے چھوٹے موٹے کام کاج کرے جو بیماری کے خوف سے باہر نہیں نکلتے۔

بھاگو تو بیماری سے ذرا بھی نہیں ڈرتا تھا۔ اس کا خیال تھا اگر موت آئی ہو تو خواہ وہ کہیں بھی چلا جائے، بچ نہیں سکتا۔

ان دنوں جب کوئی کسی کے پاس نہیں پھٹکتا تھا، بھاگو سر اور منہ پر منڈاسا باندھے نہایت انہماک سے بنی نوع انسان کی خدمت گزاری کررہا تھا۔ اگرچہ اس کا علم نہایت محدود تھا، تاہم اپنے تجربوں کی بنا پر وہ ایک مقرر کی طرح لوگوں کو بیماری سے بچنے کی تراکیب بتاتا۔ عام صفائی، چونا بکھیرنے اور گھر سے باہر نہ نکلنے کی تلقین کرتا۔ ایک دن میں نے اسے لوگوں کو شراب کثرت سے پینے کی تلقین کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ اس دن جب وہ میرے پاس آیا تو میں نے پوچھا:

''بھاگو تمھیں پلیگ سے ڈر بھی نہیں لگتا؟''

''نہیں بابو جی..... ہن آئی بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ آپ اِتے بڑے حکیم ٹھہرے، ہزاروں نے آپ کے ہاتھ سے شفا پائی مگر جب میری آئی ہوگی تو آپ کا دارو درمن بھی کچھ اثر نہ کرے گا۔ ہاں بابو جی! آپ بُرا نہ مانیں۔ میں ٹھیک اور صاف صاف کہہ رہا ہوں۔'' اور پھر گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے ''کچھ کوٹھین کی کہیے بابو جی..... کوٹھین کی۔''

''وہاں کوارنٹین میں ہزاروں مریض آگئے ہیں۔ ہم حتی الوسع ان کا علاج کرتے ہیں مگر کہاں تک، نیز میرے ساتھ کام کرنے والے خود بھی زیادہ دیر اُن کے درمیان رہنے سے گھبراتے ہیں۔ خوف سے ان کے گلے اور لب سوکھے رہتے ہیں۔ پھر تمہاری طرح کوئی مریض کے منہ کے ساتھ منہ نہیں جا لگاتا۔ نہ کوئی تمہاری طرح اتنی جان مارتا ہے۔ بھاگو! خدا تمہارا بھلا کرے۔ جو تم بنی نوعِ انسان کی اس قدر خدمت کرتے ہو۔''

بھاگو نے گردن جھکا دی اور منڈاسے کے ایک پلّو کو منہ سے ہٹا کر شراب کے اثر سے سرخ چہرہ دکھاتے ہوئے بولا:

''بابو جی، میں کس لائق ہوں۔ مجھ سے کسی کا بھلا ہو جائے، میرا یہ کمتر پن کسی کے کام آجائے، اس سے زیادہ خوش قسمتی اور کیا ہوسکتی ہے۔ بابو جی بڑے پادری لابے (ریورینڈ مونت ل۔ آبے) جو ہمارے محلوں میں اکثر پرچار کے لیے آیا کرتے ہیں، کہتے ہیں، خداوند یسوع مسیح یہی سکھاتا ہے کہ بیماری کی مدد میں اپنی جان تک لڑا دو۔ میں سمجھتا ہوں.....''

میں نے بھاگو کی ہمت کو سراہنا چاہا، مگر کثرتِ جذبات سے میں رُک گیا۔ اس کی خوش اعتقادی اور عملی زندگی کو دیکھ کر میرے دل میں ایک جذبۂ رشک پیدا ہوا۔ میں نے دل میں فیصلہ کیا کہ آج کوارنٹین میں پوری تندہی سے کام کرکے بہت سے مریضوں کو بقیدِ حیات رکھنے کی کوشش کروں گا۔ ان کو آرام پہنچانے میں اپنی جان تک لڑا دوں گا مگر کہنے اور کرنے میں بہت فرق ہوتا ہے۔ کوارنٹین میں پہنچ کر جب میں نے مریضوں کی خوفناک حالت دیکھی اور ان کے منہ سے پیدا شدہ تعفن میرے نتھنوں تک پہنچا، تو میری روح لرز گئی اور بھاگو کی تقلید کرنے کی ہمت نہ پڑی۔

تاہم اس دن بھاگو کو ساتھ لے کر میں نے کوارنٹین میں بہت کام کیا۔ جو کام مریض کے زیادہ قریب رہ کر ہوسکتا تھا، وہ میں نے بھاگو سے کرایا اور اس نے بلا تامل کیا۔ خود میں مریضوں سے دُور دُور ہی رہتا، اس لیے کہ میں موت سے

بہت خائف تھا اور اس سے بھی زیادہ کوارنٹین سے۔

مگر کیا بھاگو موت اور کوارنٹین، دونوں سے بالاتر تھا؟

اس دن کوارنٹین میں چار سو کے قریب مریض داخل ہوئے اور اڑھائی سو کے لگ بھگ لقمۂ اجل ہو گئے!

یہ بھاگو کی جانبازی کا صدقہ ہی تھا کہ میں نے بہت سے مریضوں کو شفایاب کیا۔ وہ نقشہ جو مریضوں کی رفتارِ صحت کے متعلق چیف میڈیکل آفیسر کے کمرے میں آویزاں تھا، اس میں میرے تحت میں رکھے ہوئے مریضوں کی اوسط صحت کی لکیر سب سے اونچی چڑھی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ میں ہر روز کسی نہ کسی بہانے اس کمرے میں چلا جاتا اور اس لکیر کو سو فیصدی کی طرف اوپر ہی اوپر بڑھتے دیکھ کر دل میں بہت خوش ہوتا۔

ایک دن میں نے برانڈی ضرورت سے زیادہ پی لی۔ میرا دل دھک دھک کرنے لگا۔ نبض گھوڑے کی طرح دوڑنے لگی اور میں ایک جنونی کی مانند اِدھر اُدھر بھاگنے لگا۔ مجھے خود شک ہونے لگا کہ پلیگ کے جراثیم نے مجھ پر آخرکار اپنا اثر کر ہی دیا ہے اور عنقریب ہی گلٹیاں میرے گلے یا رانوں میں نمودار ہوں گی۔ میں بہت سراسیمہ ہو گیا۔ اس دن میں نے کوارنٹین سے بھاگ جانا چاہا۔ جتنا عرصہ بھی میں وہاں ٹھہرا، خوف سے کانپتا رہا۔ اس دن مجھے بھاگو کو دیکھنے کا صرف دو دفعہ اتفاق ہوا۔

دوپہر کے قریب میں نے اسے ایک مریض سے لپٹے ہوئے دیکھا۔ وہ نہایت پیار سے اس کے ہاتھ تھپک رہا تھا۔ مریض میں جتنی بھی سکت تھی اسے جمع کرتے ہوئے اس نے کہا:

"بھئی اللہ ہی مالک ہے۔ اس جگہ تو خدا دشمن کو بھی نہ لائے۔ میری دو لڑکیاں۔"

بھاگو نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا: "خداوند یسوع مسیح کا شکر کرو بھائی۔ تم تو اچھے دکھائی دیتے ہو۔"

"ہاں بھائی شکر ہے خدا کا۔ پہلے سے کچھ اچھا ہی ہوں۔ اگر میں کوارنٹین۔"

ابھی یہ الفاظ اس کے منہ میں ہی تھے کہ اس کی نسیں کھچ گئیں۔ اس کے منہ سے کف جاری ہو گیا۔ آنکھیں پتھرا گئیں۔ کئی جھٹکے آئے اور وہ مریض، جو ایک لمحہ پہلے سب کو اور خصوصاً اپنے آپ کو اچھا دکھائی دے رہا تھا، ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔ بھاگو اس کی موت پر دکھائی نہ دینے والے خون کے آنسو بہانے لگا اور کون اس کی موت پر آنسو بہاتا۔ کوئی اس کا وہاں ہوتا تو اپنے جگرسوز نالوں سے ارض و سما شق کر دیتا۔ ایک بھاگو ہی تھا جو سب کا رشتہ دار تھا۔ سب کے لیے اس کے دل میں درد تھا۔ وہ سب کی خاطر روتا اور کڑھتا تھا۔ ایک دن اس نے خداوند یسوع مسیح کے حضور میں نہایت عجز و انکسار سے اپنے آپ کو بنی نوع انسان کے گناہوں کے کفارے کے طور پر بھی پیش کیا۔

اسی دن شام کے قریب بھاگو میرے پاس دوڑا دوڑا آیا۔ سانس پھولی ہوئی تھی۔ وہ ایک دردناک آواز سے کراہ رہا تھا۔ بولا:

"بابو جی۔ یہ کونٹین تو دوزخ ہے، دوزخ۔ پادری لابے اسی قسم کی دوزخ کا نقشہ کھینچا کرتا تھا۔"

میں نے کہا: "ہاں بھائی، یہ دوزخ سے بھی بڑھ کر ہے۔ میں تو یہاں سے بھاگ نکلنے کی ترکیب سوچ رہا ہوں۔ میری طبیعت آج بہت خراب ہے۔"

"بابو جی اس سے زیادہ اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ آج ایک مریض جو بیماری کے خوف سے بے ہوش ہو گیا تھا، اسے مردہ سمجھ کر کسی نے لاشوں کے ڈھیروں میں لے جا پھینکا۔ جب پٹرول چھڑکا گیا اور آگ نے سب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا، تو میں نے اسے شعلوں میں ہاتھ پاؤں مارتے دیکھا۔ میں نے کود کر اسے اٹھا لیا۔ بابو جی! وہ بہت بُری طرح جھلس گیا تھا۔ اسے بچاتے ہوئے میرا دایاں بازو بالکل جل گیا۔"

میں نے بھاگو کا بازو دیکھا۔ اس پر زرد زرد چربی نظر آ رہی تھی۔ میں اسے دیکھتے ہوئے لرز اٹھا۔ میں نے پوچھا، "کیا وہ آدمی بچ گیا یا پھر؟"

"بابو جی۔ وہ کوئی بہت شریف آدمی تھا۔ جس کی نیکی اور شریفی (شرافت) سے دنیا کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکی۔ اتنے درد و کرب کی حالت میں اس نے اپنا جھلسا ہوا چہرہ اُوپر اُٹھایا اور اپنی مریل سی نگاہ میری آنکھوں میں ڈالتے ہوئے اس نے میرا شکریہ ادا کیا۔"

"اور بابو جی!" بھاگو نے اپنی بات کو جاری رکھتے ہوئے کہا: "اس کے کچھ عرصہ بعد وہ اتنا تڑپا، اتنا تڑپا کہ آج تک میں نے کسی مریض کو اس طرح جان توڑتے نہیں دیکھا ہو گا۔ اس کے بعد وہ مر گیا۔ کتنا اچھا ہوتا جو میں اسے اسی وقت جل جانے دیتا۔ اسے بچا کر میں نے اسے مزید دکھ سہنے کے لیے زندہ رکھا اور پھر وہ بچا بھی نہیں۔ اب ان ہی جلے ہوئے بازوؤں سے میں پھر اسے اسی ڈھیر میں پھینک آیا ہوں۔"

اس کے بعد بھاگو کچھ بول نہ سکا۔ درد کی ٹیسوں کے درمیان اس نے رُکتے رُکتے کہا: "آپ جانتے ہیں۔ وہ کس بیماری سے مرا؟ پلیگ سے نہیں۔ کونٹین سے۔ کونٹین سے!"

اگرچہ ہمہ یاراں دوزخ کا خیال اس لامتناہی سلسلۂ قہر و غضب میں لوگوں کو کسی حد تک تسلی کا سامان بہم پہنچاتا تھا، تاہم مقہور بنی آدم کی فلک شگاف صدائیں تمام شب کانوں میں آتی رہتیں۔ ماؤں کی آہ و بکا، بہنوں کے نالے، بیویوں کے نوحے، بچوں کی چیخ و پکار شہر کی اس فضا میں، جس میں کہ نصف شب کے قریب اُلو بھی بولنے سے ہچکچاتے تھے، ایک نہایت الم ناک منظر پیدا کرتی تھی۔ جب صحیح و سلامت لوگوں کے سینوں پر منوں بوجھ رہتا تھا، تو اُن لوگوں کی حالت کیا ہوگی جو گھروں میں بیمار پڑے تھے اور جنھیں کسی یرقان زدہ کے مانند درو دیوار سے مایوسی کی زردی ٹپکتی دکھائی دیتی تھی اور پھر کوارنٹین کے مریض، جنھیں مایوسی کی حد سے گزر کر ملک الموت مجسم دکھائی دے رہا تھا، وہ زندگی سے یوں چمٹے ہوئے تھے، جیسے کسی طوفان میں کوئی کسی درخت کی چوٹی سے چمٹا ہوا ہو اور پانی کی تیز و تند لہریں ہر لحظہ بڑھ کر اس چوٹی کو بھی ڈبو دینے کی آرزومند ہوں۔

میں اس روز وہم پرستی کی وجہ سے کوارنٹین بھی نہ گیا۔ کسی ضروری کام کا بہانہ کر دیا۔ اگرچہ مجھے سخت ذہنی کوفت ہوتی رہی۔ کیونکہ یہ بہت ممکن تھا کہ میری مدد سے کسی مریض کو فائدہ پہنچ جاتا مگر اس خوف نے جو میرے دل و دماغ پر مسلّط تھا، مجھے پابہ زنجیر رکھا۔ شام کو سوتے وقت مجھے اطلاع ملی کہ آج شام کوارنٹین میں پانچ سو کے قریب مزید مریض پہنچے ہیں۔

میں ابھی ابھی معدے کو جلا دینے والی گرم کافی پی کر سونے ہی والا تھا کہ دروازے پر بھاگو کی آواز آئی۔ نوکر نے دروازہ کھولا تو بھاگو ہانپتا ہوا اندر آیا۔ بولا:

"بابو جی۔ میری بیوی بیمار ہو گئی۔ اس کے گلے میں گلٹیاں نکل آئی ہیں۔ خدا کے واسطے اسے بچاؤ۔ ہمارا ڈیڑھ سالہ بچہ ماں کا دودھ پیتا ہے۔ وہ بھی ہلاک ہو جائے گا۔"

بجائے گہری ہمدردی کا اظہار کرنے کے، میں نے خشمگیں لہجہ میں کہا:

"اس سے پہلے کیوں نہ آ سکے؟ کیا بیماری ابھی ابھی شروع ہوئی ہے؟"

"صبح معمولی بخار تھا۔ جب میں کونٹین (کوارنٹین) گیا۔"

"اچھا۔ وہ گھر میں بیمار تھی اور پھر بھی تم کوارنٹین گئے؟"

"جی بابو جی۔" بھاگو نے کانپتے ہوئے کہا۔ "وہ بالکل معمولی بیمار تھی۔ میں سمجھا شاید دودھ چڑھ گیا ہے۔ اس کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں۔ میرے دونوں بھائی گھر پر ہی تھے اور سینکڑوں مریض کونٹین میں بے بس۔"

"تو تم اپنی حد سے زیادہ مہربانی اور قربانی سے جراثیم کو

گھر لے ہی آئے نا۔ میں نہ تم سے کہتا تھا کہ مریضوں کے اتنا قریب مت رہا کرو۔ دیکھو میں آج اسی وجہ سے وہاں نہیں گیا۔ اس میں سب تمہارا قصور ہے۔ اب میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم سے جانباز کو اپنی جانبازی کا مزہ بھگتنا ہی چاہیے۔ جہاں شہر میں سینکڑوں مریض پڑے ہیں۔''

بھاگو نے ملتجیانہ انداز سے کہا: ''مگر خداوند یسوع مسیح......''

''چلو ہٹو۔ بڑے آئے کہیں کے۔ تم نے جان بوجھ کر آگ میں ہاتھ ڈالا۔ اب اس کی سزا میں بھگتوں؟ قربانی ایسے تھوڑے ہی ہوتی ہے۔ میں اتنی رات گئے تمہاری کچھ مدد نہیں کر سکتا۔''

''مگر پادری لابے۔''

''چلو۔ جاؤ۔ پادری ل، آبے کے کچھ لگتے۔''

بھاگو سر جھکائے وہاں سے چلا گیا۔ اس کے آدھ گھنٹہ بعد جب میرا غصہ رفو ہوا تو میں اپنی حرکت پر نادم ہونے لگا۔ میں عاقل کہاں کا تھا جو بعد میں پشیمان ہو رہا تھا۔ میرے لیے یہی یقیناً سب سے بڑی سزا تھی کہ اپنی تمام خودداری پائمال کرتے ہوئے بھاگو کے سامنے گزشتہ رویہ پر اظہارِ معذرت کرتے ہوئے اس کی بیوی کا پوری جانفشانی سے علاج کروں۔ میں نے جلدی جلدی کپڑے پہنے اور دوڑا دوڑا بھاگو کے گھر پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر میں نے دیکھا کہ بھاگو کے دونوں چھوٹے بھائی اپنی بھاوج کو چارپائی پر لٹائے ہوئے باہر نکال رہے تھے۔

میں نے بھاگو کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا: ''اسے کہاں لے جا رہے ہو؟

بھاگو نے آہستہ سے جواب دیا: ''کونٹین میں۔''

''تو کیا اب تمہاری دانست میں کوارنٹین دوزخ نہیں بھاگو؟''

''آپ نے جو آنے سے انکار کر دیا، بابو جی...... اور چارا ہی کیا تھا۔ میرا خیال تھا، وہاں حکیم کی مدد مل جائے گی اور دوسرے مریضوں کے ساتھ اس کا بھی خیال رکھ لوں گا۔''

''یہاں رکھ دو چارپائی۔ ابھی تک تمہارے دماغ سے دوسرے مریضوں کا خیال نہیں گیا؟ احمق۔''

چارپائی اندر رکھ دی گئی اور میرے پاس جو تیر بہ ہدف دوا تھی، میں نے بھاگو کی بیوی کو پلائی اور پھر اپنے غیر مرئی حریف کا مقابلہ کرنے لگا۔ بھاگو کی بیوی نے آنکھیں کھول دیں۔

بھاگو نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا: ''آپ کا احسان ساری عمر نہ بھولوں گا، بابو جی۔''

میں نے کہا، ''مجھے اپنے گزشتہ رویے پر سخت افسوس ہے بھاگو۔ ایشور تمہیں ان خدمات کا صلہ تمہاری بیوی کی شفا کی صورت میں دے۔''

اسی وقت میں نے اپنے غیر مرئی حریف کو اپنا آخری حربہ استعمال کرتے دیکھا۔ بھاگو کی بیوی کے لب پھڑکنے لگے۔ نبض جو میرے ہاتھ میں تھی، مدھم ہو کر شانے کی طرف سرکنے لگی۔ میرے غیر مرئی حریف نے جس کی عموماً فتح ہوتی تھی، حسبِ معمول پھر مجھے چاروں شانے چت گرایا۔ میں نے ندامت سے سر جھکاتے ہوئے کہا:

''بھاگو! بدنصیب بھاگو! تمہیں اپنی قربانی کا یہ عجیب صلہ ملا۔ آہ!''

بھاگو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

وہ نظارہ کتنا دل دوز تھا، جب بھاگو نے اپنے بلبلاتے ہوئے بچے کو اس کی ماں سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ کر دیا اور مجھے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ لوٹا دیا۔

میرا خیال تھا کہ اب بھاگو اپنی دنیا کو تاریک پا کر کسی کا خیال نہ کرے گا مگر اس سے اگلے روز میں نے اسے بیش از پیش مریضوں کی امداد کرتے دیکھا۔ اس نے سینکڑوں گھروں کو بے چراغ ہونے سے بچا لیا اور اپنی زندگی کو ہیچ سمجھا۔ میں نے

بھی بھاگو کی تقلید میں نہایت مستعدی سے کام کیا۔ کوارنٹین اور ہسپتالوں سے فارغ ہو کر اپنے فالتو وقت میں نے شہر کے غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر، جو بدرؤوں کے کنارے پر واقع ہونے کی وجہ سے، یا غلاظت کے سبب بیماری کے مسکن تھے، رجوع کیا۔

اب فضا بیماری کے جراثیم سے بالکل پاک ہو چکی تھی۔ شہر کو بالکل دھو ڈالا گیا تھا۔ چوہوں کا کہیں نام و نشان دکھائی نہ دیتا۔ سارے شہر میں صرف ایک آدھ کیس ہوتا جس کی طرف فوری توجہ دیے جانے پر بیماری کے بڑھنے کا احتمال باقی نہ رہا۔

شہر میں کاروبار نے اپنی طبعی حالت اختیار کر لی۔ اسکول، کالج اور دفاتر کھلنے لگے۔

ایک بات جو میں نے شدت سے محسوس کی، وہ یہ کہ بازار میں گزرتے وقت چاروں طرف سے انگلیاں مجھی پر اٹھتیں۔ لوگ احسان مندانہ نگاہوں سے میری طرف دیکھتے۔ اخباروں میں تعریفی کلمات کے ساتھ میری تصاویر چھپیں۔ اس چاروں طرف سے تحسین و آفرین کی بوچھار نے میرے دل میں کچھ غرور سا پیدا کر دیا۔

آخر ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں شہر کے بڑے بڑے رئیس اور ڈاکٹر مدعو کیے گئے۔ وزیر بلدیات نے اس کی صدارت کی۔ میں صاحبِ صدر کے پہلو میں بٹھایا گیا، کیونکہ وہ دعوت دراصل میرے ہی اعزاز میں دی گئی تھی۔ ہاروں کے بوجھ سے میری گردن جھکی جاتی اور میری شخصیت بہت نمایاں معلوم ہوتی تھی۔ پُرغرور نگاہ سے میں کبھی ادھر دیکھتا کبھی اُدھر۔ بنی آدم کی انتہائی خدمت گزاری کے صلہ میں کمیٹی، شکر گزاری کے جذبہ سے معمور ایک ہزار ایک روپے کی تھیلی بطور حقیر رقم میری نذر کر رہی تھی۔

جتنے بھی لوگ موجود تھے، سب نے میرے رفقائے کار کی عموماً اور میری خصوصاً تعریف کی اور کہا کہ گزشتہ آفت میں جتنی جانیں میری جانفشانی اور تندہی سے بچی ہیں، ان کا شمار نہیں۔ میں نے دن دیکھا نہ رات، اپنی حیات کو حیاتِ قوم اور اپنے سرمایہ کو سرمایۂ ملت سمجھا اور بیماری کے مسکنوں میں پہنچ کر مرتے ہوئے مریضوں کو جامِ شفا پلایا۔

وزیر بلدیات نے میز کے بائیں پہلو میں کھڑے ہو کر ایک پتلی سی چھڑی ہاتھ میں لی اور حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے ان کی توجہ اس سیاہ لکیر کی طرف دلائی جو دیوار پر آویزاں نقشے میں بیماری کے دنوں میں صحت کے درجہ کی طرف ہر لحظہ افتاں و خیزاں بڑھی جا رہی تھی۔ آخر میں انھوں نے نقشے میں وہ دن بھی دکھایا جب میرے زیر نگرانی چوّن (54) مریض رکھے گئے اور وہ تمام صحت یاب ہو گئے۔ یعنی نتیجہ سو فیصدی کامیابی رہا اور وہ سیاہ لکیر اپنی معراج کو پہنچ گئی۔

اس کے بعد وزیر بلدیات نے اپنی تقریر میں میری ہمت کو بہت سراہا اور کہا کہ لوگ یہ جان کر بہت خوش ہوں گے کہ بخشی جی اپنی خدمات کے صلہ میں لفٹینٹ کرنل بنائے جا رہے ہیں۔

ہال تحسین و آفرین کی آوازوں اور پُرشور تالیوں سے گونج اُٹھا۔

ان ہی تالیوں کے شور کے درمیان میں نے اپنی پُرغرور گردن اُٹھائی۔ صاحب صدر اور معزز حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے ایک لمبی چوڑی تقریر کی۔ اس میں علاوہ اور باتوں کے میں نے بتایا کہ ڈاکٹروں کی توجہ کے قابل ہسپتال اور کوارنٹین ہی نہیں، بلکہ ان کی توجہ کے قابل غریب طبقہ کے لوگوں کے گھر تھے۔ وہ لوگ اپنی مدد کے بالکل ناقابل تھے اور وہی زیادہ تر اس موذی بیماری کا شکار ہوئے۔ میں اور میرے رفقاء نے بیماری کے صحیح مقام کو تلاش کیا اور اپنی توجہ بیماری جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے میں صرف کر دی۔ کوارنٹین اور ہسپتال سے فارغ ہو کر ہم نے راتیں ان ہی خوفناک مسکنوں میں گزاریں۔

ایک گورنر ہاؤس کا حال

حضرت ابو عبیدہؓ، حضرت عمر فاروقؓ کے دورِ خلافت میں دمشق کے گورنر تھے۔ ایک مرتبہ عمر فاروقؓ نے اپنے گورنر سے فرمائش کی کہ میں آپ کا گھر دیکھنا چاہتا ہوں...... ابو عبیدہؓ نے جواب دیا کہ ''امیر المومنین آپ میرے گھر کو دیکھ کر کیا کریں گے؟ جب آپ میرے گھر کو دیکھیں گے تو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔'' حضرت عمر فاروقؓ نے فرمایا: ''میں دیکھنا چاہتا ہوں......'' ابو عبیدہؓ، امیر المومنین کو لے کر چل دیے۔ شہر کے اندر سے گزر رہے تھے، جب شہر کی آبادی ختم ہوگئی تو حضرت عمرؓ نے پوچھا: ''کہاں لے کر جا رہے ہو؟''

حضرت ابو عبیدہؓ نے جوب دیا: ''گھر قریب ہی ہے'' چنانچہ پورا دمشق شہر جو دنیا کے مال و اسباب سے جگ مگ کر رہا تھا گزر گیا، تو آخر میں لے جا کر کھجور کے پتوں سے بنا ایک جھونپڑا دکھایا اور فرمایا: ''اے امیر المومنین میں اس میں رہتا ہوں'' جب حضرت عمرؓ اندر داخل ہوئے تو چاروں طرف نظریں دوڑا کر دیکھا، سوائے ایک مصلّے کے کوئی چیز نظر نہ آئی۔

حضرت عمرؓ نے پوچھا: ''ابو عبیدہؓ تم اس میں رہتے ہو؟ یہاں تو کوئی ساز و سامان، کوئی برتن کھانے پینے اور سونے کا انتظام کچھ بھی نہیں ہے، تم یہاں کیسے رہتے ہو؟'' انھوں نے جواب دیا: ''امیر المومنین! الحمدللہ میری ضرورت کے سبھی سامان میسر ہیں، یہ مصلّیٰ ہے اس پر نماز پڑھ لیتا ہوں اور رات کو اس پر سو جاتا ہوں'' اور پھر اپنا ہاتھ اوپر چھت کی طرف اٹھایا اور وہاں سے ایک پیالہ نکالا جو نظر نہیں آ رہا تھا اور کہا: ''امیر المومنینؓ برتن یہ ہے۔'' ابو عبیدہؓ کہنے لگے: ''امیر المومنین میں دن رات تو حکومت کے سرکاری کاموں میں مصروف رہتا ہوں، کھانے وغیرہ کے انتظام کی فرصت نہیں ہوتی۔ ایک خاتون میرے لیے دو تین دن کی روٹی ایک وقت میں پکا دیتی ہے۔ میں اس روٹی کو رکھ لیتا ہوں اور جب وہ سوکھ جاتی ہے تو میں اس کو پانی میں ڈبو دیتا ہوں اور رات کو سوتے وقت کھا لیتا ہوں۔'' حضرت عمرؓ نے یہ حالت دیکھی تو آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ حضرت ابو عبیدہؓ نے کہا: ''امیر المومنین! میں آپ سے پہلے ہی کہہ رہا تھا کہ میرا مکان دیکھنے کے آپ کو آنکھیں نچوڑنے کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا......''

حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''اے ابو عبیدہؓ! دنیا کی ریل پیل نے ہم سب کو بدل دیا، مگر اللہ کی قسم تم ویسے ہی ہو جیسے رسولؐ کے زمانے میں تھے، اس دنیا نے تم پر کوئی اثر نہیں ڈالا۔''

اسی دن جلسے کے بعد جب میں بطور ایک لفٹیننٹ کرنل اپنی پُر غرور گردن اُٹھائے، ہاروں سے لدا پھندا، لوگوں کا ناچیز ہدیہ، ایک ہزار ایک روپے کی صورت جیب میں ڈالے ہوئے گھر پہنچا، تو مجھے ایک طرف سے آہستہ سی آواز سنائی دی۔

''بابو جی! بہت بہت مبارک ہو۔'' اور بھاگو نے مبارکباد دیتے وقت وہی پُرانا جھاڑو قریب ہی کے گندے حوض کے ایک ڈھکنے پر رکھ دیا اور دونوں ہاتھوں سے منڈاسا کھول دیا۔ میں بھونچکا سا کھڑا رہ گیا۔

''تم ہو؟ بھاگو بھائی!'' میں نے بہ مشکل تمام کہا۔ ''دنیا تمھیں نہیں جانتی بھاگو، تو نہ جانے...... میں تو جانتا ہوں۔ تمہارا یسوع تو جانتا ہے۔ پادری ل، آبے کے بے مثال چیلے۔ تجھ پر خدا کی رحمت ہو!''

اس وقت میرا گلا سوکھ گیا۔ بھاگو کی مرتی بیوی اور بچے کی تصویر میری آنکھوں میں کھچ گئی۔ ہاروں کے بارِ گراں سے مجھے اپنی گردن ٹوٹتی ہوئی معلوم ہوئی۔ بٹوے کے بوجھ سے میری جیب پھٹنے لگی اور...... اتنے اعزاز حاصل کرنے کے باوجود میں بے توقیر ہو کر اس قدر شناس دنیا کا ماتم کرنے لگا! ◆◆◆

میں ایک میاں ہوں

پطرس بخاری

میں ایک میاں ہوں۔ مطیع و فرمانبردار۔ اپنی بیوی روشن آرا کو اپنی زندگی کی ہر ایک بات سے آگاہ رکھنا اصول زندگی سمجھتا ہوں اور ہمیشہ اس پر کاربند رہا ہوں۔ خدا میرا انجام بخیر کرے۔ چنانچہ میری اہلیہ میرے دوستوں کی تمام عادات و خصائل سے واقف ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ میرے دوست جتنے مجھ کو عزیز ہیں اتنے ہی روشن آرا کو برے لگتے ہیں۔ میرے احباب کی جن اداؤں نے مجھے مسحور کر رکھا ہے انھیں میری اہلیہ ایک شریف انسان کے لیے باعث ذلت سمجھتی ہے۔

آپ کہیں یہ نہ سمجھ لیں کہ خدا نخواستہ وہ کوئی ایسے آدمی ہیں، جن کا ذکر کسی معزز مجمع میں نہ کیا جا سکے۔ کچھ اپنے ہنر کے طفیل اور کچھ خاکسار کی صحبت کی بدولت سب کے سب ہی سفید پوش ہیں لیکن اس بات کو کیا کروں کہ ان کی دوستی میرے گھر کے امن

شوہر کی ناگفتہ بہ حالت کا قہقہہ بار تذکرہ جس نے جذبات میں آ کر خود اپنے پاؤں پر کلہاڑی دے ماری

میں اس قدر خلل انداز ہوتی ہے کہ کچھ کہہ نہیں سکتا۔

مثلاً مرزا صاحب ہی کو لیجیے، اچھے خاصے بھلے آدمی ہیں۔ گو محکمہ جنگلات میں ایک معقول عہدے پر ممتاز ہیں لیکن شکل وصورت ایسی پاکیزہ پائی ہے کہ امام مسجد معلوم ہوتے ہیں۔ جوا...... وہ نہیں کھیلتے، گلی ڈنڈے کا انھیں شوق نہیں، جیب کترتے ہوئے کبھی وہ نہیں پکڑے گئے۔ البتہ کبوتر پال رکھے ہیں۔ انھی سے جی بہلاتے ہیں۔ ہماری اہلیہ کی یہ کیفیت ہے کہ محلے کا کوئی بدمعاش جوئے میں قید ہو جائے تو اس کی ماں کے پاس ماتم پرسی تک کو چلی جاتی ہیں۔ گلی ڈنڈے میں کسی کی آنکھ پھوٹ جائے تو مرہم پٹی کرتی رہتی ہیں۔ کوئی جیب کترا پکڑا جائے تو گھنٹوں آنسو بہاتی رہتی ہیں لیکن وہ بزرگ جن کو دنیا بھر کی زبان مرزا صاحب مرزا صاحب کہتے تھکتی نہیں، ہمارے گھر میں ''موئے کبوتر باز'' کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ کبھی بھولے سے بھی میں آسمان کی طرف نظر اُٹھا کر کسی چیل، کوے، گدھ، شکرے کو دیکھنے لگ جاؤں تو روشن آرا کو فوراً خیال ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ بھی کبوتر باز بننے لگا۔

اس کے بعد مرزا صاحب کی شان میں ایک قصیدہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیچ میں میری جانب گریز۔ کبھی لمبی بحر میں، کبھی چھوٹی بحر میں۔

ایک دن جب یہ واقعہ پیش آیا، تو میں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ اس مرزا کمبخت کو کبھی پاس نہ پھٹکنے دوں گا، آخر گھر سب سے مقدم ہے۔ میاں بیوی کے باہمی اخلاص کے مقابلے میں دوستوں کی خوشنودی کیا چیز ہے؟ چنانچہ ہم غصے میں بھرے ہوئے مرزا صاحب کے گھر گئے، دروازہ کھٹکھٹایا۔ کہنے لگے۔

''اندر آجاؤ۔'' ہم نے کہا، ''نہیں آتے تم باہر آؤ۔'' خیر اندر گئے۔ وہ بدن پر تیل مل کر ایک کبوتر کی چونچ منہ میں لیے دھوپ میں بیٹھے تھے۔ کہنے لگے: ''بیٹھ جاؤ۔'' ہم نے کہا ''بیٹھیں گے نہیں۔'' آخر بیٹھ گئے۔

معلوم ہوتا ہے ہمارے تیور کچھ بگڑے ہوئے تھے۔ مرزا بولے، ''کیوں بھئی؟ خیر باشد!'' میں نے کہا، ''کچھ نہیں۔'' کہنے لگے ''اس وقت کیسے آنا ہوا؟''

اب میرے دل میں فقرے کھولنے شروع ہوئے۔ پہلے ارادہ کیا کہ ایک دم ہی سب کچھ کہہ ڈالو اور چل دو۔ پھر سوچا کہ مذاق سمجھے گا، اس لیے کسی ڈھنگ سے بات شروع کرو لیکن سمجھ میں نہ آیا کہ پہلے کیا کہیں۔ آخر ہم نے کہا:

''مرزا! بھئی کبوتر بہت مہنگے ہوتے ہیں؟''

یہ سنتے ہی مرزا صاحب نے چین سے لے کر امریکا تک کے تمام کبوتروں کو ایک ایک کر کے گنوانا شروع کیا۔ اس کے بعد دانے کی مہنگائی کے متعلق گل فشانی کرتے رہے اور پھر محض مہنگائی پر تقریر کرنے لگے۔ اس دن تو ہم یوں ہی چلے آئے لیکن ابھی کھٹ پٹ کا ارادہ دل میں باقی تھا۔ خدا کا کرنا یہ ہوا کہ شام کو گھر میں ہماری صلح ہو گئی۔ ہم نے کہا: ''چلو اب مرزا کے ساتھ بگاڑنے سے کیا حاصل؟ چنانچہ دوسرے دن مرزا سے بھی صلح صفائی ہو گئی۔

لیکن میری زندگی تلخ کرنے کے لیے ایک نہ ایک دوست ہمیشہ کارآمد ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فطرت نے میری طبیعت میں قبولیت اور صلاحیت کوٹ کوٹ کر بھر دی ہے کیونکہ ہماری اہلیہ کو ہم میں ہر وقت کسی نہ کسی دوست کی عادات کی جھلک نظر آتی رہتی ہے۔ یہاں تک کہ میری اپنی ذاتی شخصی سیرت بالکل ہی ناپید ہو چکی ہے۔

شادی سے پہلے ہم کبھی کبھی دس بجے اُٹھا کرتے تھے ورنہ گیارہ بجے۔ اب کتنے بجے اُٹھتے ہیں؟ اس کا اندازہ وہی لوگ لگا سکتے ہیں جن کے گھر ناشتا زبردستی صبح کے سات بجے کروا دیا جاتا ہے اور اگر ہم کبھی بشری کمزوری کے تقاضے سے مرغوں کی طرح تڑکے اُٹھنے میں کوتاہی کریں تو فوراً ہی کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ اس نکھٹو نسیم کی صحبت کا نتیجہ ہے۔

ایک دن صبح صبح ہم نہا رہے تھے۔ سردی کا موسم، ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے۔ صابن سر پر ملتے تھے تو ناک میں گھستا تھا کہ

اتنے میں ہم نے خدا جانے کس پراسرار جذبے کے ماتحت غسل خانے میں الاپنا شروع کیا اور پھر گانے لگے ''توری چھل بل ہے نیاری.........۔'' اس کو ہماری انتہائی بدمذاقی سمجھا گیا اور اس بدمذاقی کا اصل منبع ہمارے دوست پنڈت جی کو ٹھہرایا گیا لیکن حال ہی میں مجھ پر ایک ایسا سانحہ گزرا ہے کہ میں نے تمام دوستوں کو ترک کر دینے کی قسم کھا لی ہے۔

تین چار دن پہلے کا ذکر ہے۔ صبح کے وقت روشن آرا نے مجھ سے میکے جانے کے لیے اجازت مانگی۔ جب سے ہماری شادی ہوئی ہے روشن آرا صرف دو دفعہ میکے گئی ہے اور پھر اس نے کچھ اس سادگی اور عجز سے کہا کہ میں انکار نہ کر سکا۔ کہنے لگی۔ ''تو پھر میں ڈیڑھ بجے کی گاڑی میں چلی جاؤں؟'' میں نے کہا: ''اور کیا؟''

وہ جھٹ تیاری میں مشغول ہو گئی اور میرے دماغ میں آزادی کے خیالات چکر لگانے لگے۔ یعنی اب بے شک دوست آئیں، اودھم مچائیں۔ میں گاؤں، جب چاہوں اُٹھوں۔ چاہے تھیٹر جاؤں۔ میں نے کہا:

''روشن آرا جلدی کرو۔ نہیں تو گاڑی چھوٹ جائے گی۔''

ساتھ اسٹیشن گیا۔ جب گاڑی میں سوار کروا چکا تو کہنے لگی:

''خط روز لکھتے رہیے۔'' میں نے کہا: ''ہر روز اور تم بھی۔''

''کھانا وقت پہ کھا لیا کیجیے اور ہاں دھلی ہوئی جرابیں اور رومال الماری کے نچلے خانے میں پڑے ہیں۔''

اس کے بعد ہم دونوں خاموش ہو گئے اور ایک دوسرے کا چہرہ دیکھتے رہے۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ میرا دل بھی بیتاب ہونے لگا اور جب گاڑی روانہ ہوئی تو میں دیر تک مبہوت پلیٹ فارم پر کھڑا رہا۔

آخر آہستہ آہستہ قدم اُٹھاتا کتابوں کی دکان تک آیا اور رسالوں کے ورق پلٹ پلٹ کر تصویریں دیکھتا رہا۔ ایک اخبار خریدا۔ تہ کر کے جیب میں ڈالا اور عادت کے مطابق گھر کا ارادہ کر لیا، پھر خیال آیا کہ اب گھر جانا ضروری نہیں رہا۔ اب جہاں چاہوں جاؤں، چاہوں تو گھنٹوں اسٹیشن پر ہی ٹہلتا رہوں۔ دل چاہتا تھا قلابازیاں کھاؤں۔

کہتے ہیں جب افریقا کے وحشیوں کو کسی تہذیب یافتہ ملک میں کچھ عرصہ کے لیے رکھا جاتا ہے تو وہ وہاں کی شان وشوکت سے بہت متاثر ہوتے ہیں لیکن جب واپس جنگلوں میں پہنچتے ہیں تو خوشی کے مارے چیخیں مارتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی کیفیت میرے دل کی بھی ہو رہی تھی۔ بھاگتا ہوا اسٹیشن سے آزادانہ باہر نکلا۔ آزادی کے لہجے میں تانگے والے کو بلایا اور کود کر اس میں سوار ہو گیا۔ سگریٹ سلگا لیا، ٹانگیں سیٹ پر پھیلا دیں اور کلب کو روانہ ہو گیا۔

راستے میں ایک بہت ضروری کام یاد آ گیا۔ تانگا موڑ کر گھر کی طرف پلٹا۔ باہر ہی سے نوکر کو آواز دی۔

''امجد!''

''جی حضور!''

''دیکھو، حجام کو جا کے کہہ دو کہ کل گیارہ بجے آئے۔''

''بہت اچھا۔''

''گیارہ بجے سن لیا نا؟ کہیں روز کی طرح پھر چھے بجے وارد نہ ہو جائے۔''

''بہت اچھا حضور۔''

''اور اگر گیارہ بجے سے پہلے آئے تو دھکے دے کر باہر نکال دو۔''

یہاں سے کلب پہنچے۔ آج تک کبھی دن کے دو بجے کلب نہ گیا تھا۔ اندر داخل ہوا تو سنسان، آدمی کا نام ونشان تک نہیں۔ سب کمرے دیکھ ڈالے۔ بلیئرڈ کا کمرا خالی، شطرنج کا کمرا خالی، تاش کا کمرا خالی۔ صرف کھانے کے کمرے میں ایک ملازم چھریاں تیز کر رہا تھا۔

اس سے پوچھا: کیوں بے آج کوئی نہیں آیا؟''

کہنے لگا: ''حضور آپ تو جانتے ہی ہیں۔ اس وقت بھلا کون آتا ہے؟''

بہت مایوس ہوا۔ باہر نکل کر سوچنے لگا کہ اب کیا کروں؟ اور کچھ نہ سوجھا تو وہاں سے مرزا صاحب کے گھر پہنچا۔ معلوم ہوا، ابھی دفتر سے واپس نہیں آئے۔ دفتر پہنچا۔ دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میں نے سب حال بیان کیا۔ کہنے لگے: "تم باہر کے کمرے میں ٹھہرو۔ تھوڑا سا کام رہ گیا ہے۔ بس ابھی بھگتا کے تمہارے ہی ساتھ چلتا ہوں۔ شام کا پروگرام کیا ہے؟"

میں نے کہا: "تھیٹر۔"

کہنے لگے۔ "بس بالکل ٹھیک ہے۔ تم باہر بیٹھو۔ میں ابھی آیا۔"

باہر کے کمرے میں ایک چھوٹی سی کرسی پڑی تھی۔ اس پر بیٹھ کر انتظار کرنے لگا اور جیب سے اخبار نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ شروع سے آخر تک سب پڑھ ڈالا اور اب بھی چار بجنے میں ایک گھنٹہ باقی تھا۔ پھر سے پڑھنا شروع کر دیا۔ سب اشتہار پڑھ ڈالے اور پھر سب اشتہاروں کو دوبارہ پڑھ ڈالا۔ آخر کار اخبار پھینک کر بغیر کسی تکلف یا لحاظ کے جمائیاں لینے لگا۔ جمائی پر جمائی حتیٰ کہ جبڑوں میں درد ہونے لگا۔

اس کے بعد ٹانگیں ہلانا شروع کیں لیکن اس سے بھی تھک گیا۔ پھر میز پر طبلے کی گتیں بجاتا رہا۔ بہت تنگ آ گیا تو دروازہ کھول کر مرزا سے کہا۔ "ابے یار اب چلتا بھی ہے کہ مجھے انتظار ہی میں مار ڈالے گا۔ مردود کہیں کا، سارا دن میرا ضائع کر دیا۔"

وہاں سے اُٹھ کر مرزا کے گھر گئے۔ شام بڑے لطف میں کٹی۔ کھانا کلب میں کھایا اور وہاں سے دوستوں کو ساتھ لیے تھیٹر گئے۔ رات کے ڈھائی بجے گھر لوٹے۔ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ نیند نے بے ہوش کر دیا۔

صبح آنکھ کھلی تو کمرے میں دھوپ لہریں مار رہی تھی۔ گھڑی میں وقت دیکھا تو پونے گیارہ بجے تھے۔ ہاتھ بڑھا کر میز پر سے ایک سگریٹ اُٹھایا اور سلگا کر طشتری میں رکھ دیا اور پھر اونگھنے لگا۔

گیارہ بجے امجد کمرے میں داخل ہوا کہنے لگا: "حضور حجام آیا ہے۔"

ہم نے کہا: "یہیں بلا لاؤ۔" یہ عیش مدت کے بعد نصیب ہوا کہ بستر پر لیٹے لیٹے حجامت بنوا لیں۔ اطمینان سے اُٹھے اور نہا دھو کر باہر جانے کے لیے تیار ہوئے لیکن طبیعت میں وہ شگفتگی نہ تھی جس کی اُمید لگائے بیٹھے تھے۔ چلتے وقت الماری سے رومال نکالا تو خدا جانے کیا خیال دل میں بھر آیا۔ وہیں کرسی پر بیٹھ گیا اور سودائیوں کی طرح اس رومال کو تکتا رہا۔ الماری کا ایک اور خانہ کھولا تو سرمئی رنگ کا ایک ریشمی ڈوپٹا نظر آیا۔ باہر نکالا، ہلکی ہلکی عطر کی خوشبو آ رہی تھی۔ بہت دیر تک اس پر ہاتھ پھیرتا رہا دل بھر آیا۔ گھر سونا معلوم ہونے لگا۔ بہتیرا اپنے آپ کو سنبھالا لیکن آنسو ٹپک ہی پڑے۔ آنسوؤں کا گرنا تھا کہ بیتاب ہو گیا اور سچ مچ رونے لگا۔ سب جوڑے باری باری نکال کر دیکھے لیکن نہ معلوم کیا کیا یاد آیا کہ اور بھی بے قرار ہوتا گیا۔

آخر نہ رہا گیا۔ باہر نکلا اور سیدھا تار گھر پہنچا۔ وہاں سے تار دیا: "میں بہت اُداس ہوں۔ تم فوراً آ جاؤ!"

تار دینے کے بعد دل کو کچھ اطمینان ہوا۔ یقین تھا کہ روشن آرا جس قدر جلد ہو سکے گا آ جائے گی۔ اس سے کچھ ڈھارس بندھ گئی اور دل پر سے جیسے ایک بوجھ ہٹ گیا۔

دوسرے دن دوپہر کو مرزا کے مکان پر تاش کا معرکہ گرم ہونا تھا۔ وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ مرزا کے والد سے کچھ لوگ ملنے آئے ہیں۔ اس لیے تجویز یہ ٹھہری کہ یہاں سے کسی اور جگہ سرک چلو۔ ہمارا مکان تو خالی تھا ہی۔ سب یار لوگ وہیں جمع ہوئے۔ امجد سے کہہ دیا گیا کہ حقے میں اگر ذرا بھی خلل واقع ہوا تو تمہاری خیر نہیں اور پان اس طرح سے متواتر پہنچتے رہیں کہ بس تانتا لگ جائے۔

اب اس کے بعد کے واقعات کو کچھ مرد ہی اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں۔ شروع شروع میں تو تاش باقاعدہ اور باضابطہ ہوتا رہا۔ جو کھیل بھی کھیلا گیا بہت معقول طریقے سے، قواعد و ضوابط کے مطابق اور متانت و سنجیدگی کے ساتھ لیکن ایک دو گھنٹے کے بعد

کچھ خوش طبعی شروع ہوئی۔ یار لوگوں نے ایک دوسرے کے پتے دیکھنے شروع کر دیے۔ یہ حالت تھی کہ آنکھ بچی نہیں اور ایک آدھ کام کا پتہ اُڑا نہیں اور ساتھ ہی قہقہے پر قہقہے اُڑنے لگے۔

تین گھنٹے کے بعد یہ حالت تھی کہ کوئی گھٹنا ہلا ہلا کر گا رہا ہے کوئی فرش پر بازو ٹیکے بجا رہا ہے۔ کوئی تھیٹر کا ایک آدھ مزاحیہ فقرہ لاکھوں دفعہ دہرا رہا ہے لیکن تاش برابر ہو رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دھول دھپا شروع ہو گیا۔ ان خوش فعلیوں کے دوران میں ایک مسخرے نے ایک ایسا کھیل تجویز کر دیا، جس کے آخر میں ایک آدمی بادشاہ بن جاتا ہے۔ دوسرا وزیر، تیسرا کوتوال اور جو سب سے ہار جائے وہ چور۔ سب نے کہا:

"واہ واہ! کیا بات کہی۔" ایک بولا:

"پھر آج جو چور بنا اس کی شامت آ جائے گی۔"

دوسرے نے کہا: "اور نہیں تو کیا۔ بھلا کوئی ایسا ویسا کھیل ہے۔ سلطنتوں کے معاملے ہیں، سلطنتوں کے۔"

کھیل شروع ہوا۔ بدقسمتی سے ہم چور بن گئے۔ طرح طرح کی سزائیں تجویز ہونے لگیں۔ کوئی کہے، "ننگے پاؤں بھاگتا ہوا جائے اور حلوائی کی دکان سے مٹھائی خرید کر لائے۔"

کوئی کہے، "نہیں حضور! سب کے پاؤں پڑے اور ہر ایک سے دو دو چانٹے کھائے۔" دوسرے نے کہا: "نہیں صاحب ایک پاؤں پر کھڑا ہو کر ہمارے سامنے ناچے۔"

آخر میں بادشاہ سلامت بولے: "ہم حکم دیتے ہیں کہ چور کو کاغذ کی ایک لمبوتری نوک دار ٹوپی پہنائی جائے اور اس کے چہرے پر سیاہی مل دی جائے۔ یہ اسی حالت میں جا کر اندر سے حقے کی چلم بھر کر لائے۔" سب نے کہا:

"کیا دماغ پایا ہے حضور نے! کیا سزا تجویز کی ہے! واہ واہ۔"

ہم بھی مزے میں آئے ہوئے تھے سو کہا: "تو ہوا کیا؟ آج ہم ہیں کل کسی اور کی باری آ جائے گی۔"

نہایت خندہ پیشانی سے اپنے چہرے کو پیش کیا۔ ہنس ہنس کر وہ بیہودہ سی ٹوپی پہنی۔ ایک شان استغنا کے ساتھ چلم اُٹھائی اور زنانے کا دروازہ کھول کر باورچی خانے کو چل دیے۔ ہمارے پیچھے کمرا قہقہوں سے گونج رہا تھا۔

صحن میں پہنچے ہی تھے کہ باہر کا دروازہ کھلا اور ایک برقع پوش خاتون اندر داخل ہوئی۔ منہ سے برقعہ اُلٹا تو روشن آرا۔

دم خشک ہو گیا۔ بدن پر ایک لرزہ سا طاری ہو گیا۔ زبان بند ہو گئی۔ سامنے وہ روشن آرا جس کو میں نے تار دے کر بلایا تھا کہ "تم فوراً آ جاؤ میں بہت اُداس ہوں۔" اپنی یہ حالت کہ منہ پر سیاہی ملی ہے، سر پر وہ لمبوتری سی کاغذ کی ٹوپی پہن رکھی ہے اور ہاتھ میں چلم اُٹھائے کھڑے ہیں اور مردانے کمرے سے قہقہوں کا شور برابر آ رہا ہے۔ روح منجمد ہو گئی اور تمام حواس نے جواب دے دیا۔

روشن آرا کچھ دیر تک چپکی کھڑی دیکھتی رہی اور پھر کہنے لگی............

بس میں کیا بتاؤں کہ کیا کہنے لگی؟ اس کی آواز تو میرے کانوں تک جیسے بیہوشی کے عالم میں پہنچ رہی تھی۔

اب تک آپ اتنا تو جان گئے ہوں گے کہ میں بذات خود ازحد شریف واقع ہوا ہوں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں۔ مجھ سے بہتر میاں دنیا پیدا نہیں کر سکتی۔ میری سسرال میں سب کی یہی رائے ہے اور میرا اپنا ایمان بھی یہی ہے لیکن ان دوستوں نے مجھے رسوا کر دیا ہے۔ اس لیے میں نے مصمم ارادہ کر لیا ہے کہ اب یا گھر میں رہوں گا یا کام پر جایا کروں گا۔ کسی سے ملوں گا اور نہ کسی کو اپنے گھر آنے دوں گا سوائے ڈاکیے یا حجام کے اور ان سے بھی نہایت مختصر باتیں کروں گا۔

"خط ہے؟"

"جی ہاں۔"

"دے جاؤ۔ چلے جاؤ۔"

"ناخن تراش دو۔"

"بھاگ جاؤ۔"

بس، اس سے زیادہ کلام نہ کروں گا۔ آپ دیکھئے تو سہی!

سمیرا امام

حریص

ابا نے جلدی جلدی ہاتھ میں دابے پیسے گنے پھر انھیں ایک دھاگے سے باندھ ہاتھ میں پکڑے چاکلیٹ یا بسکٹ کے خالی کاغذ میں لپیٹ لیے۔ اس کے بعد چور نظروں سے چاروں اطراف کا جائزہ لیا۔ کسی کے نہ ہونے کی اچھی طرح سے تسلی کی اور پھر پیسے شلوار میں بنی جیب میں ڈال مطمئن ہو کر بیٹھ گئے۔

عینا نے ابا کی اس حرکت کو آج دوسری بار نوٹ کیا تھا۔ وہ شدید الجھن کا شکار ہوگئی۔ ابا جی کی کچھ حرکتیں آج کل نہایت مشکوک ہوتی جاتی تھیں۔ پہلے پہل عینا کو شدید جھٹکا تب لگا جب اس نے ابا کے دھلنے والے کپڑوں میں سے پیسے نکال کے ابا جی کو پکڑائے تو وہ اسے شدید برہم لگے۔ جیسے کوئی اپنا پوشیدہ راز پتا لگنے پر غصے میں آجاتا ہے۔ تب تو اُس نے غور نہ کیا لیکن دوسری مرتبہ جب ابا نے بڑے بھیا کو اس بات پر سخت سست سنائیں کہ بھیا انھیں پیسے بھیجنے میں دیر کر رہے ہیں جبکہ ان کے پاس ڈاکٹر کو دکھانے کے لیے پھوٹی کوڑی تک نہیں۔

عینا کو اس بیان پر شدید حیرت یوں ہوئی کہ بھیا ہر ماہ باقاعدگی سے رقم بھیجا کرتے اور ابا کے پاس ہمہ وقت خاصی تگڑی رقم موجود ہوا کرتی جس میں سے ایک روپیہ بھی وہ خود پر خرچ نہیں کرتے تھے لیکن ہر ماہ کے آغاز میں بھیا سے پیسوں کے معاملے میں بحث ضرور کیا کرتے۔ پیسوں میں ایک دن کی تاخیر انھیں اُداس اور پریشان کر دیا کرتی۔ عینا نے ابا کو اس سے پہلے کبھی پیسوں کے معاملے میں اس رویے کا شکار ہوتے نہیں دیکھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابا کی یہ سب حرکتیں اسے روز بہ روز الجھا رہی تھیں۔

اسے یاد پڑتا تھا جب ابا خود کماتے تھے تو وہ کس قدر فیاض تھے۔ کتنی بیواؤں کا خرچ اُٹھاتے۔ نہایت خوش لباس تھے۔ نہ صرف یہ کہ اپنے لباس کا خیال رکھتے بلکہ اماں اور خود بچوں کا لباس بھی بہترین اور شاندار خریدنے پر یقین رکھتے۔ پیسے کو ہاتھ کا میل سمجھتے اور کہا کرتے:

”بچے! اپنے مال کو خود پر اور دوسروں پر خرچ کیا کرو۔ جو لوگ اپنے ہاتھ سے صدقات وخیرات نہیں دیتے وہ یہ گمان کیسے کر سکتے ہیں کہ ان کے بعد اولاد ان کے لیے صدقہ دے گی۔“ لہٰذا ابا انفاق فی سبیل اللہ کا اہتمام بھی کرتے اور گھر والوں پر بھی کبھی پیسے کی تنگی نہ رکھی لیکن پھر اب انھیں کیا ہوگیا تھا۔

اُسے شدت سے محسوس ہو رہا تھا کہ ابا پیسہ انتہائی ضرورت کے وقت خرچ کرتے اور خرچ کرتے ہوئے پریشان سے ہو جایا کرتے۔ خرچ کرنے کے بعد سارا دن چھپ چھپ کے گنتی کیا کرتے کہ کتنے کم ہوگئے۔ پھر انھیں ایسے چھپا کے رکھتے کہ اگر کوئی اُن سے پیسوں کی بابت پوچھتا بھی تو ابا کی ناراضی اور غصے کا سبب بنتا۔ بچوں پر خرچ کرنا وہ آہستہ آہستہ چھوڑ چکے تھے۔

عینا انھیں ہمہ وقت پیسوں کی فکر میں مبتلا دیکھتے دیکھتے اب باقاعدہ چڑنے لگی تھی لیکن اسے یہ سمجھ نہ آتی کہ وہ کیسے ابا سے اس معاملے پر بات کرے؟ یا کسی اور سے اس کا تذکرہ کیسے کرے؟ اُسے محسوس ہونے لگا تھا کہ گزرتی عمر کے ساتھ ابا شاید پیسوں کے معاملے میں حریص ہونے لگے ہیں اور یہی بات عینا کی چڑ کا باعث بننے لگی تھی۔ وہ جان بوجھ کر ابا سے پیسوں کا سوال کرتی اور ابا صاف انکار کر کے اسے مزید چڑاتے۔

ایک رات ابا سوئے تو پھر صبح نہیں اُٹھے۔ بھیا نے ابا کو غسل دیتے وقت ان کے کپڑے عینا کو لا پکڑائے۔ ابا کی جیب سے وہی چاکلیٹ کا ریپر نکلا جس میں انھوں نے پیسے رکھے تھے۔ مبلغ پچیس ہزار روپے جس کے ساتھ ایک پرچی موجود تھی۔

”میرے اُوپر کسی کا ایک آنہ بھی قرض نہیں۔ میرا کفن الماری میں پڑا ہے۔ مجھے اسی میں دفنایا جائے۔ میری جیب میں پڑے پیسے میری تدفین کے لیے کافی ہوں گے۔“

......اور عینا کو سکتا ہوگیا۔ پھر وہ باقی سب پیسے کہاں گئے جو ابا نے خود پر کبھی نہ لگائے تھے۔ یہ راز ابا کے ساتھ ہی دفن ہوگیا لیکن عینا جان گئی تھی کہ جسے وہ پیسوں کے لیے ابا کی حرص سمجھتی تھی وہ ابا کا خود کو غیر محفوظ خیال کرنا تھا۔

جو انسان ساری عمر اپنی کمائی لوگوں پہ لگاتا رہا ہو، اسے آخری عمر میں تحفظات لاحق ہو جاتے ہیں کہ کسی روز شاید اس کی اولاد اسے تنہا چھوڑ دے گی۔ شاید جب انھیں ضرورت پڑے تو وہ دستِ سوال دراز نہ کر پائیں۔

جب سب بہن بھائی ابا کی جدائی میں رو رہے تھے......

عینا ابا کی بے بسی محسوس کر کے زار وقطار رو پڑی۔

ایک دُور اندیش باپ کا قصہ، جس کی خودمختاری نے اُسے مشکوک بنا ڈالا

ڈاکٹر ایس ایم معین قریشی

ہمارے ایک بزرگ کہا کرتے تھے کہ مہمان خدا کی رحمت کا فوّارہ ہوتا ہے۔ انھیں اندازہ نہ تھا کہ بعض مہمان اپنے میزبان کے گناہوں کا کفارہ ہوتا ہے۔ اس کے رخصت ہوجانے کے بعد بے چارہ میزبان شکر کا ٹھنڈا سانس بھر کے غالبؔ کا یہ مصرع پڑھتا ہے

ع دھوئے گئے ہم ایسے کہ بس پاک ہو گئے۔

گزشتہ ہفتے جیسے ہی ہمیں اپنے بچپن کے دوست شاہ صاحب کا لندن سے کراچی آمد کا فون موصول ہوا۔ ہم نے اپنے گھر میں ایمرجنسی کا اعلان کر دیا۔ ہم ان کے قدیم مزاج شناس ہیں اور جانتے ہیں کہ وہ اپنی مرضی کے خلاف کوئی بات

وہ جائیں گھر سے ہمارے

بن بلائے ایسے مہمان کا تذکرہ جو آپ کو قہقہے لگانے اور میزبان سے ہمدردی پر مجبور کر دے گا

برداشت نہیں کرتے اور نہ ہی اپنے جذبات کے اظہار میں کوئی تکلّف برتنے کے روادار ہیں۔ بیگم سے ہم نے مؤدبانہ التجا کی کہ گھر کی صفائی ستھرائی کا خصوصی اہتمام کریں اور اس مقصد کے لیے اپنی والدہ اور بہنوں کی خدمات بھی حاصل کر لیں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ بچوں کو وارننگ دی کہ اپنی آوازوں کا والیوم ہلکا رکھیں اس لیے کہ شاہ صاحب کے کان اس شور سے نا آشنا ہیں۔ (موصوف دادا جان کی عمر کو پہنچنے کے باوجود خیر سے مجرّد ہیں اور شاید اسی لیے خاصے مجرب ہیں۔)

وہ پچیس سال بعد مختصر عرصے کے لیے کراچی آ رہے تھے۔ فولادی دل اور بارودی دماغ کے حامل ہیں اور جانتے ہیں کہ ہمارے سوا کوئی بھی ان کے ناز نخرے اُٹھانے کا متحمل نہیں ہو سکتا چنانچہ انھوں نے کسی اور کو اپنے آنے کا اطلاع نہیں دی تھی۔

وقتِ معیّنہ پر ہم ان کے استقبال کے لیے ہوائی اڈّے پہنچ گئے۔ طویل انتظار اور اس اثنا میں کسٹمز کی ''ضروریات'' کی تکمیل کے بعد شاہ صاحب بالآخر لاؤنج میں نمودار ہوئے۔ بقول ان کے، پرواز دردِ زہ سے زیادہ تکلیف دہ ثابت ہوئی (خدا جانے اس کا اندازہ انھوں نے کیسے لگالیا؟) باہر آ کر ہم نے انھیں بڑوں کی آزمودہ، بچوں کی ناپسندیدہ اپنی سوزوکی وین میں بیٹھنے کی پیشکش کی تو تیوری چڑھا کر بولے:

''یہ تو لکھنؤ کے کسی بگڑے نواب کا تانگا لگتی ہے۔ کوئی مہذب گاڑی میسّر نہیں آپ کو؟'' ہم نے احساس ندامت پر قابو پاتے ہوئے جواب دیا:

''اس گاڑی کے رنگ ڈھنگ اور زنگ پر نہ جائیں۔ یہ ہمارے مختصر سے نقل پزیر اثاثوں کا اٹوٹ انگ ہے لیکن چلنے میں تنگ نہیں کرتی۔ آپ اس میں بے خطر کود پڑیں۔''

فرمانے لگے: ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم نے اپنی چالیس سالہ ملازمت میں اور کچھ نہیں بنایا۔''

''کیوں نہیں؟'' ہم نے ان کی تصحیح کی: ''اس کے علاوہ ایک عدد بیوی اور نصف درجن بچے بھی ان اثاثوں میں شامل ہیں۔'' وہ بُرا سامنہ بنا کر خاموش ہو گئے اور بادلِ نخواستہ گاڑی میں بیٹھ گئے لیکن بیٹھتے وقت ان کا انداز ہُو بہو ایسا تھا جیسے ہماری آنے والی نسلوں پر احسانِ عظیم کر رہے ہوں۔

راستے میں سڑک کے ہر جھٹکے پر شاہ صاحب اپنے چہرے پر اس مخصوص تکلیف کا تاثر دیتے جس کا اظہار انھوں نے فلائٹ کے ضمن میں کیا تھا۔ پھر بار بار آتشیں نظروں سے ہمیں گھورتے جیسے ہم ہی اس کے ذمے دار ہوں۔ یہی نہیں بلکہ وہ لندن کی سڑکوں، وہاں کے قانون پسند لوگوں اور صاف ستھرے ماحول کا ہمارے عروس البلاد سے بلا جواز موازنہ کر کے ہمارے قلب نازک کو سنگسار کرتے رہے۔

اللہ اللہ کر کے ہم شاہ صاحب کو لے کر گھر پہنچے جسے باہر سے دیکھ کر ان کا پہلا تبصرہ یہ تھا: ''تم نے واقعی شادی کے علاوہ کچھ نہیں کیا اور میں نے شادی کے علاوہ سب کچھ کیا ہے۔ (اب انھیں کون سمجھائے کہ جو شادی کر لیتا ہے وہ کچھ اور کرنے کے قابل کہاں رہ جاتا)

شاہ صاحب کو تین کمروں کے مکان کا 33 فیصد حصہ دے کر ہمارا خیال تھا کہ ہم نے حاتم طائی کی قبر کے ساتھ وہی کچھ سلوک کیا ہے جو اشرف طائی صاحب اپنی فری کک کے ذریعے مخالف کے جبڑے کے ساتھ کیا کرتے تھے۔ چناں چہ ہم نے داد طلب نظروں سے ان کی طرف دیکھا۔ تاہم انھوں نے بے رُخی سے آنکھیں پھیر لیں جیسے کہہ رہے ہوں ؎

دونوں جہان دے کے وہ سمجھے یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

شاہ صاحب نے اچھا کیا کہ اپنے اوامر و نواہی کی ایک مکمل فہرست ہمیں آتے ہی مہیا کر دی جس سے ہمارے مصائب میں قدرے کمی واقع ہو گئی۔ مزید طمانیت ان کی اس اطلاع سے حاصل ہوئی کہ وہ لندن سے ہمارے لیے قیمتی

تحائف لے کر آئے ہیں۔ کھانے کا وقت آیا تو ہم انھیں ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل میں لے گئے کیوں کہ گھر کا کھانا ان کی طبعِ نازک سے لگا نہیں کھاتا تھا۔ انھوں نے مینو کارڈ کے بغور مطالعے اور بیرے کے تفصیلی انٹرویو کے بعد فش پر مبنی اپنی پسندیدہ ڈش کا آرڈر دے دیا۔ کھانے کا پہلا لقمہ لیتے ہی ترش لہجے میں بولے: ''اس ہوٹل کے مالک کا کیا نام ہے اور وہ اس وقت کہاں دستیاب ہوگا؟''

''کیا ایف آئی آر کٹوانی ہے؟'' ہم نے دریافت کیا۔ اس پر انھوں نے بگڑ کر کہا: ''سوال پر سوال کی عادت مجھے ہرگز اچھی نہیں لگتی۔ تم سے جو پوچھ رہا ہوں وہی بتاؤ۔''

پھر پلیٹ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے برسے: ''یہ کھانا ہے؟ معلوم ہوتا ہے افسران بالا اور صاحبانِ اقتدار کے لیے خاص طور پر تیار کیا گیا ہے جسے وہ بلا قیمت خوشی خوشی کھا کر چلے جاتے ہیں لیکن تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ ''مفتی'' کا یہ بلند مرتبہ تمھارے جیسے چھوٹے موٹے افسر کو حاصل نہیں ہو جاتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ بندہ اچھی حیثیت، بے عیب شہرت اور عیب دار کردار کا مالک ہو۔ تم کس کھیت کی مولی ہو۔''

اس سے قبل کہ وہاں لاء اینڈ آرڈر کا کوئی مسئلہ پیدا ہوتا، ہم نے کھانے کا بل (مع ٹپ) ادا کر کے ایک دوسرے ہوٹل کی راہ لی۔ اس طرح تین ہوٹلوں میں کھانا چکھنے اور بیرے کے ساتھ اسی ''حسنِ سلوک'' کے بعد شاہ صاحب نے چوتھے ہوٹل میں کھانا کھایا۔ (بقول اُن کے زہر مار کیا)

بعد ازاں اس پر یہ رائے زنی فرمائی: ''اس ہوٹل کا کھانا ذرا کم بدذائقہ تھا لہٰذا آئندہ بھی یہیں آئیں گے۔ رہی دُور کی تکلیف، سو وہ میں تمہاری خاطر برداشت کر لوں گا۔'' رات کو انھوں نے اپنے موبائل پر مغربی موسیقی لگا کر ناول کا مطالعہ شروع کر دیا۔ ہمیں اس ناول کا صرف ٹائٹل دیکھنے کی سعادت نصیب ہوئی۔ خاصا مفرح قلب تھا اور اس سے مندرجات کا اندازہ لگانا مشکل نہ تھا۔ بہرحال اس قسم کی موسیقی اور ایسا ہی ناول ان کا روز کا معمول بن گیا۔

آدھی رات کے بعد بہت دیر تک موسیقی کی کرخت آوازیں گھر کے تمام افراد کو بے آرام کیے رکھتیں لیکن اس کا ایک خوشگوار پہلو یہ تھا کہ جب تک وہ ہمارے یہاں قیام پزیر رہے، اس غیر مترنم اور بے ہنگم شور کے باعث علاقے میں بھونکنے والے کتوں کی آوازیں دبی رہیں!

پہلی رات ہی انھوں نے فرمان جاری کر دیا کہ ''بیڈ ٹی'' صبح پانچ بجے نوش جاں کریں گے۔ اس کے بعد سو گیں گے تو اپنی مرضی سے اُٹھیں گے (اگرچہ دوسرا کوئی کام بھی انھوں نے ہماری مرضی سے نہیں کیا تھا)۔ اہلِ خانہ نے وہ رات آنکھوں اور باتوں میں کاٹی۔ ہم سب کو یہ فکر دامن گیر تھی کہ وہ لندن سے کیا تحفے لے کر آئے ہیں۔ پورنیل ٹی وی سے لے کر پرسنل کمپیوٹر اور ہیرے کے ہار تک، ہر امکان پر غور کیا گیا۔ بیگم کا مشورہ تھا کہ صبح پوچھ ہی لیں گے لیکن چوں کہ بقول جوش

ع ابھی اگلی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں

اس لیے ہم نے اس مشورے کو اپنی عزتِ نفس کے خلاف سمجھا۔ صبح ہم نے شاہ صاحب کو ان کے فلک شگاف خراٹوں کے ساتھ بستر پر چھوڑا اور دفتر روانہ ہو گئے۔ شام کو گھر لوٹے تو شاہ صاحب کا پیغام ملا کہ وہ اپنے کسی عزیز کے یہاں گئے ہیں۔ ہمارے لیے حکم یہ تھا کہ رات کے کھانے سے پہلے ان کو وہاں سے اُٹھا لیں۔ ہم نے حکم کی تعمیل کی۔ مقررہ ہوٹل سے انھیں کھانا کھلانے کے بعد راستے میں ہمیں ایک بار پھر اپنے ملک کے بارے میں وہ سب کچھ سننا پڑا جسے جانتے ہوئے بھی ہم انجان بننے کی کوشش کرتے ہیں۔ (شاہ صاحب نے اسے بے حسی سے تعبیر کیا۔ کیسی زیادتی کی بات ہے؟ کم از کم مہمان کو اس قسم کی صاف گوئی زیب نہیں دیتی)

گھر پہنچ کر انھوں نے ہماری بیگم سے پہلا سوال یہ کیا:

''بھابی، آپ نے میرے کپڑے دھو کر استری کر دیے؟'' جواب اثبات میں ملا تو ایسا لگا کہ ان کے چہرے کی کئی شکنوں پر استری پھر گئی ہے۔ ساتھ ہی موصوف نے خفیف سی آواز میں شکر یہ ادا کیا۔ اب بیگم کا بھی کچھ حوصلہ بڑھا۔ چہک کر بولیں:

''بھائی صاحب! یہ تو میرا فرض تھا۔ اب دیکھیے نا آپ بھی تو اتنے خلوص سے ہمارے لیے لندن سے تحفے لائے ہیں جو یقیناً بہت قیمتی ہوں گے۔''

شاہ صاحب نے اس بات کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا بلکہ موضوع بدلنے کے لیے ہمارے ٹی وی پروگراموں کے غیر معیاری ہونے کا شکوہ کرنے لگے۔ بعد ازاں ان کی تفریحِ طبع کے خیال سے ہم نے اپنا الکوٹا ٹی وی (مع ریموٹ کنٹرول) ان کے کمرے میں رکھ دیا کہ اپنی مرضی سے چینل گھماتے رہیں۔

شاہ صاحب نے تقریباً ایک ہفتہ ہمارے غریب خانے کو غریب تر کیے رکھا۔ اس دوران ہم نے ایک فرمانبردار اور صابر وشاکر شوہر کی طرح اُن کی خدمت میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ ہم تو خیر اس جبری مشقت کے عادی ہیں لہٰذا یہ صدمہ سہہ گئے لیکن بیگم اور بچوں کے لیے ان کا قیام نا قابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ ہم نے ان سب کو پرانی دوستی اور ان کے لائے ہوئے تحفوں کے ناتے قابو میں رکھا۔ آخر کار ان کی جدائی کا خوشگوار لمحہ آن پہنچا۔ ایک روز ناشتے پر انھوں نے یہ فرحت بخش خبر سنائی کہ آج شام میں یہاں سے رخصت ہو جاؤں گا۔ ہم نے چہرے پر مصنوعی افسردگی کے تاثرات دیتے ہوئے کہا:

''ایسی بھی کیا جلدی ہے؟ آپ کو آئے ہوئے دن ہی کتنے ہوئے ہیں؟ یہ تو وہی کیفیت ہو گئی جس کا نقشہ غالب نے اپنے محبوب کی آمد و روانگی کے ضمن میں کھینچا تھا۔

بجلی اک کوندگئی آنکھوں کے آگے تو کیا
بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا''

کہنے لگے: ''اب بہت ہو گیا اور ہاں میری فلائٹ کے وقت آپ آفس میں ہوں گے لہٰذا مجھے رخصت کرنے کی زحمت نہ فرمائیں۔'' ہمارے منہ سے نکل گیا: ''زحمت کیا، یہ بات تو میرے لیے باعثِ مسرت ہوگی۔''

شاہ صاحب نے ایک نگاہِ غلط انداز ہم پر ڈالی اور ایسا تاثر دیا کہ جیسے کچھ نہ سمجھے ہوں۔ بیگم کو تحفوں کا تجسس تھا چناں چہ انھوں نے ہمارے کاندھے پر بندوق رکھ کر فائر کیا:

''بھائی صاحب، یہ آپ کے دوست ہر وقت آپ کے لائے ہوئے تحائف کے بارے میں قیاس آرائی کرتے رہتے ہیں۔ اب اس بلی کو تھیلے سے باہر نکال ہی دیجیے۔''

''ہاں..... ہاں۔'' شاہ صاحب نے بیگم سے اتفاق کیا اور سوٹ کیس میں سے دو بڑے بنڈل نکالے جنھیں نہایت نفاست سے پیک کیا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ پہلے ہم سے مخاطب ہوئے: ''تمھیں لکھنے کا شوق ہے اور تم صحافت پڑھاتے بھی رہے ہو۔'' پھر بیگم کی طرف دیکھتے ہوئے بولے، ''اور بھابی، آپ کو پڑھنے کا شوق ہے۔'' ہم دونوں نے اعتراف جرم کر لیا۔

اب انھوں نے ایک پیکٹ ہماری طرف بڑھاتے ہوئے کہا: ''اس میں لندن کے کچھ پرانے اور کچھ نئے اخبارات کے شمارے ہیں۔ ان سے تمھیں وہاں کی صحافت کے رجحانات کا اندازہ ہوگا۔'' دوسرا بنڈل انھوں نے بیگم کے آگے کیا اور فرمایا: ''بھابی، اس میں آپ کے لیے کچھ پرانی کتابیں ہیں جن سے آپ کے علم میں اضافہ ہوگا لیکن تمام کتابیں بچوں کی پہنچ سے دور رکھیں۔''

شاہ صاحب نے دلوں کی اتنی ہی جراحت پر اکتفا نہ کیا۔ نمک پاشی کی رسم ادا کرنے کے لیے اُلٹا ہم سے سوال کیا:

''کہو کیسے تحفے ہیں؟'' ہم نے زبان سے ان کا شکریہ ادا کیا اور دل میں اُستاد قمر جلالوی کا یہ شعر پڑھ لیا

آپ اک پھول بھی دیں گے تو اس احسان کے ساتھ
جیسے گلزار کا گلزار دیے دیتے ہیں ◆◆◆

انسانیت کہاں ہے؟

کسی بے بس کی مجبوریوں کا سودا کرنے والے... کیا اشرف المخلوقات کہلانے کے قابل ہیں؟

سمیہ سلطان

''سر پلیز! یہ نوکری میری مجبوری ہے۔ مجھے ایک موقع دے دیں۔'' لڑکے نے منت بھرے لہجے میں سامنے بیٹھے باس سے کہا۔

''معاف کیجیے، آپ اس عہدے کے اہل نہیں۔ صرف تعلیم اور مجبوریوں کی بناء پر اگر ہم ملازمت دینے لگیں تو ہر دوسرا شخص برسرِ روزگار ہو۔ تعلیم کے علاوہ تجربہ اور قابلیت بھی اہم ہے۔ ویسے بھی دوسرے اُمیدوار آپ سے زیادہ تجربہ کار اور قابل ہیں۔ آپ جا کر کہیں اور قسمت آزمائی کریں۔'' باس نے سخت لہجے میں جواب دیا۔

وہ لڑکا پندرہویں جگہ سے ناکام و نامراد لوٹا تھا۔ اس کے محلے کے دوست جو اسی طرح نوکریوں کی تلاش میں مارے مارے پھرنے کے بعد اب چوری، ڈکیتی اور رہزنی میں ملوث ہو چکے تھے، ایک بار پھر اُسے اُکسانے لگے:

''یار یہ حلال روزی کے چکر چھوڑ دے۔ آج کل نوکری

صرف اُونچی سفارشوں کی بنیاد پر ہی ملتی ہے۔ یہ نوکریاں غریبوں کے لیے نہیں۔ ہماری بات مان اور آ جا۔ اُستاد تجھ سے بہت خوش ہوگا۔''

لڑکے نے آخری بار تھکے اعصاب اور مایوسی کے اندھیروں میں بھٹکتے دل سے ایک بار سوچنا چاہا مگر اب کی بار اس کا ایمان نفس اور پیٹ کی بھوک سے ہار گیا۔ اس نے غربت کی آگ سے بچنے کی خاطر جہنم کی آگ میں قدم رکھ دیا اور شیطان اور نفس کے پجاری لوگ اپنی جیت کی خوشی میں نہال ہو گئے۔

☆☆☆

''باجی مجھے تھوڑے سے پیسے اُدھار دے دیں۔ اگلے مہینے میری تنخواہ میں سے کاٹ لینا۔ آپ جانتی ہیں کہ میرے بیٹے کو تھلیسیمیا تھا۔ مہینے میں دو دفعہ اُسے خون کی بوتلیں چڑھتی تھیں۔ میں نے کبھی آپ سے اُدھار نہیں مانگا لیکن آج میرا بچہ اس دنیا سے چلا گیا۔ اس کے کفن دفن کے لیے بہت پیسا چاہیے۔ میں اس کی میت گھر چھوڑ کر آئی ہوں۔ اللہ کے واسطے رحم کریں اور اس دفعہ اُدھار دے دیں۔'' ملازمہ روتے ہوئے ہاتھ جوڑ کر بیگم صاحبہ کے سامنے گڑگڑاتے ہوئے بولی تو بیگم صاحبہ نے بُری طرح دھتکارتے ہوئے کہا۔

''تمہارا بچہ مر گیا تو میں کیا کروں؟ ویسے بھی تم لوگوں کا تو یہی دھندہ ہے۔ کبھی کسی طرح پیسے بٹورتے ہو کبھی کسی طرح۔ ہمارے پاس بھی کوئی خزانے دفن نہیں جو یوں لٹاتے پھریں۔ پیسے چاہئیں تو پہلے آج کا کام ختم کرو۔ اس کے بعد پتا نہیں کتنے دن کی چھٹیاں کرو گی۔ اب آ ہی گئی ہو تو پہلے اپنے بکھرے کام مکمل کرو پھر پیسے لے لینا۔'' بیگم صاحبہ نے منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''اور سنو! اچھے طریقے سے کام کرنا۔ جلد جانے کے چکر میں آدھا ادھورا کام نہ کرنا۔ کام پورا کرو گی تب ہی کچھ پیسے ملیں گے ورنہ نہیں۔''

ملازمہ نے بے حد دکھ سے ان کی طرف دیکھا اور ڈگمگاتے قدموں سے اندر کی جانب چل پڑی۔ بیگم صاحبہ نے چند روپوں کے عوض ملازمہ کے دکھوں کا سودا کر لیا اور اس کے بیٹے کی میت کو اپنی دولت اور طاقت سے خرید لیا۔

☆☆☆

''سر! اب تو میری تنخواہ بڑھا دیں۔ تین سال ہو چکے یہاں کام کرتے۔ شروع میں یہی بات طے ہوئی تھی کہ ہر سال تنخواہ بڑھے گی اور بونس بھی ملے گا۔ اب تین سال ہونے کو آئے، عید کا بونس بھی برائے نام ملتا ہے۔ مہنگائی روز بڑھ رہی ہے مگر تنخواہ وہی ہے۔ ہم پریشان رہیں گے تو کمپنی کا کام بھی ٹھیک سے انجام نہ دے پائیں گے۔ میری گزارش ہے کہ آپ بات کریں چیئرمین صاحب سے۔'' اٹھارہ ہزار ماہوار کمانے والے مزدور نے فیکٹری کے منیجر سے لجاجت بھرے لہجے میں کہا۔

''میں پہلے ہی تمہاری سفارش کر چکا۔ تم بے فکر رہو۔ تمہاری تنخواہ میں اضافہ ہو جائے گا۔'' غریب مزدور اتنا سن کر ہی خوش ہو گیا۔ منیجر میٹھے لہجے میں بولا:

''تم بس ایسا کرو کہ آج سے ایک ہفتہ اوورٹائم لگانا شروع کر دو۔ اس سے تمہاری کارکردگی اچھی طرح سامنے آئے گی اور جلد ہی تمہاری تنخواہ میں اضافہ ہو جائے گا۔''

''سر کب تک اضافہ ہوگا؟'' مزدور کے لہجے میں بے چینی تھی۔

''بس کچھ مہینے انتظار کر لو۔ جہاں اتنا صبر کیا ہے وہاں تھوڑا اور سہی۔'' منیجر نے مصروف انداز میں جواب دیا اور مزدور اُداس چہرہ لیے چلا گیا۔

''اپنی اوقات دیکھتے نہیں اور آ جاتے ہیں تنخواہ بڑھوانے۔'' منیجر بڑبڑایا۔ قریب بیٹھے اس کے ایک خوشامدی چمچے نے پوچھا: ''سر آپ نے اسے جھوٹی تسلی کیوں دی؟ صاف منع کیوں نہ کر دیا؟''

منیجر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا: ''انسان کو اپنا الو سیدھا کرنا آنا چاہیے۔ جس عہدے پر یہ کام کرتا ہے، وہیں دو اور بندے بھی ہیں۔ اس کی تنخواہ بڑھانے کا مطلب کہ سب کی

بڑھانی پڑے گی اور یوں کمپنی کو نقصان ہو گا۔ ایسے تنخواہیں بڑھتی رہیں تو مالک خود کیا کھائے گا؟"

"لیکن سر! آپ مزدوروں کی تعداد کم بھی تو کر سکتے ہیں۔" خوشامدی نے چسکے لیتے ہوئے مزید کریدا۔

"ارے یار! بندے زیادہ ہونے سے کام بھی تو زیادہ ہو رہا ہے۔ ہمیں کام نکلوانے سے مطلب ہے۔ ان کی تنخواہ بڑھے یا نہیں ہمیں اس سے کیا؟ ہم نے سب کا ٹھیکا تو نہیں لے رکھا۔ زیادہ اصرار کریں گے تو ان کو نکال کر نئے ملازم رکھ لوں گا جو کم از کم دو سال خاموش تو رہیں گے۔ ان کی تنخواہیں بڑھوانے کا خرچہ مالک کو سنا دیا تو اپنی ترقی کی بات کیسے کروں گا؟" مینجر لاپروائی سے شانے اُچکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔

☆☆☆

"انکل یہ غبارہ خرید لو۔ صرف پچیس روپے کا ہے۔ اللہ آپ کو اور دے گا۔ یہ غبارہ لے لو۔" بچے نے پارکنگ میں کھڑی گاڑی کے شیشے پر تین چار بار دستک دیتے ہوئے کہا۔

شیشہ نیچے کر کے ایک کرخت چہرے والے نے اسے دس کا نوٹ دیتے ہوئے جانے کا اشارہ کیا۔ بچہ معصومیت سے بولا: "انکل میں بھیک نہیں مانگ رہا۔ محنت کر کے کما رہا ہوں۔ بس ایک غبارہ لے لو، میرا بھی بھلا ہو جائے گا۔"

گاڑی میں بیٹھے آدمی نے گھور کر بچے کا جائزہ لیا اور اسے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا۔ بچہ سہم کر دور ہٹا مگر اتنی ہی دیر میں اس نے اپنے بندوں کو اشارہ کر دیا تھا۔ دو لمبے تڑنگے غنڈوں نے مل کر بچے کو زبردستی گاڑی میں دھکیلا۔ بچے نے جیسے ہی ڈر کر شور مچانا شروع کیا تو اس کے بازو میں ایک سوئی پیوست کر دی گئی۔ چند لمحوں میں ہی وہ بچہ ہوش و خرد سے بیگانہ سیٹ پر ڈھے گیا۔

یہ منظر وہاں کھڑے کئی لوگوں نے دیکھا بھی اور سنا بھی مگر اس شخص کی گاڑی اور طاقت کی وجہ سے سب خاموش رہے۔ ایک جرأت مند شخص نے تھانے میں رپورٹ کروانے کی کوشش کی مگر مردہ ضمیر معاشرے میں انصاف کی توقع یوں ہے جیسے صحرا میں گلاب کھلنے کا انتظار۔

بچے کی جب آنکھ کھلی تو اس نے خود کو ایک بڑے سے بند کمرے میں پایا جس میں اس جیسے کئی بچے موجود تھے۔ کچھ اپنے حواسوں میں نہیں تھے اور کچھ اس ماحول سے فرار کی خاطر حواس سے بیگانہ ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ جو ہوش میں تھے، انھوں نے تمسخر اور طنز کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ اُسی وقت دروازہ کھول کر ایک آدمی اندر داخل ہوا اور اس بچے سے مخاطب ہوا: "آج سے یہی تمھاری زندگی ہے۔ تمھیں تمھارا علاقہ جلد بتا دیا جائے گا اور تمھارا حلیہ بھی۔ ایک گھنٹے میں تیار ہو جاؤ پھر گاڑی تم سب کو تمھارے علاقوں میں اُتار دے گی۔ کسی نے بھاگنے کی کوشش کی تو اس کے ہاتھ پاؤں توڑ دیے جائیں گے۔ ہمارے آدمی ہر جگہ تم پر نظر رکھے ہوں گے۔" آدمی نے سخت آواز میں کہا۔

"میں نہیں جاؤں گا۔ چھوڑ دو مجھے۔" بچے نے چیختے ہوئے کہا۔ اسی لمحے آدمی کا بھاری تھپڑ اس کے جبڑے پر پڑا۔ "آئندہ اگر میں نے یہ بکواس سنی تو تجھے بھی اس نشے کی لت لگا دوں گا۔ تُو کام کا بچہ لگتا ہے اس لیے رعایت کر رہا ہوں۔ کرنا تو تجھے یہی ہے، چاہے خوشی سے کر یا ان کی طرح نشے کا عادی بن کر۔" اس آدمی نے بچے کو بالوں سے پکڑ کر جھٹکا دیتے ہوئے کہا۔

اس طرح ایک اور بے بس، معصوم فرشتہ سفاک درندوں کے چنگل میں پھنس گیا۔ اس کے چہرے اور آنکھوں میں رقم درد اور بے بسی کو اس ظالم نے بہت حقارت سے دیکھا اور مڑ کر فرش پر پڑے بچوں کو ٹھوکر مارتے ہوئے باہر نکل گیا۔ ان انسان نما سفاک جانوروں نے انسانیت کے قتل سے، ایک اور گناہ سے اپنے ہاتھ رنگ لیے تھے لیکن بے حس درندوں کو اپنے گناہوں کا ادراک شاید قبر میں ہی جا کر ہوتا ہے۔

☆☆☆

"رشیدہ! ارے کہاں رہ گئی؟ منا اتنی دیر سے رو رہا ہے۔ دیکھ تو سہی شاید اُسے بھوک لگی ہے۔" بڑی بی اپنی لاٹھی ٹیکتے ہوئے لاؤنج کی طرف بڑھیں جہاں رشیدہ ڈرامے میں مگن تھی۔ بڑی بی کو آتے دیکھ کر منے کا پنگھوڑا زور زور سے ہلانے لگی۔

"اماں دیکھ تو رہی ہوں منے کو۔ اسے تو ہر وقت بھوک لگتی رہتی ہے۔" رشیدہ نے بچے کو غصے سے گھورتے ہوئے بیزاری سے جواب دیا۔

"اللہ کا خوف کرو بی بی۔ یہ معصوم تو اپنی ضرورت کے وقت ہی روتا ہے۔ بن ماں کا بچہ ہے۔ تمھیں رحم نہیں آتا اس پر؟ تم کیسی عورت ہو؟ ہر وقت ڈرامے دیکھنے، کھانے پینے اور سونے سے ہی فرصت نہیں ملتی تمھیں۔ ارے پیار نہیں کر سکتیں تو شفقت کا ہی برتاؤ کر لیا کرو اس مسکین کے ساتھ۔ یا کم از کم اپنی روزی ہی حلال کر لو۔" بڑی بی نے جلال میں آتے ہوئے رشیدہ کو جھاڑا۔

"ہونہہ! اس کی ماں خود تو مر گئی اور دوسروں کے لیے مصیبت چھوڑ گئی۔" رشیدہ نے کلستے ہوئے سوچا۔ پھر رونی آواز بنا کر بڑی بی سے بولی: "میں غریب ہوں نا، اسی لیے آپ ایسا سلوک کرتی ہیں میرے ساتھ۔ غریب کی عزت تو لوگ پیسوں کے عوض خرید لیتے ہیں۔ اس کا کتنا بھی خیال رکھ لوں، آپ کو شکایت ہی رہتی ہے مجھ سے۔" رشیدہ نے پلو میں چھپائے بچے کے دودھ کے ڈبے کو اچھی طرح ڈھکا۔ یہ ڈبا وہ دکان پر آدھی قیمت میں فروخت کیا کرتی تھی۔ اس لیے بچے کو دودھ بہت کنجوسی سے دیا کرتی تا کہ زیادہ سے زیادہ دودھ بچا کر لے جا سکے۔

"بس میرے سامنے زیادہ ڈراما کرنے کی ضرورت نہیں۔ تم جانتی ہو میں نے تمھیں کبھی آیا نہیں سمجھا۔ کبھی بے عزتی نہیں کی۔ تم پر اعتبار کر کے ہی تمھیں ایک مسکین کی ذمہ داری سونپی تھی۔ تم اپنا رزق حلال نہیں کرو گی اور کام ایمانداری سے نہیں کرو گی تو مجھے ٹوکنا ہی پڑے گا۔" بڑی بی نے ناصحانہ انداز میں رشیدہ کو سمجھایا جو بُرے بُرے منہ بنا کر ان کی باتیں سن رہی تھی۔ بڑی بی اسے دیکھ کر تاسف سے سر ہلاتی واپس مڑ گئیں۔ ان کی مجبوری تھی، اس عمر میں بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہ تھا کہ یتیم مسکین چھوٹے سے پوتے کو سنبھال سکیں۔ رشیدہ بے حسی سے دوبارہ ٹی وی دیکھنے میں مگن ہو چکی تھی۔ بڑی بی دکھ سے سوچ رہی تھیں: "بے وقوف رشیدہ اتنا بھی نہیں جانتی کہ جس کا جو نصیب ہو، وہی اسے ملتا ہے۔ انسان دوسرے کے نصیب کا رزق چھین نہیں سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے اسے ایک نیک کام کے لیے چنا تھا۔ بے شک وہ اس کام کی تنخواہ لیتی تھی مگر ہر کسی کے نصیب میں دنیا کے ساتھ آخرت کی کمائی نہیں ہوتی۔ وہ چاہتی تو دنیاوی کمائی کے ساتھ آخرت کے لیے بھی نیکیوں کا خزانہ جمع کر سکتی تھی مگر یہ لالچ......"

رشیدہ جیسی بہت سی گھریلو ملازمائیں اور بیشتر خواتین بھی اپنے نصیب سے شاکی رہتی ہیں۔ احساس محرومی میں مبتلا ہو کر خود بھی حسد کی آگ میں جلتیں اور دوسروں کی زندگیوں کو بدتر کرنے اور انھیں بھی احساسِ محرومی میں مبتلا کرنے کی تگ و دو میں لگی رہتی ہیں۔

☆☆☆

"کیا میں اندر آ سکتی ہوں سر؟" افشین نے باس کے دروازے پر دستک دے کر پوچھا۔

"آیئے مس افشین!" بڑی سی میز کے پیچھے بیٹھے آدمی نے بڑے پُرتپاک لہجے میں اندر آنے کی اجازت دی۔

"سر! یہ رپورٹ تیار ہو گئی ہے۔ اس فائل میں تمام چیزیں موجود ہیں۔ آپ ایک نظر دیکھ لیں۔" افشین نے اپنے کام کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"ہم ایک کیا...... پوری کی پوری نظرِ کرم کر دیں گے۔ بس آپ کی رضامندی چاہیے۔" باس نے انتہائی بازاری انداز میں کہا۔ یہ سن کر افشین کی تیوری پر بل پڑ گئے اور وہ جلدی سے فائل رکھ کر باہر جانے کے لیے مڑی۔ "سر میں چلتی ہوں۔ آپ فارغ ہو کر اسے دیکھ لیجیے گا۔"

"آپ اتنی غیر ذمہ دار ہیں کہ بغیر کسی ڈسکشن کے فائل یونہی چھوڑ کر جا رہی ہیں۔ آپ پہلے مجھے تو تفصیلات دے دیں۔" سر نے بے باک نظریں اس کے سراپے پر جماتے ہوئے کہا۔

ناچار افشین رک گئی اور انھیں بریفنگ دینے کے لیے فائل کھولی۔ جیسے ہی افشین نے اپنی بات شروع کی تو باس اپنی کرسی سے اُٹھ کر افشین کے برابر آ کھڑے ہوئے۔ کبھی غلطی سے شانہ ٹکرانے لگا تو کبھی غلطی سے انگلیاں مس ہونے لگیں۔

"سر! مجھے یہ سب حرکتیں پسند نہیں۔" افشین نے ناگواری سے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا تو باس نے یک دم شرافت کا لبجہ چھوڑ اور دھمکاتے ہوئے بولا:

"تم خود کو سمجھتی کیا ہو؟ میں اگر اپنی اصلیت پر آ گیا تو تم یہاں ملازمت کرنے کے قابل نہیں رہو گی۔ بہتر یہی ہے کہ میری مرضی کے مطابق چلو۔"

"سر! آپ اس سے زیادہ بھی گر سکتے ہیں، مجھے اندازہ ہے مگر یہ حالات مجھے یہاں سے ملازمت چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتے۔ خدارا مجھ پر رحم کریں۔ آپ نے میری ترقی بھی روک دی کیونکہ میں نے آپ سے کوئی بھی ذاتی تعلق رکھنے سے منع کر دیا۔ کیا ترقی کا معیار صرف اور صرف بے حیائی ہے؟ میں اگر کسی مجبوری کے تحت آپ کے پاس نوکری کرتی ہوں تو کیا آپ اس بات کا فائدہ اُٹھائیں گے؟ مرد یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر آپ کی بیٹی کسی دفتر میں ملازمت کرتی ہو اور اس کے ساتھ ایسا سلوک ہو تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی؟" افشین نے سسکتے ہوئے کہا اور باس کے کمرے سے سر جھکائے نکل گئی۔

آخر کب تک لڑکی نیک پروین بننے کا ڈراما کرے گی۔ میں بھی دیکھتا ہوں آخر کب تک یہ میرے اشاروں پر نہیں ناچتی۔" باس نے فرعونیت سے سوچا اور سر جھٹک کر فائل دیکھنے لگا۔

متوسط طبقے کی نمائندہ افشین اپنی پیار ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کا واحد سہارا تھی۔ آخر کب تک ان بھیڑیے نما انسانوں سے اپنی عصمت کی حفاظت کر پاتی۔ مفلسی اور مجبوری کے ہاتھوں مجبور ہو کر اس نے ملازمت اختیار کی تھی۔ وہ صرف اپنی ماں کی دعاؤں کے حصار میں ہونے وجہ سے اب تک شاید محفوظ تھی۔ اللہ ایک ماں کی دعاؤں کا نگہبان تھا۔

☆☆☆

یہ چھوٹی چھوٹی کہانیاں، چھوٹے چھوٹے مناظر روزانہ ہی کہیں نہ کہیں کسی گلی، گھر یا دفتر میں رُونما ہوتے ہیں مگر کہیں معاشی، کہیں جسمانی اور کہیں منفی سوچ کے لحاظ سے ہم "بے بس اور مجبور ہیں۔" حقیقت یہ ہے کہ بے بس ہیں نہ ہی مجبور، ہم بے حس ہیں۔ ظلم دیکھتے بھی ہیں مظلوم کو اور ظالم کو بھی دیکھتے ہیں۔ کبھی ہم خود بھی اس ظلم کا کسی نہ کسی شکل میں حصہ ہوتے ہیں مگر افسوس کہ یہ سب دیکھ کر بھی ضمیر جاگتا ہے نہ دل کانپتا ہے۔

ہوس کے پجاری ضروری نہیں صرف مرد ہی ہوں۔ بہت سارے معاملات میں جہاں مرد اور عورت کی تخصیص ختم ہوتی جا رہی ہے، بالکل اسی طرح ہوس، دولت و لالچ کی ماری عورتیں بھی بعض اوقات نیک مردوں کو مجبور کر دیتی ہیں۔ نفسانی خواہشات کا منہ زور یا صرف مرد کو نہیں عورت کو بھی پاتال میں لے جا پھینکتا ہے۔

ظلم کے یہی چند ایک مناظر نہیں۔ ہر دفعہ ضروری نہیں کہ ہم بالواسطہ طور پر یہ ظلم کر رہے ہوں، اکثر بلاواسطہ بھی کرتے ہیں۔ زکوٰۃ نہ دے، حقدار کو اس کا حق نہ دے کر، مزدور کو اس کی مزدوری صحیح وقت پر ادا نہ کر کے، سفید پوش لوگوں کی در پردہ مدد نہ کر کے، صدقات نہ دے کر اور کبھی جسمانی لحاظ سے کسی کی مدد نہ کر کے۔

مسلمان تو وہ ہے کہ جس کے لیے کسی کو مسکرا کر دیکھنا بھی صدقہ اور راستے کا کنکر یا پتھر ہٹا دینا بھی نیکی ہے مگر پتہ نہیں ہم کس ڈگر پر جا رہے ہیں۔ مجبوری مجبوری، بے کسوں کی بے کسی کا فائدہ اُٹھا کر اپنی جھوٹی انا کی تسکین کرتے ہیں۔ اپنے وحشیانہ سلوک سے اندر کے شیطان کو خوش کر دیتے ہیں۔ دعا ہے کہ ہمیں قبر کے اندھیروں سے پہلے اپنے اندر کے اندھیروں، اپنے اندر کی دہشتوں کو ختم کرنا نصیب ہو جائے۔ ورنہ یہ زندگی کی وحشتیں، ظلم و ستم کی ہولناکیاں آخری سفر کے اڑدھے بن جائیں گے۔ یہ سفاکیت معاشرے کی بربادی کے ساتھ آخری آرام گاہ کی تباہی کا بھی سبب بن جائے گی۔ ●●●

شاہزادہ

سمیہ شاہد

چھوٹا قد، بھرا بھرا جسم، پرکار سے بنایا گیا گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی آنکھیں، مسکراتے لب اور درمیان سے مانگ نکالے بال، چھوٹے چھوٹے ہاتھ، ناخن بھی درمیانے مگر کالے اور تیز، ناک کے نتھنے پھولے اور پھیلے سے گلے میں پٹہ ڈالے جو بھی شاہزادے کو پہلی بار دیکھتا، اُسے ایک مرتبہ فلم "ٹارزن" ضرور یاد آتی۔

شاہزادے کا بچپن نہ جانے کیسے گزرا؟ چھوٹی عمر میں ہی لکڑ ہاروں کے ہاتھ لگ جانے کے باعث وہ دو تین ماہ میں بکتے بکتے بالآخر بڑے شہر میں ایک خانہ بدوش تک پہنچ گیا۔ جس کے بعد اس کی زندگی کا ایک اذیت ناک دور شروع ہو گیا۔ صبح سویرے اسے گلے میں رسی ڈال کر کام پر لے جانے کی تیاری شروع کر دی جاتی۔ کھانے کے نام پر روکھی

کون کہتا ہے کہ احساس صرف اشرف المخلوقات کی ملکیت ہوتے ہیں... وہ انسانوں کو جذبات سے عاری سمجھتا تھا

سوکھی اور اکثر و بیشتر صرف سوکھی پر ہی گزارا کرنا پڑتا۔

بعض اوقات کبھی کہیں سے خیرات مل جاتی تو وارے نیارے بھی ہو جاتے۔ کبھی کبھی جبلّت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کیڑے مکوڑے بھی کھا لیتا۔ رہنے کے لیے ایک چھوٹا سا کونا میسر تھا، اس پر رسّی کا عذاب الگ۔ رات گئے مالک کے ساتھ اِدھر سے اُدھر پھرنے کے باعث ٹھیک سے سو بھی نہ پاتا۔ شاہزادے کو اپنے مالک کے ڈنڈے سے بہت ڈر لگتا تھا۔ وہ صرف ڈنڈا ہی نہ تھا۔ اس پر لگی نوکدار چیز جب اس کے بدن میں گھستی تو اسے اپنا بدن ڈولتا اور روح ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتی۔ وہ مالک کی ڈانٹ، تھپڑ، لاتیں، گھونسے، رسی، سخت پٹہ، لوہے کا پنجرہ، سب برداشت کر سکتا تھا مگر اس چھڑی کو دیکھ کر اس کی روح کانپ جایا کرتی۔

اس چھڑی سے پہلا سابقہ اسے ایک پارک کے سامنے پیش آیا جب بھوک کے ہاتھوں نڈھال ہو کر اس نے ناچنے سے انکار کر دیا۔ مالک نے پہلے تو پیار سے، پھر ذرا خفگی سے اور اس کے بعد ڈانٹ کر ناچنے کو کہا مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ اس پر مالک نے چھڑی اُٹھائی اور پہلی ضرب پر ہی شاہزادہ بلبلا اُٹھا اور آناً فاناً ناچنا شروع کر دیا۔ اس کے بعد شاہزادے نے چھڑی اُٹھنے کا موقع نہ دیا۔

مالک جیسا بھی تھا اتنا نرم دل ضرور تھا کہ ایک دم چھڑی نہ مارتا۔ سب سے پہلے لات مارنے سے شروع ہوتا پھر رفتہ رفتہ گھونسے، تھپڑ اور آخر میں چھڑی اُٹھاتا جسے دیکھ کر ہی شاہزادہ تیر کی طرح سیدھا ہو جاتا۔ جب بھی ایسا موقع آتا، وہ سوچتا کہ انسان کس قدر کریہہ اور نفرت خیز ہے۔ ظالم، جابر، کرخت اور بے حس۔ اسے رفتہ رفتہ انسانوں سے نفرت ہونے لگی۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا، اس کی یہ نفرت شدید سے شدید تر ہوتی گئی۔ وہ سوچتا کہ یہ کیسی مخلوق ہے جو اپنی تفریح کی خاطر ہمیں اذیت زدہ زندگی گزارنے پر مجبور کر دیتی ہے؟ اس کے نزدیک تمام انسان تشدد، اذیت اور بے حسی کا مجموعہ بن چکے تھے۔ اس کا پالا جس قسم کے انسانوں سے پڑا، ان سب کے لیے یہ تمام القابات ہی موزوں تھے۔

سب سے پہلے تو وہ لکڑ ہارے جنہوں نے اسے اپنی ماں، اپنے پیارے خاندان سے جدا کیا اور زور زبردستی کرتے اپنے ہمراہ لے گئے۔ پھر پہلا مالک جو اسے روز بازار میں بیچنے کی غرض سے لا کھڑا کرتا۔ اب یہ موجودہ مالک جو نہ صرف اسے بلکہ اپنے گھر والوں کو بھی مار پیٹ کا نشانہ بناتا۔ اکثر اس کے دل میں بھاگنے کی خواہش پیدا ہوتی جسے وہ دبا دیا کرتا۔

شاہزادے کی زندگی میں نیا موڑ تب آیا جب اس نے اپنے پڑوس میں ایک بلی کو اپنے ۶ بچوں کے ہمراہ دیکھا۔ اس کو اپنی ماں یاد آئی۔ اس نے سوچا جانے میری ماں زندہ بھی ہو گی؟ اگر ہوئی بھی تو جانے کہاں ہو گی؟ ایسے ہی سوچتے سوچتے اس کے دل میں وہاں سے بھاگنے اور اپنا گھر تلاش کرنے کی خواہش نے اس شدت سے سر اُٹھایا کہ اب کی بار وہ اسے دبانے میں ناکام رہا۔

☆☆☆

اس نے اپنی غیر فطری زندگی کو خیر باد کہنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے سوچا کہ سب سے پہلے میں اس شہر سے فرار ہو جاؤں۔ وہ اس شہر کی حدود سے کوسوں دُور جانا چاہتا تھا۔ وہ جنگلی تھا اور واپس جنگل میں جانا چاہتا تھا۔ وہ جنگلی حیات کے ساتھ جینا چاہتا تھا۔ اس نے سوچا کہ یہ نام نہاد مہذب دنیا جس میں قتل و غارت، خون آشامی، بے حسی اور خود غرضی کی آمیزش ہے، چھوڑ کر جنگل کی پُرسکون فضا میں واپس جا کر اپنے قبیلے کو تلاش کرنا چاہیے اور اپنی فطرت کے مطابق رہنا چاہیے۔ اس نے رفتہ رفتہ فرار کے منصوبے کو پختہ کر لیا۔

ایک دن جب مالک رسّی کھول کر اُسے لوہے کے پنجرے میں واپس بھیج رہا تھا...... وہ موقع پا کر بھاگ نکلا۔ گھروں کی چھتیں پھلانگتے اپنی دانست میں مالک کی پہنچ سے دُور نکل گیا لیکن شومئی قسمت ایک راہگیر نے اسے پکڑ لیا اور نعمت غیر مترقبہ سمجھتے ہوئے اپنے ہمراہ لے گیا۔ یہاں سے اُس کی زندگی نے ایک الگ موڑ لے لیا۔

وہ راہگیر اسے جانوروں کے بازار لے گیا اور ایک دکان میں بیچ دیا۔ اگلے دن وہاں کچھ گاہک آئے جن میں ایک چڑیا گھر کا افسر بھی تھا۔ اُس نے شاہزادے کو دیکھتے ہی اُس کی اچھی نسل پہچان لی اور فوراً اس کا سودا کر اسے اپنے ہمراہ چڑیا گھر لے آیا۔

چڑیا گھر داخل ہوتے ہی اسے خوشگوار حیرت کا سامنا ہوا۔ آغاز ہی میں اسے بڑے اور کشادہ بندروں کے پنجرے نظر آئے۔ اس آدمی نے ایک ادھیڑ عمر شخص سے شاہزادے کا تعارف کرایا تو وہ مسکراتے ہوئے اس کی پیٹھ سہلانے لگا۔ اتنے عرصے میں یہ پہلا مہربان لمس تھا جو شاہزادے نے محسوس کیا۔ اس آدمی نے پھر شاہزادے کو کچھ کیلے اور امرود دیے ساتھ ہی پانی بھی پلایا۔ جب شاہزادے نے کھا پی کر آسمان کی جانب نگاہ کی تو بے اختیار اس کی آنکھیں بہنے لگیں۔

وہ آدمی اسے لے کر ایک نسبتاً زیادہ کشادہ پنجرے کی جانب آیا جہاں اسی کی نسل کے چند بندر موجود تھے۔ ان میں سے ایک بندریا کافی اُداس بیٹھی تھی جس نے چند روز قبل اپنا بچہ کھویا تھا۔ شاہزادے کو دیکھتے ہی وہ لپک کر اس کے پاس آئی۔ شاہزادہ بھی اس پیار کے لیے ترسا ہوا تھا۔ کچھ ہی دیر میں وہ باقی بندروں سے بھی مانوس ہو گیا اور خوشی سے خوخیانے لگا۔ جنگل جیسا ماحول، سونے جاگنے کی آزادی، اچھی خوراک اور سب سے بڑی خوشی کہ رسّی سے چھٹکارا۔ چند ہی دنوں میں وہ واقعی شاہزادہ لگنے لگا۔

ہفتے دو ہفتے تو اسی کھانے پینے اور کھیلنے کودنے کی خوشی میں گزر گئے۔ زندگی معمول پر آتی گئی۔ بے شک اب وہ ''تکلیف'' میں نہیں تھا لیکن اپنی سوچ میں منفرد تھا۔ اب وہ اکثر دن کے اوقات میں پنجرے کی سلاخیں تھامے حسرت بھری نظروں سے لوگوں کو دیکھ کر سوچا کرتا...... کیا میں ہمیشہ یونہی سلاخوں کے اندر بند رہوں گا؟ ہاں!! مجھے کھانے پینے کی کوئی تنگی نہیں لیکن کیا کبھی وہ وقت بھی آئے گا کہ میں اپنی مرضی اور خوشی سے آزاد گھوموں پھروں؟ اس لمحے وہ بچپن کی پرچھائیوں میں کھو جاتا...... بلند و بالا درختوں سے بھرا جنگل اور آزادی......

اُس وقت اگر کوئی اس کی آنکھوں میں جھانکتا تو درد کی لہریں صاف محسوس کر سکتا۔

◆◆◆

ذہین ہونے کی انوکھی نشانیاں

ذہین افراد کی فطرت و عادات میں کچھ مخصوص نشانیاں پائی جاتی ہیں جو ان کی ذہانت کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ کچھ افراد ایسے بھی ہوتے ہیں جو اپنی ذہانت سے بے خبر ہوتے ہیں اور خود کو درخوا عتنا نہیں سمجھتے۔

☆ ماہرین کا کہنا ہے کہ موسیقی سیکھنا یا کوئی آلہ موسیقی بجانا دماغ کے خلیات کو فعال کرتا ہے۔ ان کے مطابق صرف ایک مہینے تک موسیقی کی کلاس لینا 4 سے 6 سال کے بچوں کی ذہنی نشوونما میں اضافہ کرتی ہے۔ کیا آپ نے کبھی بچپن یا اوائل نوجوانی میں موسیقی کی کلاس لی ہے؟ تو پھر جان جائیں کہ آپ اپنے اردگرد موجود افراد سے زیادہ ذہین ہیں۔

☆ کیا آپ پریشان کن صورتحال کو چٹکیوں میں اڑا دیتے ہیں اور فطرتاً لاپروا ہیں؟ ماہرین اس بات پر متفق ہیں کہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر پریشان ہو جانا بظاہر تو مضر عادت لگتی ہے، تاہم یہ نہ صرف ذہانت کی نشانی بلکہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے کہ آپ ہر قسم کے مسائل کو دور اندیشی سے حل کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

بلی کا انتقام

مامتا کا جذبہ صرف انسانوں نہیں جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے

ایک ایسی دلخراش کہانی جو آپ کے رونگٹے کھڑے کر دے گی

مقبول جہانگیر

یہ ناقابل فراموش اور عبرت ناک حادثہ نورمبرگ کے پرانے قلعے میں پیش آیا تھا۔ میں جس زمانے کا ذکر کرتا ہوں، اس زمانے میں نورمبرگ کا یہ پرانا قلعہ سیاحوں کے لیے کچھ زیادہ کشش نہ رکھتا تھا۔ اس کی بڑی وجہ یہ بھی کہ جرمنی کے اس دور افتادہ اور بہت پرانے شہر تک پہنچنے کی سہولتیں کچھ زیادہ نہ تھیں اور بہت کم لوگ ایسے تھے جو دور دراز کا سفر طے کر کے اور سینکڑوں مصیبتیں برداشت کرنے کے بعد نورمبرگ پہنچتے تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے دوران نازیوں نے نورمبرگ کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا۔ اس لیے اس کی شہرت دُور دُور تک پھیل گئی اور جب سیر و سیاحت سے دلچسپی رکھنے والوں کو پتا چلا کہ نورمبرگ میں بارھویں صدی عیسوی کی عمارتوں کے آثار موجود ہیں، تو وہ اسے دیکھنے کے لیے جوق در جوق آنے لگے۔

ان دنوں میری شادی ہوئے دو ہی ہفتے گزرے تھے اور ہم میاں بیوی یورپ کے کئی ملکوں کی سیر کرتے ہوئے ایک روز فرینکفرٹ کے ریلوے اسٹیشن پر اُترے تو ہماری ملاقات ہوچیسن سے ہوئی۔ وہ خوبصورت نوجوان نہایت باتونی اور مسخرے پن کی حد تک ہنس مکھ امریکی سیاح تھا جس نے جلد ہی ہم سے گہری دوستی کر لی۔ وہ منہ ٹیڑھا کر کے جب تیزی سے انگریزی بولتا تو میری بیوی کے لیے اپنی ہنسی ضبط کرنا مشکل ہو جاتا۔ ہوچیسن کی باتیں بڑی دلچسپ ہوتیں۔ وہ اپنی بہادری اور سیاحت کے ایسے ایسے عجیب قصے بیان کرتا کہ حیرت ہوتی تھی۔ اگرچہ مجھے بعد میں احساس ہوگیا کہ وہ جھوٹ بولنے کے فن میں اپنا ثانی نہیں رکھتا، تاہم ایسے ساتھی کی موجودگی ہمارے لیے بہت اچھی ثابت ہوئی اور وہ تفریح کا بہت عمدہ ذریعہ بن گیا۔

نورمبرگ کا قلعہ دیکھنے کی تجویز بھی اسی نے پیش کی تھی اور میری بیوی امیلیا جسے ایسی عمارتیں دیکھنے کا ازحد شوق تھا فوراً آمادہ ہوگئی۔ نورمبرگ دریائے پیگنیز کے دونوں کناروں پر آباد ہے۔ ایک حصہ پرانا شہر کہلاتا ہے اور دوسرا حصہ نیا شہر۔ پرانا شہر تمام تر قرونِ وسطیٰ کے رومن فنِ تعمیر کا بہت اچھا نمونہ ہے۔ یہاں شہر کے چاروں طرف اونچی فصیل ہے جس میں چار بڑے بڑے دروازے اور ۱۲۸ سیڑھیاں ہیں۔ شہر کا یہ حصہ زیادہ تر پہاڑیوں کے اُوپر آباد ہے جو شمال سے مغرب کی جانب پھیلتی چلی گئی ہیں اور اسی مقام پر سرخ پتھروں کا بنا ہوا وہ عظیم الشان قلعہ واقع ہے جس کے ایک کمرے میں یہ عبرت ناک حادثہ پیش آیا تھا جو میں آگے چل کر بیان کرنے والا ہوں۔

نورمبرگ کا قدیم قصبہ اس قلعے سے نیچے آباد ہے۔ چونکہ یہ قلعہ سب سے اونچی چٹان پر تعمیر کیا گیا ہے، اس لیے اس کی فصیل سے شہر کا نظارہ بڑی آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔ قلعے کی شمالی فصیل کے ساتھ ساتھ ایک بہت گہری کھائی ہے جو صدیوں سے پانی نہ ملنے کی وجہ سے پیاسی ہے۔ رومن بادشاہوں کے عہدِ حکومت میں یہ کھائی جسے دیکھ کر خوف پیدا ہوتا ہے، یقیناً پانی سے بھری رہتی ہوگی اور خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس میں کتنے آدمی گر کر ہلاک ہوئے ہوں گے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اکثر مجرموں کو جب اذیتیں دے کر ہلاک کیا جاتا، تو اس کے بعد لاشوں کو کھائی میں پھینک دیا جاتا تھا۔ ان دنوں اس کی گہرائیوں میں گوشت خور مچھلیاں بھی بڑی تعداد میں پرورش کی گئی تھیں۔ یہ لاشیں ان مچھلیوں کا من بھاتا کھاجا تھیں۔

اس خشک کھائی نے زمین کا بہت سا حصہ گھیر رکھا تھا، اس لیے نورمبرگ کے گورنر نے اسے استعمال کرنے کا عجیب

طریقہ اختیار کیا۔ اس نے یہاں درختوں اور پودوں کی بہت سی قسمیں لگوادی تھیں اور کہیں کہیں پھولوں کے تختے بہار دکھا رہے تھے۔ قلعے کی فصیل کے ساتھ ان کا نظارہ بہت ہی بھلا معلوم ہوتا ہے۔ فصیل سے اس کی گہرائی اندازاً پچاس ساٹھ فٹ ہوگی۔ اس سے پرے شہر کے مکانات دکھائی دیتے ہیں جن کی سرخ سرخ ڈھلوان چھتیں تیز دھوپ میں خوب چمکتی ہیں۔ دائیں جانب قلعے کی فصیل کے ساتھ ہی وہ چھوٹی بڑی برجیاں اور گنبد دور تک پھیلے ہوئے تھے جن میں پہرے دار رہا کرتے تھے اور انھی کے درمیان ایک بڑے سے گنبد کے نیچے قلعے کا سب سے اہم کمرا بنا ہوا تھا جسے خاص طور پر دیکھنے کے لیے ہم یہاں آئے تھے۔

یہ وہ کمرا تھا جو سینکڑوں آدمیوں کی جانیں لے چکا تھا۔ اسی کمرے میں وہ عجیب و غریب مشینیں رکھی ہوئی تھیں جن کی مدد سے انسان صدیوں سے اپنے ہی جیسے انسانوں پر ظلم، اذیت اور عذاب کے طریقے آزماتا چلا آیا ہے۔ یہاں بادشاہ مجرموں کو ایسی ہولناک سزائیں دیتے تھے کہ آج بھی انھیں سن کر رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ پہلے پورے قلعے کی سیر کرلیں اور پھر اس ہیبت ناک کمرے کو سب سے آخر میں دیکھیں تاکہ ہماری طبیعتیں یہ ناخوش گوار اثر کم سے کم قبول کریں۔ اسی دوران ہم تینوں ذرا دم لینے کے لیے فصیل کے قریب جا کھڑے ہوئے اور جھک کر کھائی میں لگے ہوئے پھولوں کے تختوں اور درختوں کو دیکھنے لگے۔ جولائی کی تیز اور روشن دھوپ میں یہ نظارہ آنکھوں کے لیے بڑا فرحت انگیز اور خوش گوار تھا۔ رنگ برنگ پھولوں کے تختے بڑے بڑے خوشنما قالینوں کی صورت ہمارے سامنے بچھے ہوئے تھے اور جب تیز ہوا چلتی تو یہ پھول جھومنے لگتے اور ہمیں یوں محسوس ہوتا جیسے قدرت کے بنائے ہوئے ان حسین قالینوں میں حرکت پیدا ہوگئی ہے۔ قلعے کی سیر کرتے ہوئے ہم واقعی تھک گئے تھے اور اب کچھ دیر آرام کرنا چاہتے تھے مگر وہاں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔ ہوتی بھی تو اس کھلے آسمان تلے دھوپ میں بیٹھتے کہاں؟ دفعتاً میری بیوی نے انگلی سے ایک جانب اشارہ کیا اور ہم نے جھک کر ادھر دیکھا تو ایک دلچسپ تماشا نظر آیا۔

سیاہ رنگ کی ایک بڑی بلی جس کی کھال دھوپ میں خوب چمک رہی تھی، فصیل کے عین نیچے دھوپ میں آرام سے لیٹی تھی اور اس کا بچہ جس کا رنگ بھی سیاہ تھا، قریب ہی کھیل رہا تھا۔ بلی اپنی لمبی دم ہلاتی اور بچہ اس کی طرف جھپٹتا، کبھی وہ دم پر پنجہ مارتا اور کبھی اسے اپنے منہ میں دبا لیتا اور پھر زور لگا کر اپنی ماں کو گھسیٹنا چاہتا۔ بلی اپنے پاؤں کو جنبش دے کر بچے کو آہستہ سے پرے دھکیل دیتی اور دم زور زور سے ہلانے لگتی۔ اس پر بچہ اور جوش میں آکر اچھلنے کودنے لگتا۔ غالباً اسے اس کھیل میں بڑا مزا آرہا تھا۔

چند منٹ تک ہم تینوں نہایت دلچسپی سے یہ تماشا دیکھتے رہے۔ پھر یکایک امریکی نوجوان نے قریب پڑا ہوا ایک پتھر اُٹھایا اور ہنس کر بولا:

''ذرا دیکھنا میں آپ لوگوں کو ایک اور دلچسپ کھیل دکھاتا ہوں۔ میں یہ پتھر ان کے قریب پھینکوں گا۔ وہ دونوں حیران ہوں گے کہ یہ پتھر کہاں سے آن گرا۔''

''ارے یہ کیا غضب کرتے ہو۔'' میری بیوی نے اسے روکتے ہوئے کہا۔'' وہ ڈر جائیں گے۔ کیوں ان کا مزا کرکرا کرنے کی فکر میں ہو۔''

''مادام، آپ قطعاً نہ گھبرائیے۔ یہ کھیل اور دلچسپ بن جائے گا۔''

''اچھا بھئی تمہاری مرضی مگر خدا کے لیے ذرا احتیاط سے پتھر پھینکنا۔ کہیں تم اس پیارے سے ننھے بچے کو زخمی نہ کردو۔''

''ارے آپ خواہ مخواہ ڈرتی ہیں۔ کیا میں بچہ ہوں جو ایسی بے احتیاطی کروں گا۔'' امریکی نوجوان نے گردن ہلا کر کہا۔'' مادام، میں تو ایسا رحم دل آدمی ہوں کہ میں نے آج تک کسی چیونٹی کو بھی نہیں مارا۔''

''اور شیر چیتے ہلاک کرتا رہا ہوں۔'' میں نے لقمہ دیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنسا اور اپنا ہاتھ بڑھا کر پتھر نیچے پھینک دیا۔

آہ...... وہ منحوس لمحہ جب اس امریکی نے پتھر نیچے پھینکا، مجھے ساری زندگی یاد رہے گا، کیونکہ ہوا کے زور سے وہ وزنی پتھر تیزی سے نیچے گیا اور بلی کے معصوم بچے کے سر پر جا لگا۔ ہمارے دیکھتے دیکھتے اس کا ننھا سا سر پھٹ گیا اور بھیجا باہر نکل آیا۔ چند سیکنڈ تک تڑپنے کے بعد وہ وہیں ٹھنڈا ہوگیا۔

اب ہم تینوں آنکھیں پھاڑے بلی کے بچے کی لاش کو دیکھ رہے تھے جو چند ثانیے پیشتر جوانی، زندگی اور حسن کی بہترین تصویر تھا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس غیر متوقع حادثے نے میرے جسم کو بھی سرد کردیا ہے۔ ایک لمحے کے لیے سوچنے اور سمجھنے کی قوتیں بے کار ہوگئیں۔ یہی حال میری بیوی اور امریکی نوجوان کا تھا، بلکہ میری بیوی کا تو خوف کے مارے چہرہ بھی زرد پڑ گیا تھا۔

پتھر گرتے ہی سیاہ بلی نے سر اُٹھا کر ہماری جانب دیکھا۔ خدا کی پناہ...... اس کی بڑی بڑی سبز آنکھیں یک دم انگاروں کی مانند سرخ ہوگئیں اور اس کا جبڑا بھیانک انداز میں کھل گیا۔ اس نے اپنی شعلہ بار نگاہیں ہوچیسن پر جمادیں۔

میرے بدن میں دہشت سے تھرتھری چھوٹ گئی اور میری بیوی تو تقریباً غش کھا کر میرے اُوپر ہی آن پڑی۔ سیاہ بلی نے پلٹ کر اپنے تڑپتے ہوئے بچے کی جانب دیکھا جو جان کنی کے آخری مراحل سے گزر رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی ٹانگیں کانپ رہی تھیں اور سر پر سے سرخ سرخ خون کی نکلتی ہوئی پتلی سی دھار نے اس کا سارا جسم لت پت کردیا تھا۔ بلی کے حلق سے ایک دردناک چیخ نکلی۔ وہ اُچھل کر اپنی جگہ سے اٹھی اور نہایت محبت سے اپنے مرے ہوئے بچے کا جسم چاٹنے لگی۔ اس کا جبڑا اپنے بچے کے تازہ خون سے بھر گیا اور جب اس نے منہ کھولا تو اس کے لمبے سفید چمکتے ہوئے دانت دیکھ کر میرا کلیجہ بھی حلق میں آگیا۔ اس کے لمبے لمبے نوکیلے ناخن بھی پوری طرح باہر نکلے ہوئے تھے اور اس وقت وہ جوش اور انتقام کا ایسا نمونہ بن گئی تھی کہ بیان کرنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں۔

چند لمحے تک وہ نہایت غیظ آلود اور نفرت انگیز نظروں سے امریکی کو تکتی رہی اور پھر پوری قوت سے دوڑتی ہوئی آئی اور قلعے کی پتھریلی دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی۔ اس کے حلق سے اب غراہٹوں اور چیخوں کی دلدوز آوازیں نکل رہی تھیں۔

بلی کا یہ غیظ و غضب اور جوش کی حالت دیکھتے ہوئے مجھے یقین تھا کہ اگر اس کا بس چلے، تو وہ امریکی نوجوان کی بوٹیاں اُڑادے گی۔ اس کی خوف ناک شکل اور غرانے، چیخنے اور سپید دانت دکھانے کا انداز اتنا ڈراؤنا تھا کہ میری بیوی اسے برداشت نہ کرسکی۔ اسے ہوش میں لانا بھی میرے لیے ایک مسئلہ بن گیا۔ بلی بار بار دوڑتی ہوئی آتی اور قلعے کی سنگین غیر ہموار دیوار پر چڑھنے کی کوشش کرتی مگر ہر مرتبہ منہ کے بل نیچے گر جاتی، تاہم اس کے جوش و خروش میں اضافہ ہی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک مرتبہ جب وہ اس کوشش میں ناکام ہو کر نیچے گری، تو اپنے مرے ہوئے بچے پر جا پڑی اور بلی کا سارا جسم خون میں لت پت ہوگیا۔ امریکی وہیں کھڑا اس کی ان حرکات کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ شاید اس کے لیے یہ بھی ایک پُرلطف تماشا تھا۔ میں جلدی سے اپنی بیوی کو وہاں سے ہٹا کر ذرا فاصلے پر ایک جگہ سائے میں لے گیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیریں کرنے لگا۔ چند منٹ بعد امیلیا ہوش میں آ گئی، لیکن اس کی آنکھوں سے خوف کے آثار نمایاں تھے۔

اسے وہیں چھوڑ کر جب میں دوبارہ دیوار کے قریب گیا تو ہوچیسن نے کہا:

''میں نے دنیا میں ایک سے ایک خوف ناک درندے دیکھے ہیں، مگر جس وحشی پن کا مظاہرہ سیاہ بلی کر رہی ہے، یہ میرا

پہلا مشاہدہ ہے۔ اس کا غصہ ہر لمحے بڑھتا ہی جاتا ہے۔''

اس کے بعد وہ اسی طرح کا ایک اور قصہ بیان کرنے لگا جسے میں نے ڈھنگ سے نہیں سنا کیونکہ میں بلی کی عجیب و غریب حرکات دیکھنے میں لگا ہوا تھا۔ اس نے پندرہ یا بیس مرتبہ دیوار پر چڑھنے کی کوشش کی اور ایک بار تو وہ کافی اوپر آ گئی تھی کہ پیر پھسل جانے کے باعث دھڑام سے نیچے جا گری۔ یقیناً اسے سخت چوٹ لگی تھی لیکن بلی نے اس چوٹ کی کوئی پروا نہ کی اور نئے ولولے کے ساتھ دوبارہ دوڑتی ہوئی آئی اور دیوار پر چڑھنے لگی۔ یہ دیکھ کر امریکی کہنے لگا:

''اس جانور کی ہمت پر آفرین ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ دیوار پر چڑھ کر ہی دم لے گی مگر افسوس کہ وہ یہاں کبھی نہ پہنچ سکے گی۔ تھوڑی دیر بعد جب اس کا غصہ سرد پڑ جائے گا، تو وہ اس حادثے کو بھول جائے گی۔ افسوس...... صد افسوس۔ مجھے بالکل معلوم نہ تھا کہ پتھر اس کے بچے کو لگ جائے گا۔ یہ حادثہ بالکل اتفاقیہ ہوا ہے۔ میری نیت اسے ہلاک کرنے کی نہ تھی۔ خیر! اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ اب اس کے بچے میں دوبارہ جان نہیں ڈالی جا سکتی۔''

اتنا کہہ کر وہ پیچھے ہٹ گیا اور اس کے پیچھے ہٹتے ہی بلی نے بھی دیوار پر چڑھنے کی کوشش ترک کر دی اور وہیں بیٹھ کر اپنی غضب ناک نظروں سے اُوپر دیکھنے لگی۔

پھر وہ مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگا: ''کرنل، مجھے افسوس ہے کہ اس حادثے نے آپ کو ذہنی کوفت میں مبتلا کر دیا۔ آہ...... میں دیکھتا ہوں کہ آپ کی بیوی نے تو اس کا بہت ہی زیادہ ناگوار اثر قبول کیا ہے۔ مجھے ان سے معذرت کرنی چاہیے۔''

یہ کہہ کر وہ اس جگہ گیا جہاں میری بیوی آرام سے لیٹی تھی۔

''مادام...... کیا آپ مجھے معاف نہ کریں گی؟ یقین کیجیے، اس میں میری کوئی خطا نہ تھی۔ بلی کے بچے کی قسمت میں اسی طرح مرنا لکھا تھا۔ اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ اسے فراموش کر دیجیے اور آئیے قلعے کی باقی چیزیں دیکھ کر ہم جلد از جلد اس منحوس مقام سے رخصت ہوں۔''

ہم تینوں ادھر سے گزرتے ہوئے جب فصیل کے قریب آئے تو غیر ارادی طور پر ہم نے نیچے جھانکا۔ سیاہ بلی اسی طرح بیٹھی اُوپر دیکھ رہی تھی۔ جونہی امریکی کا چہرہ اسے نظر آیا، اس نے وہیں سے چھلانگ لگائی۔ اس کے دونوں پنجے اس انداز میں باہر نکلے ہوئے تھے جیسے وہ امریکی کا منہ نوچ لینا چاہتی ہو، مگر وہ حسبِ معمول پھر نیچے جا پڑی۔ ساٹھ فٹ اُونچی دیوار پر چڑھنا بلاشبہ بلی کے لیے ایک ناممکن بات تھی۔ امریکی نے اب خوش طبعی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بلی کو مخاطب کیا:

''پیاری بلی...... مجھے معاف کر دو۔ میں نے جان بوجھ کر تمہارے بچے کو نہیں مارا۔ میں تو دراصل تمہارا کھیل اور دلچسپ بنانا چاہتا تھا۔ اب یہ اتفاق تھا کہ پتھر تمہارے بچے کو جا لگا اور وہ مر گیا۔ بخدا اس میں میرا ذرّہ برابر بھی قصور نہیں۔ اب تم دیوار پر چڑھنے کی کوشش چھوڑ کر بچے کے کفن دفن کا بندوبست کرو۔ جاؤ شاباش۔''

امیلیا ایک بار پھر بلی کو دیکھ کر ڈر کے مارے کانپنے لگی اور اس نے نوجوان سے کہا:

ہوچیسن، تم اسے مذاق نہ سمجھو۔ بلی کا ارادہ فاسد ہے۔ وہ اگر یہاں ہوتی، تو تمہیں ضرور مار ڈالتی۔ مجھے اس کی آنکھوں میں تمہارے لیے نفرت اور حقارت کی چنگاریاں سلگتی دکھائی دے رہی ہیں۔''

وہ قہقہہ مار کر ہنسا اور کہنے لگا:

''مادام، آپ مجھے...... شیر دل ہوچیسن کو...... اس حقیر سیاہ بلی سے ڈراتی ہیں جو نہ جانے کتنے درندوں کو موت کے گھاٹ اُتار چکا۔ یہ بلی میرے سامنے کیا حقیقت رکھتی ہے۔ میں چاہوں تو نیچے جا کر آپ کے سامنے اس کا گلا گھونٹ دوں۔''

بلی نے جب ہوچیسن کا قہقہہ سنا، تو اس میں دفعتاً ایک عجیب تغیر رونما ہوا۔ اس کا سارا جوش و خروش اور غضب یک لخت ختم ہو گیا اور وہ پُرسکون دکھائی دینے لگی۔ اس نے پھر ہوچیسن کی طرف ایک بار دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی ہوئی اس طرف گئی جہاں اس کا بچہ مرا پڑا تھا اور پھر زبان نکال کر بچے کا جسم چاٹنے لگی۔

''واقعی بلی تمہیں دیکھ کر اب ڈر گئی ہے۔ دراصل اس نے تمہاری آواز سن کر اندازہ لگا لیا ہو گا کہ یہ شخص تو بہت بڑی بلا ہے۔ اس سے نبٹنا آسان کام نہیں۔'' میں نے اسے چھیڑتے ہوئے کہا۔ امیلیا بھی یہ فقرہ سن کر ہنس پڑی اور ہم تینوں وہاں سے آگے بڑھے۔ تھوڑی دور جانے کے بعد جب ہم نے نیچے جھانکا تو یہ دیکھ کر ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی کہ سیاہ بلی بھی اسی جانب چلی جا رہی تھی جدھر ہم جا رہے تھے۔ اس نے منہ میں اپنے مردہ بچے کو دبا رکھا تھا لیکن چند لمحے بعد جب ہم نے دیکھا تو مردہ بچہ اس کے منہ میں نہ تھا۔ بلی نے شاید اسے کسی جگہ چھپا دیا تھا۔ اسے پُراسرار انداز میں تعاقب کرتے دیکھ کر امیلیا پر پھر خوف طاری ہونے لگا اور اس نے امریکی کو ہوشیار رہنے کی تاکید کی مگر وہ بے پروائی سے ہنسا اور کہنے لگا:

''مادام، آپ کو اس بلی سے ڈرنے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ اگر وہ ہمارے پیچھے آتی ہے تو آنے دیجیے۔ بھلا وہ میرا کیا بگاڑ سکتی ہے؟ اور فرض کیجیے اگر اس کا ارادہ مجھے نقصان پہنچانے کا ہے تو میں ابھی آپ کے سامنے اس کا خاتمہ کیے دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنی کمر سے بندھا ہوا پستول نکالنا چاہا۔ ''زیادہ سے زیادہ یہی ہو گا نا کہ ایک بلی کو مارنے کے جرم میں چند منٹ کے لیے پولیس مجھے پکڑ لے گی۔ وہ مجھے پھانسی پر لٹکانے سے تو رہی۔''

امیلیا نے اسے پستول نکالنے سے روکا، ورنہ وہ ضرور بلی پر گولی چلا دیتا۔

ہوچیسن نے ایک بار پھر نیچے جھانکا۔ بلی اسے دیکھ کر غرّائی اور پھر جلدی سے ایک پتھر کی آڑ میں ہو گئی۔ میں اس کی یہ حرکت دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ کیا بلی کو ہوچیسن کے مہلک ارادے کا پتہ چل گیا تھا؟ بلی کے یوں دبک جانے پر ہوچیسن نے فخریہ انداز میں امیلیا کی جانب دیکھا اور کہا:

''دیکھا مادام آپ نے؟ یہ شریر بلی اب مجھ سے ڈرنے لگی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اسے یہاں سے لوٹ کر اپنے مردہ بچے کی حفاظت کرنی چاہیے۔ کہیں دوسری بلیاں اسے ہڑپ نہ کر لیں۔ جاؤ خالہ بلی، یہاں سے ٹل جاؤ، ورنہ میرا پستول خواہ مخواہ چل جائے گا۔''

امیلیا نے جلدی سے ہوچیسن کا ہاتھ پکڑا اور اسے گھسیٹ کر آگے لے گئی لیکن جاتے جاتے بھی امریکی نوجوان نے نیچے جھانک کر بلی سے چند مزاحیہ فقرے کہہ ہی دیے:

''اچھا، الوداع...... خالہ بلی۔ میں تم سے معذرت کر چکا کہ میں نے جان بوجھ کر تمہارے بچے کو نہیں مارا مگر تم ہمارا پیچھا ہی نہیں چھوڑتیں۔ بہرحال تم اب اس حادثے کو فوراً فراموش کر دو۔''

جلد ہی ہم قلعے کی اندرونی دلچسپیوں اور عجائبات کو دیکھنے میں اس قدر محو ہو گئے کہ تھوڑی دیر پہلے جس ناخوشگوار حادثے نے ہمیں مکدر کر دیا تھا، اس کی یاد بھی باقی نہ رہی۔ پھرتے پھرتے آخر کار ہم قلعے کی سب سے زیادہ مشہور اور ہیبت ناک جگہ پر پہنچ ہی گئے، جہاں 9 سو سال قبل مجرموں اور جاسوسوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا جاتا تھا۔

اس وسیع و عریض کمرے کے عمر رسیدہ چوکیدار نے ہمارا استقبال کیا۔ وہ ہمیں دیکھ کر خاصا خوش نظر آتا تھا، کیونکہ اس روز وہاں کی سیر کرنے والے ہم تین ہی افراد تھے۔ چونکہ چوکیدار کی بالائی آمدنی کا ذریعہ سیاحوں کی دی ہوئی بخشش ہی ہوتی ہے، اس لیے وہ ضرورت سے زیادہ ہماری جانب توجہ دے رہا تھا۔ وہ عرصۂ دراز سے اس کمرے کا چوکیدار تھا اور یہاں رکھی ہوئی ہر شے کے متعلق اس کی معلومات حیران کن

تھیں۔

جب ہم اندر داخل ہوئے تو ماحول کی تاریکی اور اس میں رکھی ہوئی عجیب اور پُراسرار مشینوں اور ہتھیاروں نے ہمارے اعصاب پر برا اثر ڈالا۔ یہ گنبد نما کمرا دو حصوں پر مشتمل ہے۔ اُوپر کے حصے میں جانے کے لیے چند سیڑھیاں طے کرنا پڑتی ہیں۔ ہم نے پہلے نچلے کمرے کو دیکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہاں دن کے وقت بھی ملگجا سا اندھیرا تھا۔ اس کی دیواریں بہت چوڑی اور موٹی تھیں۔ اُوپر کی جانب کوئی روشن دان نہ ہونے کے باعث روشنی اور ہوا آنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ دیواروں کا پلستر جگہ جگہ سے اکھڑ چکا اور جا بجا مکڑوں نے بڑے بڑے جالے تن رکھے تھے جنھیں صاف کرنے کا خیال شاید منتظمین کو کبھی نہ آیا۔

ہم نے جب غور سے ان دیواروں کا معائنہ کیا، تو ان پر بڑے بڑے سیاہ دھبے بھی دکھائی دیے۔ بوڑھے چوکیدار نے بتایا کہ یہ دھبے صدیوں پرانے ہیں اور یہ خون ان لوگوں کا ہے جن کو کسی جرم یا جاسوسی کے شک میں پکڑ کر اذیتیں دی جاتی تھیں۔ چند ہی لمحے بعد ہمیں احساس ہونے لگا کہ اس بھیانک کمرے کی دیواریں زندہ اور ان کے اندر سے ہمیں ان بدنصیب لوگوں کے چیخنے اور کراہنے کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ امیلیا کے چہرے کی اُڑی ہوئی رنگت سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ کمرے کے ماحول سے ڈر رہی ہے لیکن میری خاطر وہ بظاہر بڑی دلچسپی سے ان چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ کتنے آدمیوں پر ڈھائے جانے والے ظلم و ستم کی داستانیں ان خونیں دیواروں میں پوشیدہ تھیں۔

ہم بہت جلد گھبرا کر اس وحشت ناک جگہ سے نکل آئے۔ چوکیدار اب ہمیں اُوپر کی سیڑھیوں کے ذریعے دوسرے کمرے میں لے جا رہا تھا۔

جونہی ہم دوسرے کمرے میں داخل ہوئے، دہشت کی ایک نئی لہر ہمارے جسموں میں دوڑ گئی۔ امیلیا نے میرا بازو سختی سے تھام لیا۔ اس کا ہاتھ کپکپا رہا تھا اور خود میرا یہ حال تھا کہ اپنے دل کے دھڑکنے کی آواز بخوبی سن سکتا تھا۔ اس کمرے کا ماحول نچلے کمرے کے ماحول سے بھی کہیں زیادہ خوف ناک تھا۔ اس کی ہر شے اندھیرے میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں گھور رہی تھی اور ہم نے ان اذیت دینے والی مشینوں اور دیواروں پر لگے ہوئے سینکڑوں قسم کے ہتھیاروں کے قہقہوں کی آوازیں بھی سنیں۔

بوڑھے چوکیدار نے فوراً محسوس کر لیا کہ ہم ڈر گئے ہیں۔ اس نے جلدی سے ایک موم بتی جلائی جس کی مدھم کانپتی ہوئی روشنی وسیع و عریض کمرے میں پھیل گئی۔ اب ہم آسانی سے یہاں رکھی ہوئی چیزوں کو پہچان سکتے تھے۔ چاروں طرف دیواروں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کی تلواریں، کلہاڑے، نیزے اور خنجر لگے ہوئے تھے۔ ان میں سے اکثر تلواریں اور کلہاڑیاں اتنی بڑی اور وزنی تھیں جنھیں اُٹھانا عام آدمی کے بس کی بات نہ تھی۔ غالباً وہ ان گرانڈیل حبشی جلادوں کے استعمال میں آتی تھیں جنھیں خاص طور پر مجرموں کی گردن اُڑانے کے لیے تربیت دی جاتی تھی۔

ان ہتھیاروں کے قریب ہی پرانی سیاہ لکڑی کے بہت بڑے بڑے کندے بھی پڑے دکھائی دیے جن پر جا بجا کسی روغن کے دھبے جمے ہوئے تھے۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ لکڑی کے یہ وہ کندے ہیں جن پر مجرموں کو لٹا کر ان کی گردن کاٹی جاتی تھی۔ ہم نے جھک کر ان کندوں پر تلواروں کے گہرے نشان بھی دیکھے۔ کمرے کے ایک حصے میں وہ تمام چھوٹی بڑی مشینیں یکجا رکھی تھیں جو مجرموں اور جاسوسوں کو اذیت پہنچانے کے لیے استعمال کی جاتی تھیں۔ انھیں دیکھ کر ہی ہیبت طاری ہوتی تھی۔

یہاں ہم نے ایک کرسی دیکھی جس کی نشست پر لوہے کی لمبی لمبی اور نہایت ہی نوکیلی سلاخیں لگی تھیں۔ چوکیدار نے

ہمیں بتایا کہ یہ موت کی کرسی ہے۔ اس پر مجرم کو بٹھا دیا جاتا اور یہ سلاخیں اس کے گوشت میں پیوست ہو جایا کرتیں۔ ایسا مجرم کئی دن جان کنی کی حالت میں مبتلا رہنے کے بعد مرتا تھا۔

اس کرسی کے علاوہ متعدد قسم کے شکنجے بھی موجود تھے جن میں انسانی جسم کو اس طرح جکڑا جا سکتا تھا کہ ذرا بھی جنبش نہ کر سکے۔ لوہے کی چھوٹی بڑی پیٹیاں، لوہے کے جوتے، سر اور گردن کو جکڑنے والے شکنجے اور آہنی خول جو بھیجے کو کھوپڑی سے باہر نکال سکتے تھے۔

کمرے میں گھومتے ہوئے ہم ایک بڑی سی آہنی مشین کے قریب پہنچے جس کی عجیب و غریب ساخت نے امریکی نوجوان کو بہت متاثر کیا۔ یہ مشین ایک عورت کے مجسمے سے مشابہ تھی اور اس میں جا بجا زنگ لگا ہوا تھا۔ اس کے عین وسط میں کچھ اُوپر اُٹھا ہوا ایک بڑا سا آہنی کڑا تھا جس میں موٹا سا رسا بندھا تھا۔ اس رسے کا دوسرا سرا ایک ستون سے بندھا ہوا تھا۔ چوکیدار نے ہمیں بتایا کہ اس مشین کو ''آئرن ورجن'' کہتے ہیں اور اذیت دے کر ہلاک کرنے کے لیے اس مشین سے زیادہ بہتر اور کوئی مشین نہیں۔ آپ اسے غور سے دیکھیے۔ یہ برسوں تک خون میں نہا چکی ہے اور اب بھی اس کے ایک ایک حصے پر خون کی جمی ہوئی تہ آپ دیکھ سکتے ہیں۔

چوکیدار نے ستون سے بندھا ہوا موٹا رسا کھولا اور پوری قوت سے اسے کھینچنے لگا۔ اب ہم نے حیرت سے دیکھا کہ مشین کے اُوپر بنا ہوا ایک چھوٹا سا دروازہ گڑگڑاہٹ کی سی آواز کے ساتھ آہستہ آہستہ اُوپر اُٹھنے لگا۔ یہ آہنی دروازہ بہت بھاری تھا، کیونکہ اسے کھینچتے ہوئے بوڑھا چوکیدار جلد ہی ہانپنے لگا، تاہم اس نے دروازہ پوری طرح اُوپر اُٹھا دیا جس پر بہت سی نوک دار سلاخیں لگی ہوئی تھیں اور ہمیں مشین کے اندر دیکھنے کا اشارہ کیا۔ آہنی دروازہ اُٹھنے کے بعد مشین کے اندر اتنی جگہ تھی جس میں ایک آدمی آسانی سے لیٹ سکتا تھا۔

چوکیدار نے ہمیں بتایا: ''اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ یہ مشین کس کام آتی تھی۔ ملزم کے ہاتھ پیر باندھ کر اس مشین کے اندر خالی جگہ میں لٹا دیا جاتا تھا اور لوہے کے اس سلاخ دار دروازے کو آہستہ آہستہ نیچے گرایا جاتا۔ بدنصیب قیدی جب ان خون آشام سلاخوں کو اپنی آنکھوں اور جسم کی طرف بڑھتے دیکھتا، تو موت کے لرزہ خیز خوف سے جرم کا اقبال کر لیتا اور سارے راز اُگل دیتا، لیکن بعض ایسے مجرم بھی ہوتے جو اس حالت میں بھی زبان نہ کھولتے، تو رسے کو فوراً چھوڑ دیا جاتا اور یہ آہنی دروازہ پوری قوت سے نیچے گر جاتا۔ سلاخیں قیدی کے تمام جسم میں پیوست ہو جاتیں اور وہ آناً فاناً موت سے ہم کنار ہو جاتا۔

امیلیا کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی اور وہ دوڑتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ میں اس کے پیچھے گیا۔

''خدا کے واسطے مجھے اس منحوس جگہ سے فوراً لے چلو...... میں یہاں اب ایک لمحے کے لیے بھی نہیں ٹھہر سکتی، ورنہ میرے دل کی حرکت بند ہو جائے گی۔'' میں نے اسے دلاسا دیا اور کہا کہ ہم تو صرف یہاں کے عجائبات دیکھنے آئے ہیں اور ہمارے ساتھ ایک مہمان بھی ہے۔ وہ کیا خیال کرے گا۔ میں اسے سمجھا بجھا کر جب واپس کمرے میں لایا، تو امریکی نوجوان اس مشین کے پاس کھڑا اس کا بغور معائنہ کر رہا تھا۔ مجھے آتے دیکھ کر وہ بولا:

''آپ کی بیوی بہت کمزور دل کی خاتون ہیں۔ بلاشبہ انھیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں نے آپ کی غیر حاضری میں اس مشین کے بارے میں بعض دلچسپ باتیں چوکیدار سے معلوم کی ہیں۔ میں نے اپنے ملک کے ریڈ انڈین باشندوں کے متعلق بڑی بڑی داستانیں سنی تھیں کہ وہ اپنے دشمنوں اور حریفوں کو عجیب عجیب سزائیں دیتے تھے، مگر یہ مشین بے مثال ہے۔ خدا کی پناہ...... مجھے تو اس کے تصور ہی سے اذیت ہوتی ہے، لیکن...... میں اپنا تجربہ مکمل کر کے ہی واپس جاؤں گا۔''

"کیا کہتے ہو، کیسا تجربہ؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔
وہ مسکرایا اور کہنے لگا:
"یہی معمولی سا تجربہ۔ میں خود ایک منٹ کے لیے اس مشین کے اندر لیٹ کر دیکھنا چاہتا ہوں کہ لوہے کا یہ سلاخ دار دروازہ کس طرح آہستہ آہستہ نیچے آتا ہے۔"
"نہیں، نہیں۔" امیلیا نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔
"خدا کے لیے ہوچیسن ایسا نہ کرنا۔ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟"
"آپ جو چاہیں سمجھیں مگر میں یہ تجربہ کر کے رہوں گا۔" ہوچیسن نے اصرار کیا۔ "اگر آپ ڈرتی ہیں تو تھوڑی دیر کے لیے کمرے سے باہر چہل قدمی کیجیے۔ میں آپ سے کتنی مرتبہ کہہ چکا کہ میں ڈرپوک آدمی نہیں۔ نہ جانے اب تک کیسے کیسے واقعات و حادثات مجھ پر بیت چکے ہیں۔ آپ یقین نہیں کریں گی، لیکن یہ حقیقت ہے کہ ایک مرتبہ مونٹانا کے جنگل سے میں گزر رہا تھا کہ دشمنوں نے مجھے مار ڈالنے کے لیے جنگل میں آگ لگا دی۔ میں رات بھر ایک مرے ہوئے گھوڑے کے اندر چھپا رہا، تب جان بچی۔ اسی طرح نیومیکسیکو میں مجھے سونے کی ایک کان میں جو حادثہ پیش آیا، وہ بڑا خوف ناک تھا۔ دو روز تک میں ایک غار میں قید رہا جس کے دروازے پر ایک بڑا پتھر آن گرا تھا۔ غور کیجیے جب ایسے ایسے عظیم حادثوں سے میں بچ گیا، تو اس دو منٹ کے تجربے سے کیا قیامت برپا ہو جائے گی۔"
میں نے دیکھا کہ وہ اپنی ہٹ کا پکا ہے اور یہ کام ضرور کر گزرے گا تو کہا:
"اچھا...... اچھا...... جو کچھ کرنا ہے جلدی کر لو۔ ہم اب یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتے۔ میری بیوی کی طبیعت ناساز ہو گئی ہے۔"
امریکی نے مسخرے پن سے مجھے سیلوٹ کیا اور کہنے لگا:
"جو حکم جناب کا۔ بس ابھی فارغ ہوا چاہتا ہوں۔"
پھر وہ چوکیدار سے مخاطب ہوا جو امریکی نوجوان کے اس خطرناک تجربے میں مدد دینے پر راضی نہ تھا۔
"بڑے میاں، تم بھی ڈر گئے؟ یہ لو اپنی جیب گرم کرو۔" ہوچیسن نے سونے کا ایک سکہ بوڑھے کی مٹھی میں دیتے ہوئے کہا۔ "اب لپک کر ایک رسی سے میرے ہاتھ پاؤں باندھ کر اس مشین میں مجھے لٹا دو تاکہ میں اس تجربے کا وہی مزا پا سکوں جو پرانے زمانے کے مجرموں کو ملتا تھا۔"
بوڑھے چوکیدار کو پہلی مرتبہ اس معاملے کی نزاکت کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر کہا:
"جناب، آپ یہ حرکت نہ کریں۔ اس میں جان کا خطرہ ہے۔ فرض کیجیے اگر رسا میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا تو......؟"
امریکی نے جوش میں آ کر کہا: "بڑے میاں، تمہیں زیادہ دیر تک رسا پکڑنا نہیں پڑے گا۔ بس ایک یا دو منٹ کا کام ہے۔ اس کے بعد میرا دوست مجھے مشین سے باہر نکال لے گا۔ تم فکر نہ کرو۔ اس تجربے کی ساری ذمے داری مجھ پر ہے۔ کہو تو تحریر لکھ کر دے دوں۔"
"اچھا صاحب، جس طرح آپ کہتے ہیں، کرتا ہوں، مگر براہ کرم باہر کسی سے اس کا ذکر نہ کیجیے گا، ورنہ میری ملازمت جاتی رہے گی، روزی کا معاملہ ہے صاحب۔"
"اجی تم پروا نہ کرو...... ذرا جلدی سے رسی تلاش کر لاؤ۔"
چوکیدار باہر گیا اور پتلی رسی کے دو لمبے لمبے ٹکڑے لے کر آیا اور پہلے اس نے ہوچیسن کے دونوں ہاتھ پشت کی طرف باندھ دیے اور پیر باندھنے والا تھا کہ ہوچیسن نے کہا:
"بڑے میاں، ذرا ٹھہرو۔ تمہاری دعا سے میں کافی صحت مند آدمی ہوں۔ تم مجھے اُٹھا کر اس مشین کے اندر لٹا نہیں سکو گے۔ اس لیے میں خود اس میں داخل ہو جاتا ہوں۔ بعد ازاں تم میرے پیر بھی باندھ دینا۔"
یہ کہہ کر وہ اُٹھا اور مشین کے اندر داخل ہو کر اس اطمینان

سے لیٹ گیا جیسے کسی آرام دہ بستر پر سونے کا ارادہ ہو۔ چوکیدار نے جلدی سے اس کی دونوں ٹانگیں باندھ دیں۔ ہوچیسن اب موت کی اس مشین میں بالکل بے بس پڑا تھا لیکن خوف کی کوئی علامت اس کے چہرے پر ظاہر نہ ہوئی، بلکہ وہ بچوں کی طرح اس "کارنامے" پر خوش ہو رہا تھا۔
"واہ واہ...... کیا شاندار جگہ ہے...... بھئی میرا تو جی چاہتا ہے کہ اس مشین کو اپنے ساتھ امریکہ لے جاؤں۔ بڑی آرام دہ چیز ہے۔ اچھا بڑے میاں، اب تم اس آہنی دروازے کو ذرا ڈھیل دے کر آہستہ آہستہ نیچے اُتارو۔ میں دیکھوں تو سہی کہ جب یہ سلاخیں میری جانب بڑھیں گی، تو کیا مزا آتا ہے۔"
"اوہ...... خدا رحم کرے...... ہوچیسن! کیا تم اس بے ہودہ مذاق سے باز نہیں آ سکتے؟" میری بیوی چلاّ اٹھی۔ "بس کافی ہے۔ تمہارا تجربہ مکمل ہو گیا۔ اب باہر آ جاؤ۔"
ہوچیسن نے قہقہہ لگایا اور مجھ سے کہنے لگا: "کرنل صاحب، مہربانی کر کے اپنی ڈرپوک بیگم کو ذرا باہر گھمانے لے جائیے۔ غضب خدا کا...... میں آٹھ ہزار میل کا سفر طے کر کے محض اس مشین کی خاطر آیا ہوں اور اب اس کے اصل تجربے سے محروم ہی چلا جاؤں؟ ہرگز نہیں ہو سکتا۔ آپ پانچ دس منٹ ان کو سیر کرائیے، اتنی دیر میں یہ تجربہ پورا ہو جائے گا۔ پھر ہم اسے یاد کر کے خوب ہنسیں گے۔"
امیلیا کی حالت اگرچہ ابتر ہو رہی تھی مگر وہ کمرے سے باہر جانے پر تیار نہ تھی۔ وہ خاموشی سے میرا بازو پکڑے ہوچیسن کی طرف تکتی رہی۔ بوڑھا چوکیدار آہستہ آہستہ، ایک ایک انچ کر کے رسا چھوڑنے لگا اور آہنی دروازہ مشین کی طرف جھکتا گیا۔ ہوچیسن کا چہرہ فرطِ مسرت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس کی آنکھیں لمبی نوک دار سلاخوں پر جمی ہوئی تھیں۔ یکایک وہ کہنے لگا:
"کرنل، سچ کہتا ہوں کہ اپنی زندگی میں اتنا لطف میں نے پہلے کبھی نہیں اٹھایا۔ بخدا تم بھی اس تجربے کو آزما دیکھو۔ اے بڑے میاں! ذرا آہستہ...... تم تو ایک دم رسا چھوڑ دینے پر تلے ہوئے ہو۔"
بوڑھے چوکیدار نے رسا پوری قوت سے پکڑ رکھا تھا، لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ لحظہ بہ لحظہ اس کی پریشانی اور اضطراب میں اضافہ ہو رہا ہے۔ پانچ منٹ کے قلیل عرصے میں آہنی دروازہ صرف تین انچ کے قریب جھک سکا تھا۔ دفعتاً میں نے اپنے بازو پر ایک تھرتھراہٹ سی محسوس کی۔ امیلیا کی انگلیوں کی گرفت نرم پڑ رہی تھی۔ میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے کا رنگ ہلدی کے مانند زرد اور ہونٹ سپید پڑ گئے تھے۔ وہ پلک جھپکائے بغیر مشین کے ایک جانب گھور رہی تھی۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کیا، تو دہشت سے میری رگوں کا خون جم گیا۔
خدا کی پناہ...... وہی منحوس کالی بلی کمرے کے دروازے میں کھڑی مشین کی جانب دیکھ کر غرّا رہی تھی۔ اس کی زرد آنکھیں مشعل کے مانند روشن تھیں۔ اس کے جسم کا رواں رواں کھڑا تھا اور وہ اپنی معمولی جسامت سے دوگنی نظر آتی تھی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی وہ اپنا خون آلود جبڑا کھول کر آگے بڑھی۔ ہوچیسن نے بھی اس کی آواز سن لی تھی۔ وہ وہیں سے چلاّیا:
"کرنل، ذرا اس شریر بلی کو دھتکار کر نکال دو۔"
لیکن...... آہ! اس سے پیشتر کہ میں آگے بڑھتا، بلی نے اپنی لمبی دم کو گردش دی اور بجلی کے مانند اُچھل کر بوڑھے چوکیدار پر حملہ کیا۔ بلی کا دایاں پنجہ چوکیدار کی آنکھ پر پڑا اور آنکھ باہر آ گئی۔ بوڑھے کے حلق سے ایک دلدوز چیخ نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر زمین پر گرا اور موٹا رسا اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔
میں نے رسے کو پکڑنے کے لیے چھلانگ لگائی۔ میری انگلیوں نے اسے چھو لیا مگر اگلے ہی ثانیے میں رسا کڑے میں سے گزر چکا تھا۔ بدنصیب ہوچیسن کے چہرے کی آخری

درختوں کی دنیا

☆انڈونیشیا کے جزیرے جاوا میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جو قد میں سات فٹ کے لگ بھگ لمبا ہوتا ہے۔ قدرت نے اس میں انوکھی خوبی پیدا کی ہے۔ یہ رات کو اس طرح چمکتا ہے کہ اس کی چمک میلوں دور سے دکھائی دیتی ہے اور اس کی روشنی میں پڑھا اور لکھا جاسکتا ہے۔

☆جزائر غرب الہند میں پام کا ایک ایسا درخت موجود ہے جس کے پتے دنیا کے ہر درخت کے پتوں سے زیادہ لمبے ہیں۔ اس کے ایک پتے کی لمبائی 65 فٹ بنتی ہے۔

☆اس وقت دنیا کا سب سے اونچا درخت کیلی فورنیا کے جنگلات میں ہے۔ اس کا نام ہاروڈ ڈیسی ہے۔ اس کی بلندی 37606 فٹ ہے۔

☆جب سکندر اعظم نے ہندوستان پر حملہ کیا تو ہندوستان میں بڑ کا ایک ایسا درخت تھا جو اس قدر پھیلا ہوا تھا کہ سکندر اعظم کی فوج کے سات ہزار سپاہیوں نے اس کے نیچے پڑاؤ ڈالا تھا۔

☆جزائر غرب الہند میں ایک ایسا درخت پایا جاتا ہے جس کی شاخوں کا چھلا اُتار کر ڈبل روٹی کی طرح کھاتے ہیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ اس کا ذائقہ بھی ڈبل روٹی جیسا ہوتا ہے اور تاثیر بھی۔

☆☆☆

جھلک میں مرتے دم تک نہ بھولوں گا۔ موت کے خوف سے اس کا چہرہ دھلے ہوئے کپڑے کی طرح سفید پڑ چکا تھا اور آنکھیں تارہ بن گئی تھیں۔ آہنی دروازہ ایک دھماکے کے ساتھ بند ہوگیا۔ ہوجیسن کے منہ سے آواز تک نہ نکل سکی اور اسی لمحے میری بیوی غش کھا کر دھڑام سے فرش پر گرگئی۔

میں نے اسیلیا کو وہاں سے اُٹھایا اور کمرے سے باہر برآمدے میں لے جا کر ایک بنچ پر ڈال دیا۔ اس وقت میرے ہوش وحواس بھی گم تھے۔ امریکی نوجوان کی بھیانک موت کا تصور خود میرے لیے جان لیوا تھا۔ جب میں کمرے میں دوبارہ گیا تو بوڑھا چوکیدار تکلیف کی شدت سے زمین پر لوٹ رہا تھا۔ اس کا چہرہ اور کپڑے خون میں تر ہو چکے تھے۔

میں نے رسا پکڑ کر پوری قوت سے مشین کا آہنی دروازہ اُٹھایا۔ ہوجیسن کا حال دیکھ کر میری روح لرز گئی۔ لوہے کی سلاخیں اس کی کھوپڑی، سینے اور پسلیوں کو توڑ کر باہر نکل گئی تھیں۔ دروازہ اُوپر اُٹھتے ہی ہوجیسن کا مردہ اور مسخ شدہ جسم پُرشور آواز کے ساتھ کمرے کے فرش پر گرا اور وہ منحوس سیاہ بلی جو ابھی تک موجود تھی، اس کی جانب لپکی اور ہوجیسن کے جسم سے نکلے ہوئے خون کو بڑی رغبت سے چاٹنے لگی۔ میں نے جھپٹ کر وہاں رکھی ہوئی بہت سی تلواروں میں سے ایک تلوار اُٹھائی اور بلی کے دو ٹکڑے کردیے۔ ◆◆◆

تعلیم و تربیت

محمد شہروز اسلم ڈولہ

ڈیجیٹل دنیا

والدین کی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی اولاد بڑھ چڑھ کر زندگی و آخرت کے ہر میدان میں کامیاب و سرخرو ہو۔ وہ اپنی بھرپور کوشش کرتے ہیں کہ اولاد کی بہترین تربیت کریں تاکہ وہ زندگی کے کسی گوشہ میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں۔ دنیا اکیسویں صدی کی دہلیز پر ہے، جدید سائنسی، تعمیر و ترقی کا دور ہے۔ جدید ٹیکنالوجی جس میں اسمارٹ فون اور انٹرنیٹ جن کا چولی دامن کا ساتھ ہے، بہت اہم ہیں۔

جدید ٹیکنالوجی کا نام سنتے ہی اکثر والدین گھبرا جاتے ہیں اور اپنی اولاد خصوصاً لڑکیوں کو ان سے دور رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ایسا کرنا درست ہے؟ سچ یہ ہے کہ ایسا کرنا درست نہیں۔

ہمیں اس بات کو سمجھنا ہوگا کہ اب دنیا ''ڈیجیٹل دنیا'' میں تبدیل ہو رہی ہے۔ اگر ہم ٹیکنالوجی سے استفادہ نہیں کریں گے تو بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

تعلیمی اداروں میں داخلہ کے حصول سے آن لائن کورسز تک، سفری معلومات کے بارے میں آگاہ ہونے سے موسم کا حال جاننے تک، اشیاء ضروریات کی سرکاری قیمت معلوم کرنے سے آن لائن شاپنگ تک، ویزا اور ٹکٹ کے حصول سے، گھر پر ٹیکسی سواری منگوانے تک، گھر بیٹھے عجائب گھروں کا دورہ کرنے، ہزاروں میل دور بیٹھے شخص سے بات

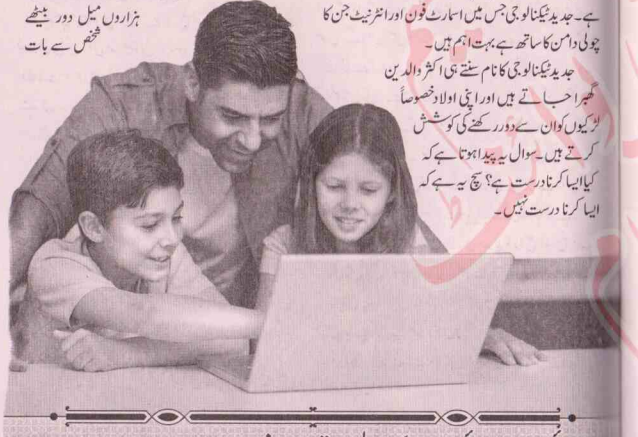

برائی اور اچھائی انسان کے اندر بستی ہے، انتخاب ہمارے ہاتھ میں ہے

چیٹ کرنے تک، غرض بے پناہ سرگرمیاں جواب ٹیکنالوجی کی مرہونِ منت ہیں اور اس میں ہر گزرتے دن کے ساتھ ہوش رُبا اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

جس طرح فریج، بتیاں، قمقمے، پنکھا، اے سی، ٹی وی، ہماری ضرورت بن چکے اسی طرح جدید ڈیجیٹل دنیا میں بہت چیزیں نوجوان نسل ہی نہیں بلکہ ہر عمر کے افراد کی زندگی کا حصہ بن گئی ہیں۔ انٹرنیٹ کی اہمیت کو نظر انداز کرنا حماقت کے علاوہ کچھ نہیں۔

ٹیکنالوجی میں انٹرنیٹ کو محض فحاشی، عریانی اور برائی پھیلانے کا ذریعہ سمجھنا نامناسب ہے۔

"برائی اور اچھائی انسان کے اندر بستی ہے اور انتخاب صرف ہمارے ہاتھ میں ہوتا ہے۔"

بلاشبہ ٹیکنالوجی کے بے دریغ اور غلط استعمال سے نوجوانوں کی ذہنی صلاحیتوں پر جمود طاری ہونے کے قوی امکانات موجود ہیں اور وہ منفی رجحانات کی طرف بھی مائل ہو سکتے ہیں۔ والدین کو اپنے بچوں میں وہ صلاحیتیں بروئے کار لانی ہیں جس کے ذریعے وہ صحیح و غلط، جائز و ناجائز، حلال و حرام میں تمیز کر سکیں۔ انتہاپسندی و دہشتگردی جیسے ہتھکنڈوں سے دور رہیں۔ اس کے برعکس انھیں ٹیکنالوجی تک رسائی ہی نہ دینا خوش آئند بات نہیں۔

اکثر والدین کے اذہان میں خیال پیدا ہوتا ہے کہ انٹرنیٹ اولاد کو دین سے دور کرتا ہے تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ پلے اسٹور پر موجود ایپلی کیشنوں میں دوسری بڑی ایپ "Islam 360" ہے۔ اس کی خاصیت یہ ہے کہ اس میں قرآن مجید بمعہ ترجمہ مختلف زبانوں میں موجود ہے۔

احادیث کی کتابیں، قرآن مجید کی تفاسیر، وڈیو لیکچر بھی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت شاندار فیچر موجود ہے جس کے ذریعے آپ اپنی تجوید ٹھیک کر سکتے ہیں۔ اگر آپ قرآن مجید کا کوئی لفظ غلط پڑھیں گے تو اس کا رنگ تبدیل ہو جائے گا۔ تو ہم کس طرح فیصلہ کر سکتے ہیں ٹیکنالوجی بچوں کو دین سے دُور اور خراب کر رہی ہے۔ یہ منحصر ہے کہ اس ٹیکنالوجی کو کس تصرف میں لایا جا رہا ہے۔

پاکستان میں سی۔ ایس۔ ایس ۲۰۱۸ء میں ٹاپ کرنے والی طالبہ سے جب سوال پوچھا گیا کہ آپ نے تین ماہ کے مختصر عرصہ میں تیاری کیسے کی؟ جنھیں سرانجام دینے میں طالب علم برس ہا برس لگا دیتے ہیں؟ محترمہ نے کئی وجوہ کا تذکرہ کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ ذرائع ابلاغ میں "ٹویٹر" نے ان کی بہت مدد کی۔ جس کی بدولت وہ ملکی اور بین الاقوامی خبروں سے واقف رہتی تھیں۔

جن گھروں میں استطاعت کے باوجود اولاد کو جدید ذرائع ابلاغ سے دور رکھا جاتا ہے کہ ان پر منفی اثرات مرتب ہوں گے، اُن میں احساسِ محرومی جنم لے لیتی ہے۔ انھیں لگنے لگتا ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں سے بہت پیچھے ہیں اور زمانہ قدیم میں جی رہے ہیں۔ دوستوں میں ان کا مذاق بھی بنتا ہے جسے وہ سہہ نہیں پاتے اور پھر ان کے دلوں میں والدین کے خلاف بغاوت کا جذبہ جنم لینے لگتا ہے اور وہ نافرمانی کی حد تک جا پہنچتے ہیں۔ احساس محرومیت جو بُرائی کی جڑ ہے، اس کی بدولت افرادِ خانہ پر منفی اثرات کا پایا جانا یقینی ہو جاتا ہے۔

والدین کو چاہیے کہ اولاد کی جدید ذرائع ابلاغ تک رسائی میں کوئی رکاوٹ حائل نہ ہونے دیں بلکہ ان کے لیے آسانیاں پیدا کریں۔ دونوں فریقین کی بھلائی اسی میں ہے۔ انھیں چاہیے کہ اپنے جگر گوشوں کی تربیت اس انداز سے کریں کہ وہ غلط رُجحانات سے دور رہیں نا کہ ان کو ٹیکنالوجی سے دور رکھا جائے۔

؎ شاید کہ ترے دل میں اُتر جائے میری بات

◆◆◆

شرارت

ڈاکٹر عدیل احمد

'تایا جی' تالوں والے کے 'پیر جی تالوں والے' بننے کا تمام تر سہرا اگر لالہ نثار اور طاہر کے سر باندھ دیا جائے تو یہ سو فیصد درست نہیں ہوگا۔ اس میں کچھ نہ کچھ حصہ ان کی اپنی طبیعت کے فطری رجحان یا شاید فطرت کے طبعی رجحان کا بھی تھا جس نے عرفان کا یہ دروازہ چوپٹ کھلنے سے پہلے ہی نیم وا کر رکھا تھا۔ رہی سہی کسر غفورے حلوائی کے بکرے نے رسمی قربانی سے کچھ دیر پہلے جان دے کر پوری کر دی۔

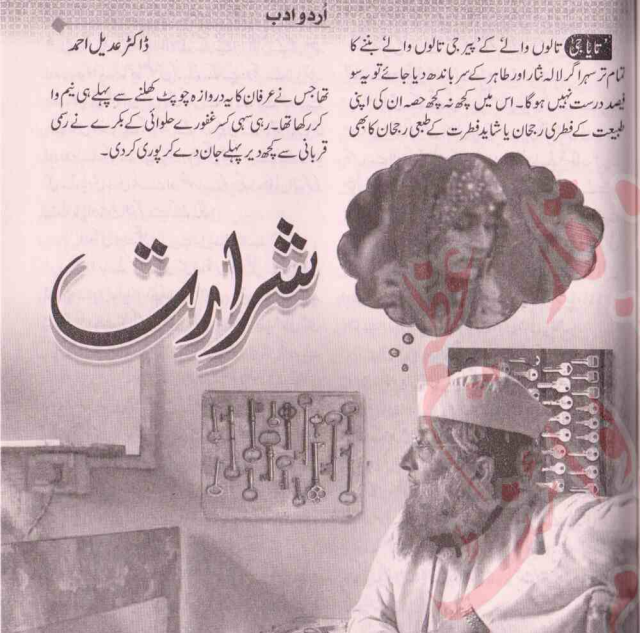

اس اسرار سے کبھی پردہ نہ اُٹھ سکا کہ تایا جی آخر کون تھے؟ دلوں کو چھو لینے والا شاہکار فسانہ

بکرے کا قصہ یہ ہے کہ بڑی عید پر غفورا حلوائی ہمیشہ کی طرح سال بھر کی بھرپور ملاوٹ کے نتیجے اور کفارے میں اللہ اور پیٹ کو ایک ساتھ مطمئن کرنے کے لیے دو بکرے لایا تھا۔ جب تایا جی گلی میں اس کے گھر کے سامنے سے گزر رہے تھے، اس وقت ایک بکرا گھر کے اندر بچوں کے ساتھ نہار رہا تھا اور دوسرے بکرے کے ساتھ وہ خود گلی میں کھڑے تھے۔ تایا جی نے باری باری بکرے اور غفورے کو دیکھا۔ اوّل الذکر کو پسند فرمایا اور موخر الذکر سے کہنے لگے:

''واہ بھئی بہت تگڑا مال ہے۔ ایک ہی لائے؟''

غفورا جانے کس خیال میں ماچس کی تیلی سے دانتوں میں پھنسا ہوا چھالیا کا ادھ کھایا ٹکڑا نکال رہا تھا۔ اس نے شاید تایا جی کی بات سنی بھی یا نہیں۔ بس سر ہلا کر بے خیالی میں ''ہاں'' کہہ دیا۔ اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ کچھ ہی دیر میں غفورے کا دوسرا بکرا مر گیا۔ گو اس میں کچھ نہ کچھ قصور غفورے کے ان دیوزاد بچوں کا بھی تھا جنہوں نے نہلاتے ہوئے اس بکرے کے سر کی صفائی کا خاص خیال رکھتے ہوئے دیر تک اس کا سر پانی کی بھری ہوئی بالٹی میں دبائے رکھا اور اس کے تڑپنے کا تماشا دیکھتے رہے۔ بہر حال کچھ بھی، یہی وہ مشہور واقعہ تھا جس نے عرفان و آگہی کے نیم وا دروازے چوپٹ کھول دیے اور تایا جی تالوں والے باقاعدہ پیر جی بن گئے۔

☆☆☆

پیر بننے سے تایا جی کی نفسیات میں کوئی تبدیلی آئی یا نہیں، مگر ان کی عملی زندگی میں بظاہر کوئی فرق نہیں پڑا۔ پہلے بھی وہ خراب تالے ٹھیک کیا کرتے تھے، پیر بننے کے بعد بھی ان کا یہی کاروبار رہا۔ محلے کے کچھ لڑکے جن کے سرغنہ لالہ نثار تھے، پہلے بھی ان کے ساتھ مہذب شرارتیں کرتے تھے، یہ معمول بعد میں بھی جاری رہا۔ بلکہ اب ان کی شرارتوں کو ایک نئی جہت مل گئی۔ پیر بننے سے پہلے تایا جی کی ازدواجی زندگی اس قدر کڑے اور خراب حالات سے گزر رہی تھی کہ اس میں مزید بگڑنے کی گنجائش نظر نہ آتی تھی لیکن پیری مریدی کا سلسلہ شروع ہونے کے بعد چشم فلک نے ان کے گھریلو تعلقات کو مزید کئی خطرناک موڑ مڑتے دیکھا۔

تایا جی کے قصے کی مزید تفصیل بیان کرنے سے پہلے موزوں ہوگا اگر اس ماحول پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے جس سے ان کی کہانی کے سارے تانے بانے منسلک ہیں۔ مثال کے طور پر کسی بھی اندرون شہر کا کوئی گنجان محلہ لے لیجیے، جہاں رہنے والوں کی ذاتی زندگیاں اس طرح ایک دوسرے میں گندھی ہوئی ہوتی ہیں کہ اصل میں وہاں کسی کی کوئی ذاتی زندگی ہوتی ہی نہیں۔ تحفظ، رواداری، برداشت، امداد باہمی اور منافقت کے ایسے ماحول میں ہر بزرگ مرد چاچا، ماما یا تایا ہوتا ہے اور ہر بزرگ عوت چاچی، مامی، تائی یا خالہ......

یہاں نجی جائیداد کا تصور اگر ہے بھی تو خاصا محدود اور موہوم۔ شادیوں میں محلے کی گلیاں اور پڑوسیوں کے صحن ایک جیسی آسانی اور بے پروائی سے استعمال کیے جاتے ہیں۔ مرگ کے موقع پر ایک دوسرے کی بیٹھکوں میں فاتحہ خوانی کے لیے پھوڑی ڈالی جاتی ہے۔ بیٹھک اصل میں گلی کے رخ کھلنے والا، مکان کا وہ کمرا ہوتا ہے جس میں سب سے کم بیٹھا جاتا ہے اور صرف خاص موقعوں پر ایسے مہمانوں کے لیے ہی کھولا جاتا ہے جنہیں گھر کے اندر نہ لایا جاسکتا ہو۔ ورنہ گھر کے مرد اپنی محفل نکڑ والی دکان پر لگاتے ہیں یا شام کو تازہ چھڑکاؤ کیے صحن میں۔

لڑکے بالے مکانوں کے تھڑوں اور عورتیں زیادہ تر باورچی خانوں اور ڈیوڑھیوں میں بیٹھ کر غیبتیں کرتی ہیں۔ غیبت میں کچھ ایسا قصور ان کا بھی نہیں۔ یہ ہے ہی ایسا شیطانی ذکر کہ بات چاہے گنٹھیا کے علاج کے کسی مجرب وظیفے سے شروع ہو، کچھ دیر میں خود بخود گفتگو میں دَر آتا ہے۔ نوجوان لڑکے لڑکیوں کے محبوب مشاغل بالترتیب پتنگ بازی اور رقعے بازی ہوتے ہیں۔ اس آخر الذکر مشغلے کا عام طور پر کچھ ایسا

جال پھیلا ہوتا ہے کہ اکثر اوقات کسی کی محنت کا پکا پکایا پھل کسی اور کی جھولی میں جا گرتا ہے۔

ایسے ہی ایک محلے میں تایا جی کی رہائش تھی اور گھر سے کچھ دُور جہاں ابھی محلے کی حد ختم بھی نہ ہوتی اور بازار شروع ہو جاتا، ان کی ایک چھوٹی سی تالے مرمت کرنے کی دکان تھی۔ وہ اپنے کام میں ماہر تھے۔ بس ایک ان کی قسمت پر ہی ایسا تالا پڑا تھا جو وہ کبھی نہ کھول سکے ورنہ مدتوں کے بند، زنگ خوردہ تالے جن کی چابیاں گم ہوگئی ہوں، ان کے ہاتھ میں آتے ہی کھل جاتے۔ اپنے پیشہ ورانہ کام کے علاوہ بھڑ کے کاٹے اور ڈاڑھ درد کا دم وہ پیر بننے سے پہلے بھی فی سبیل اللہ کیا کرتے تھے۔ اولاد نرینہ سے محروم تھے لیکن اس محرومی کا احساس ان کے کسی انداز یا رویے سے کبھی نہیں ہوا۔ شاید اس لیے کہ محلے کے جملہ بالغ لڑکے ان کی نرینہ و ناخلف اولاد کی کمی پوری کرنے کے لیے کافی تھے۔ ایک بیٹی تھی جسے اپنی فاقہ مستی اور تنگ دستی کے باوجود تائی جی کی ہمت کی بدولت بیاہ چکے تھے۔

تایا جی کے گھریلو حالات کبھی مثالی نہیں رہے۔ تائی جی اپنی بری قسمت کا ذمہ دار ان کو سمجھتی ہوں یا نہیں لیکن اپنے غصے کے اظہار کے لیے سب سے مناسب ہدف انھی کو گردانتی تھیں۔ یوں تو تایا جی کے چیلوں چانٹوں کو بھی وقتاً فوقتاً تزکیہ نفس کا موقع فراہم ہوتا رہتا لیکن خود تایا جی ان کی ڈانٹ پھٹکار اور لعنت ملامت کا مستقل نشانہ بنے رہتے۔ یہ اندازہ لگانا مشکل ہے کہ تائی جی کا مزاج قدرتی طور پر سخت تھا یا ان کے معاشی حالات اور تایا جی کی لاتعلقی، مزید کمانے کی طرف سے بے فکری اور خود سے آدھی سے بھی کم عمر کے لڑکوں کے ساتھ دوستی نے انھیں اس قدر چڑچڑا اور غصہ ور بنا دیا تھا۔ عین ممکن ہے کہ دونوں ہی باتیں درست ہوں۔

تائی جی کے مقابلے تایا جی دھیمے مزاج کے آدمی تھے اور اُن کی بیشتر باتوں کے جواب میں خاموش رہتے۔ کبھی ہوں، ہاں پر اکتفا کرتے۔ وہ بھی شاید صرف اس لیے کہ تائی جی کو ان کے گوش بر آواز ہونے کا ثبوت ملتا رہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ جس قسم کی گفتگو تائی جی اکثر کیا کرتیں اس کا سب سے مناسب جواب صرف خاموشی ہی ہوسکتا ہے۔ مثلاً ان کے کاروبار اور انداز کاروبار پر تنقید، گزری ہوئی زندگی کی حسرتوں کا ذکر، گزرتی ہوئی زندگی کی شکایتیں، آنے والے وقت سے وابستہ مایوسیاں!

اکثر وہ ان کی لائی ہوئی سبزی میں کیڑے نکالتے نکالتے ان کے حلیے کا تمسخر اڑانے لگتیں۔ حالانکہ تایا جی کا حلیہ کچھ ایسا مضحکہ خیز بھی نہیں تھا۔ عمر پچپن اور ساٹھ کے درمیان ہوگی جو ان کے چہرے مہرے سے ظاہر بھی ہوتی تھی، لیکن کاٹھی خوب مضبوط تھی۔ قد درمیانے سے کچھ زیادہ، کندھے فراخ، بال گھنے اور سفید ہونے پہ آمادہ اور چوڑے ماتھے پر دو مستقل شکنیں۔ آنکھیں تقریباً ہمیشہ پرفکر۔ ڈاڑھی کے بال ٹھوڑی سے اُوپر جاتے بتدریج کم ہوتے چلے گئے تھے۔ جسم چھریرا، ہاتھ پاؤں بڑے بڑے اور ان کی جلد ایسی ہی خشک جیسی اس طبقے کے لوگوں کی عام طور پر اچھی خوراک کی مستقل غیر حاضری کی وجہ سے ہوتی ہے۔

یہ تصویر نامکمل رہے گی اگر پریشانی اور الجھن کے اس دائمی تاثر کا ذکر نہ کیا جائے جو تایا جی کے چہرے پر شناختی نشان کی طرح ثبت تھا۔ اس بارے میں راویوں کی دو مختلف آراء تھیں۔ لالہ نثار، سلیم چھیمے اور طاہر کا خیال تھا کہ یہ تاثر شروع سے یونہی قائم تھا اور جس طرح محلے کے بڑے بوڑھوں کی مدد کے باوجود یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ تایا جی کب، کس تاریخ کو لڑکپن کی حدود سے، جوانی کو چھوئے بغیر، براہ راست بڑھاپے میں داخل ہوئے، اسی طرح الجھن کی اس کیفیت کو، جو ان کی آنکھوں کے اُوپر ماتھے کی جھریوں، ناک کے دونوں طرف کی سلوٹوں اور ہونٹوں کے گوشوں کے تناؤ کے ساتھ چپکی رہتی تھی، تاریخ پیدائش بتانا بھی ناممکن تھا۔

دوسرا مکتبۂ تحقیق جس میں ظہیرالدین، بشیر قاری اور خلیفہ محمود جیسے بڑے بڑے نام شامل تھے، اس خیال کا حامل تھا کہ تایا جی کے چہرے پر ثبت پریشانی کے یہ آثار پیر بننے کے بعد کا واقعہ ہیں اور ان کی وجہ ہزاروں کا وہ نقصان ہے جو ان کے تئیں ان کے مریدوں نے انھیں پہنچایا تھا۔ اس نقصان کے بارے میں جاننے کے لیے ہمیں کچھ تفصیل میں جانا پڑے گا اور لالہ نثار اور ان کے ساتھیوں کی پیر سازی کی تکنیک کا جائزہ لینا ہوگا۔

جن دنوں تایا جی کے بزرگ بننے یا بنائے جانے کی مہم شروع ہوئی، لالہ نثار ضلع کونسل کے دفتر میں ملازم تھے اور طاہر کالج میں پڑھتا تھا۔ یہ دونوں اکثر اپنے دفتر کے ساتھیوں، ہم جماعتوں اور جاننے والوں کو تایا جی کی خدمت میں بھیجتے رہتے جو ان سے اپنے کسی مقصد کے لیے دعا کرنے کی درخواست کرتے اور پھر چند ہی دن بعد وہ فرضی مقصد پورا ہونے پر ہزار پانچ سو روپے کا نذرانہ لے کر حاضر ہوتے۔ تایا جی تکلفاً اور مروتاً رقم لینے سے انکار کرتے۔ اس شخص کے اصرار پر مریدوں میں سے کوئی وہ نذرانہ اچک لیتا اور بعد ازاں جس کی رقم ہوتی اس کو لوٹا دی جاتی، کیونکہ یہ سب ایک مکمل منصوبہ بندی کا حصہ ہوتا جس میں سب مرید شامل ہوتے۔

بعض اوقات چندہ جمع کر کے بھی پیسے اکٹھے کیے جاتے۔ اصل میں تو یہ ایک نفع نقصان سے پاک کھاتے جیسا معاملہ تھا جس میں اگر کبھی شیرینی وغیرہ کے لیے کچھ خرچ ہوتا بھی تو مریدوں ہی کی جیب سے، لیکن بعض بے حد قریبی ارادت مندوں کا کہنا تھا کہ تایا جی نے اس رقم کا سارا حساب لکھ رکھا تھا جو ان کے نذرانے کے طور پر آئی اور ان کے بالکے لے اڑے اور اسی نقصان کی بڑھتی ہوئی رقم نے، اس کی بازیابی کی فکر اور گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ اس امر کے کم ہوتے ہوئے امکانات نے تایا کے چہرے پر کچھ جھریوں کو مستقل کر دیا تھا۔

تایا جی کی پریشانی اور الجھن سے قطع نظر، یہ شرارتیں بڑی دلچسپ، متنوع اور بے ضرر ہوا کرتیں۔ کبھی تایا جی کے حلقۂ ارادت میں ان کی دکان پر تالے کنجیوں کے پاس بیٹھے بیٹھے کسی 'مرید' کے پیٹ میں شدید درد اُٹھتا۔ وہ تکلیف سے لوٹ پوٹ ہو جاتا، ساتھ ہی ساتھ چلانے لگتا:

''پیر جی معاف کر دو، بے ادبی کا خیال آ گیا تھا۔'' تایا جی کچھ پڑھ کے پھونک مارتے اور وہ دم کے دم میں بھلا چنگا ہو جاتا۔ تایا جی بھلے مانس تھے، کبھی اس خیال بے ادب کے بارے میں پوچھا نہ مزید سزا کا قصد کیا۔ کبھی ہمسائے کی دکان پر تایا جی کے لیے فون آ جاتا:

''میری بیوی کئی دن سے بیمار ہے۔ حالت بہت خراب ہے۔ بہت علاج کرایا مگر کوئی افاقہ نہیں۔ آپ کے بارے میں سنا ہے کہ فون پر بھی پھونک مار دیں تو شفا ہو جاتی ہے۔ مہربانی کریں۔''

تایا جی مہربانی کرتے اور کچھ دنوں بعد وہ شخص اپنی بیوی کی صحت کی خبر اور نذرانہ لے کر حاضر خدمت ہوتا۔ کسی دوسرے شہر سے لالہ نثار یا کسی دوسرے مرید کا کوئی بے تکلف مہمان آ جاتا تو اسے زیارت کے لیے لے آتے۔ وہ پہلے سے پڑھائے ہوئے سبق کے مطابق، تایا جی کو اپنے شہر کے کسی پہنچے ہوئے بزرگ کا سلام پہنچاتا۔ سلام وصول کرتے ہی تایا جی آنکھیں بند کر کے گردن جھکاتے اور مراقبے میں چلے جاتے۔ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد اسی حالت میں کہتے۔

''وعلیکم السلام! یہ تو بھئی بہت پہنچا ہوا مرد ہے۔ تمہارے شہر کے آس پاس کا کافی علاقہ ہے اس کے پاس۔ بھئی واہ، بڑے اونچے دربار کا تحفہ لائے۔''

اس کے بعد وہ کافی دیر یونہی بیٹھے جھومتے رہتے اور اس اُونچے دربار کی سیر سے لطف اندوز ہوتے رہتے جو خالصتاً ان کے کسی مرید کے ذہن کی پیداوار تھا۔ تایا جی مراقبے اور دعا

میں یہی حالت اختیار کیا کرتے۔ اکثر جب ان کا کوئی شرارتی چیلا چانٹا کسی معروف فلمی شخصیت کے مقام و مرتبے کے متعلق ان سے پوچھ لیتا، جن کے بارے میں تایا جی نے اپنی سادگی اور عدم دلچسپی کے باعث کبھی سنا بھی نہ ہوتا تو وہ فوراً آنکھیں بند کر کے دل کی آنکھیں کھول لیتے اور اپنے تئیں روحانی دنیا میں پہنچ جاتے۔ پھر وہاں سے اطلاع دیتے:

''بڑا صاحب حال ہے۔ بڑا زور ہے اس میں۔ جلالی شخصیت ہے۔'' یا ''بہت اثر والی بی بی ہے، فرقۂ ملامتیہ ہے لیکن بڑی شان والی۔''

کسی کے لیے دعا کرتے تو بھی ایسے ہی اپنے من میں ڈوب کر بظاہر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے۔ منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتے رہتے۔ بیچ بیچ میں کوئی فقرہ آواز کی قابل سماعت حدود میں بھی داخل ہونے دیتے۔

''میرے مولا! منزل آسان کر اس کی۔ اپنی راہ دکھا اور اس پر چلا۔''

یار لوگ اس میں بھی کھیل تماشے کے پہلو نکال لیتے۔ ایک دفعہ لالہ نثار وغیرہ ایک نئے آدمی کو لے کر بیعت کے لیے حاضر ہوئے تو ساتھ میں تبرک کی خاطر ایک قاب میں لڈو بھی لے کر آئے جن پر ریشمی کپڑا اڈھکا ہوا تھا۔ رسمی کارروائی کے لیے سب لوگ دوزانو ہو کر ایک دائرے کی صورت میں بیٹھ گئے اور لڈوؤں کی پلیٹ درمیان میں رکھ دی گئی۔ بیعت لینے کے بعد تایا جی اپنے نئے مرید کی دین و دنیا کی فلاح کے لیے دعا میں ڈوب گئے اور ان کے پرانے واقفِ کار مرید وقفے وقفے سے ریشمی کپڑے کے نیچے ہاتھ ڈال کر لڈو اُڑانے میں مصروف ہو گئے۔ تایا جی کی دعا ختم ہونے سے پہلے پہلے کپڑا پلیٹ کے پیٹ سے جا لگا۔

اب یہ بھی اتفاق ہے کہ جب تایا جی نے تبرک تقسیم کرنے کے لیے کپڑا اٹھایا تو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ حیرت کا اظہار اسی شخص نے کیا جو قبل از دعا تقسیم میں سب بڑا حصہ دار تھا...... یعنی لالہ نثار۔

''ارے پیر جی، یہ کیا؟ ایمان سے میں خود تلوا کے پورے دو کلو لڈو لایا تھا۔''

''کمال ہو گیا...... آخر یہ گئے کہاں؟''

''ویسے پیر جی، سچ کہوں تو مجھے سارا وقت یوں محسوس ہوتا رہا کہ یہاں ہمارے علاوہ بھی کوئی مخلوق موجود ہے، جو نظر نہیں آ رہی۔''

طاہر نے ایک اور نکتہ اُٹھایا۔

تایا جی کو اس مضحکہ خیز صورتِ حال میں اپنی بزرگی کا بھرم برقرار رکھنے کو اس سے اچھی پناہ کہاں ملتی۔ فوراً کہا:

''بس چھوڑ دو اس معاملے کو۔ ہمیں سب خبر ہے۔ دنیا میں ہر طرح کی مخلوق آباد ہے۔ جس کا حصہ تھا، اسے مل گیا۔''

''لیکن پیر جی ہمارا حصہ؟''

چنانچہ تایا جی کو اپنی جیب سے اپنے مریدوں کے لیے مٹھائی منگوانا پڑی۔

ان کبھی کبھار کے چھوٹے موٹے مالی دھچکوں کے علاوہ تایا جی کے مریدوں کی زیادہ تر شرارتیں بے ضرر ہوا کرتی تھیں۔ فقط دو حرکتیں ایسی تھیں جو ممکنہ طور پر نقصان دہ تھیں۔ بلکہ کچھ لوگ تو کہتے تھے کہ جو نقصان ممکن تھا، انھوں نے تایا جی کو پہنچا دیا تھا۔

ایک تو آسیب زدہ مکان میں رات گزارنے والا واقعہ تھا۔ عام طور پر محلے میں ایک آدھ یادگار ایسی لازمی ہوتی ہے۔ تایا جی کے محلے میں بھی ایک پرانا مکان ایسا تھا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ تقسیم کے وقت، ہندو اسے چھوڑ گئے تھے اور اپنا سارا خزانہ فرش میں دبا، اس پر کوئی جادو کا عمل کر گئے تھے۔ یہ بھی سنا کہ خزانہ کھود نکالنے کے چکر میں کچھ لوگ اس جادو کی بھینٹ چڑھ گئے اور پھر بعد میں ان کی روحیں اسی مکان میں مقید ہو کر رہ گئیں۔ چنانچہ وہ ساری علامات جو اس قسم کے مکانوں سے وابستہ ہوتی ہیں، اس مکان سے بھی

تھیں۔ اندھیری راتوں میں گھنگھروؤں کی آواز، سایوں کی چہل قدمی، چیخیں، قہقہے، موسیقی اور دن میں وہی خاموش، پُرہول، پرانا مکان۔

ایسے میں تایا جی کے مریدین کو وہی سوجھی جو منطقی اعتبار سے سوجھنی چاہیے تھی، یعنی اس گھر کو آسیب کی لعنت سے پاک کرنے کے لیے تایا جی کو اس میں شب بسری کی تجویز۔ ایسی تجاویز اس ڈھنگ سے پیش کی جاتیں کہ تایا جی کے پاس انھیں قبول کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ بچتا۔

چنانچہ سرِشام ہی اس گھر میں پکنک کا سا سماں برپا ہو گیا۔ ایک کمرے کو جھاڑ پونچھ کر اس میں صاف ستھرا بستر لگایا گیا۔ اپنے لیے مریدوں نے چٹائیاں بچھالیں۔ ان پر گدے ڈال دیے گئے۔ چائے بنانے کا سامان اور ساتھ بسکٹ وغیرہ بھی رکھ لیے گئے کہ رات کو عبادت اور ذکر کے دوران اگر بھوک پیاس لگے تو اس کا مناسب تدارک کیا جا سکے۔

رات کے آتے آتے سب مرید ایک ایک دو دو کر کے مختلف حیلوں بہانوں سے اپنے گھروں کو سدھار گئے۔ تایا جی نے وہ رات کیسے گزاری؟ سو گئے یا جاگتے رہے؟ وظیفے پڑھے یا ڈرتے کانپتے سحر کر دی؟ کسی آسیب سے ملاقات ہوئی یا نہیں؟ اس اسرار سے کبھی پردہ نہ اُٹھ سکا کیونکہ اپنی شرارت کا انجام جاننے کے تمام تر شوق کے باوجود کوئی مرید رات کو وہاں ٹھہرنے کی ہمت نہ کر سکا اور نہ ہی کبھی بعد میں تایا جی نے اس سلسلے میں پوچھے گئے کسی سوال کا واضح جواب دیا۔

اس واقعے پر محلے کے بزرگوں نے لڑکوں کو خوب ڈانٹا ڈپٹا اور ان نتائج سے ڈرایا جو حاصل نہیں ہو سکے تھے لیکن ان کا خیال تھا کہ اگلی شرارت زیادہ خطرناک تھی جو اتفاق سے آخری بھی ثابت ہوئی۔ محلے کے سمجھدار لوگ کہتے تھے کہ اسی حرکت نے بالآخر تایا جی کی جان لے لی۔ شاید وہ صحیح سمجھتے ہوں۔

اس شرارت کے پیچھے نسبتاً زیادہ جامع اور طویل منصوبہ بندی تھی۔

مریدوں نے اپنے پیر صاحب کی دوسری شادی کی ہوائی چلائی۔ گو وہ اپنی پہلی شادی ہی جانے کس طرح جھیل رہے تھے لیکن سیانوں کا کہنا ہے کہ ایک شادی کا دف مارنے کے لیے دوسری شادی سے بہتر تریاق میسر نہیں آ سکتا۔ شاید تایا جی اس قول سے متفق تھے کیونکہ وہ اپنی دوسری شادی کے پروگرام سے واضح طور پہ خوش اور مطمئن نظر آتے تھے، ہاں مصلحتاً اسے تائی جی سے چھپائے رکھنا ضروری سمجھتے تھے۔ چنانچہ ان کے مرتے دم تک تائی جی کو اس منصوبے کی خبر نہ ہو سکی اور شاید وہ خود بھی اس حقیقت سے بے خبر ہی دنیا سے رخصت ہوئے کہ ان کی دوسری شادی کا پروگرام ان کے مریدوں کی زبانی جمع خرچ سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔

ایک تو یوں بھی پہلی شادی کا تجربہ چاہے تلخ ہو یا خوبصورت، دوسری شادی کا خیال مرد کے لیے اپنی کشش کبھی نہیں کھو پاتا، دوسرے تایا جی سے شادی کی خواہشمند اس خیالی خاتون کی تصویر کشی بھی ایسی کی گئی تھی کہ کسی کے بھی پائے استقلال لڑکھڑا جائیں۔ بی بی جوان ہو، حسین ہو، پابند صوم وصلوٰۃ ہو، برسرِ روزگار ہو بلکہ برسرِ کاروبار ہو اور وہ بھی امریکا جیسے ملک میں۔ پھر شادی کے بعد تایا جی کو بھی وہیں بلا لینا چاہتی ہو۔ اس طرح کافروں کے ملک میں رہ کر ان کو تبلیغ کرنے کا جو موقع میسر آتا اور پھر ان کے کافرانہ طور طریقوں کا ذاتی مشاہدہ کرنے کا امکان، تاکہ درستگیٔ احوال کا کام بہتر انداز میں کیا جا سکے۔ اس خیال کا لطف تو کچھ اہلِ دل ہی سمجھ سکتے ہیں۔

ویسے بھی یہ معاملہ اپنے اختیار میں کہاں تھا......؟ لالہ نثار کے بیان کے مطابق بی بی کو خواب میں کئی دن تک مسلسل یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پیر صاحب سے رابطہ کریں جن سے ان کی شادی طے کر دی گئی ہے۔ رابطے کے لیے تایا جی کی دکان کے ساتھ والی آڈیو ویڈیو کی دکان کا فون نمبر بھی خواب ہی میں

بتایا گیا تھا۔ ناصر آڈیو ویڈیو اینڈ مووی میکر پر جب بھی تایا جی کے لیے کوئی فون آتا اور وہاں کا ملازم تالوں والی دکان میں آ کر اطلاع دیتا تو ان کا کوئی مرید ہی اسے سننے کے لیے جاتا کیونکہ زیادہ تر فون ان مریدوں کی ملی بھگت کا ہی نتیجہ ہوتے۔ پھر کسی فرضی مریض کو فون پر دم کروانا ہوتا یا کوئی فقرہ خاص تایا جی کے کانوں کے لیے گھڑا گیا ہوتا تو ان کو بھی زحمت دی جاتی، لیکن امریکا والی بی بی کی آواز کبھی تایا جی کے کانوں تک نہ پہنچ سکی۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ ہو سکتی ہے کہ یہ کردار ادا کرنے کے لیے لالہ نثار اور طاہر وغیرہ کو کوئی خاتون میسر ہی نہ آ سکی تھی۔ چنانچہ ان کے سارے پیغامات اور ان کے سارے خیالات لالہ نثار اور طاہر کے ذریعے ہی منتقل ہوتے۔ یعنی دراصل کہیں منتقل نہیں ہوتے تھے۔

تایا جی کا اس پیشکش کو قبول کرنے کے لیے دل و جان سے آمادہ ہو جانا اس لیے آسان ہو گیا کہ ذہین مریدوں نے اس کہانی میں غیبی اشارے کے پھول ٹانک دیے تھے۔ چنانچہ دو چار فون کالوں میں ہی یہ طے پا گیا کہ پہلے ٹیلی فون پر نکاح ہو گا۔ بعدازاں بی بی اپنی امریکی شہریت کے زور پر تایا جی کو وہیں اپنے پاس بلوا لیں گی اور یہ سارا معاملہ امریکا پہنچنے تک تائی جی سے خفیہ رکھا جائے گا۔ پھر وہاں جاتے ہی امریکی مالی امداد کے ذریعے تائی جی کی جملہ پریشانیوں کی جڑ کاٹ دی جائے گی۔ چنانچہ وہ بھی خوش اور تایا جی بھی خوش۔

ان فرضی ٹیلی فون کالوں کا سلسلہ تقریباً دو ماہ تک چلتا رہا۔ کبھی بی بی کا دیکھا ہوا کوئی خواب سنا کر تعبیر پوچھی جاتی، کبھی وہ دعا کے لیے درخواست گزار ہوتیں، کبھی کسی وظیفے کے لیے اجازت طلب کرتیں۔

آخر جب تایا جی کی آتشِ شوق زبانِ غیر سے شرحِ آرزو سن سن کر سلگتے سلگتے بھڑکنے کے قریب ہو گئی، نکاح کی مقرر کردہ تاریخ نزدیک آن لگی اور تایا جی نے اپنی واحد واسکٹ تائی جی سے چوری چھپے نذیر ڈرائی کلینر سے رعایتی نرخوں پر ڈرائی کلین کروالی تو وہ سانحہ پیش آ گیا جو لالہ نثار اور طاہر نے سوچ رکھا تھا۔

’امریکن بی بی ٹریفک کے ایک حادثے میں جاں بحق ہو گئیں۔‘ تایا جی کے ارمان بھرے دل پر کیا قیامت گزری ہو گی؟ اس کا اندازہ کرنا اتنا ہی مشکل ہے جتنا شرارت کرنے والوں کی سنگ دلی کا۔ ظالموں نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ اس فرضی موت پر تایا جی سے پھوڑی بھی بچھوائی۔ تالوں کی دکان پر تین دن تالا رہا۔ واقعہ اتنا بڑا تھا کہ فاتحہ خوانی اور دکان سے چھٹی کو تائی جی سے چھپانا بھی ضروری نہیں سمجھا گیا۔ ہاں، یہ خیر گزری کہ انھیں معلوم نہ ہو سکا کہ یہ کس کا انتقال پر ملال تھا؟

بچی بادشاہ کی دکان کے وسیع و عریض چبوترے پر جہاں فاتحہ خوانی کے لیے دری بچھائی گئی تھی، مہینہ دو مہینے بعد عین اسی جگہ تایا جی کے لیے بھی پھوڑی بچھائی گئی۔ ان کے مریدوں کا خیال تھا کہ دل کا دورہ تھا، لیکن محلے کے کئی سمجھدار لوگ تایا جی کی موت کا ذمے دار اس آخری شرارت کو گردانتے تھے۔ تایا جی کے مریدوں کو اپنی حرکت کی سنگینی کا احساس تھا یا نہیں، یہ کہنا تو مشکل ہے لیکن وہ اپنے سب کام چھوڑ کر پھوڑی پہ مسلسل موجود رہے۔

تایا جی کے اپنے تو کچھ ایسے خاص رشتے دار تھے نہیں۔ محلے کے لوگ ہی وقت نکال کر فاتحہ خوانی کے لیے آ جاتے اور بیٹھ کر اخبار دیکھتے رہتے یا تایا جی کے شاگردوں کو گھورتے رہتے۔ مرحوم کی سادگی، قناعت اور صبر کی تعریف ہوتی رہتی یا ان کے مریدوں کو زجر و توبیخ کہ جن کی شرارتوں اور منصوبہ سازیوں نے ایک بھلے آدمی کی زندگی خراب کر دی اور شاید آخرت بھی۔

اس وعظ و نصیحت اور ڈانٹ ڈپٹ کا رخ خصوصاً لالہ نثار اور طاہر کی طرف ہوتا اور وہ کمال لاتعلقی سے یہ ساری باتیں سنتے اور نظر انداز کرتے رہتے۔ فاتحہ خوانی کے آخری دن جب ساجد اپنے گونگے بیٹے کو لے کر پھوڑی پہ پہنچا تو لالہ نثار

کو بھی پسینہ آ گیا۔

ساجد ان کے دفتر کا ساتھی تھا، جسے تایا جی کے مرنے سے کچھ ہی دن پہلے وہ ان کے پاس لائے تھے۔ اس کے بیٹے کے لیے دعا کروانے جو پیدائشی گونگا تھا۔ ساجد نے اپنے بیٹے کے علاج کے لیے بہت سے اسپتالوں، شفا خانوں اور مزاروں کی خاک چھانی تھی۔ تبادلہ ہو کر یہاں آیا تو لالہ نثار تایا جی 'دربار' پر بھی لے آئے۔ خیال تھا کہ کچھ دنوں بعد چندے کی مٹھائی لے کر تایا جی کو یہ خوشخبری سنا دیں گے کہ لڑکا کچھ زبان ہلانے لگا ہے۔ جھوٹ کھلنے کا خطرہ یوں نہیں تھا کہ ساجد کی تایا جی سے دوسری ملاقات لالہ نثار خود ہی نہ ہونے دیتے اور اگر کبھی ایسا ہو بھی جاتا تو بات سنبھالنا کیا مشکل تھی۔ لیکن ہوا یہ کہ اللہ نے تایا جی ہی کو سنبھال لیا۔

ساجد اپنے بیٹے کو لیے حاضرین میں سے گزرتا ہوا لالہ نثار کے پاس ہی آ بیٹھا۔ فاتحہ پڑھی، اس واقعے پر اچنبھے اور افسوس کا اظہار کیا۔ اس کے بعد اس نے نسبتاً بلند آواز سے جو کچھ کہا اس نے لالہ نثار سمیت وہاں موجود تایا جی کے تمام مریدوں کو اپنی باقی ساری زندگی کے لیے ایک سوچ کے سپرد کر دیا۔

ساجد کچھ اونچی آواز میں، جو ایسے موقعوں پہ لوگوں کو مرحوم کی خوبیوں سے روشناس کروانے کے لیے اختیار کی جاتی ہے، کہا:

''اللہ کے ولی تھے جی، سچے ولی۔ میرے بیٹے میں پیدائشی نقص تھا۔ میں کہاں کہاں نہیں گیا اسے لے کر؟ کتنے ڈاکٹروں کو دکھایا، بڑے مزاروں، درباروں پر حاضری دی۔ بیٹے کو زبان ملی تو پیر جی کی دعا سے، سنا بیٹا کلمہ سنا۔'' اس نے بچے کو اشارہ کیا۔

بچے نے جھجکتے ہوئے لب کھولے اور اٹکتے اٹکتے سنایا:

''لا الہ الا اللہ محمد الرسول اللہ۔''

لوگوں کی کھسر پھسر، پہلو بدلنے کی سرسراہٹیں اور اخبار

شیطان کا ڈر

حضرت رابعہ بصریؒ سے کسی نے سوال کیا' آپ نے شادی نہیں کی کیا آپ کو شیطان سے ڈر نہیں لگتا؟

رابعہ بصریؒ نے فرمایا: مجھے رحمان ہی سے فرصت نہیں۔ جب رحمان ہی سے فرصت نہیں تو شیطان کا خیال ہی نہیں آتا۔

توقعات

توقعات کی گٹھڑی مضبوطی سے باندھ کر رکھا کریں اور لوگوں سے امیدیں وابستہ نہ کیا کریں۔ اس لیے کہ ہمارے اردگرد اولادِ آدم کا مجمع لگا رہتا ہے۔ ان میں مخلص اور خالص لوگ کم ہوتے ہیں۔ اکثر یہ خود غرض، مطلب پرست اور وقتی پرندوں کی ہوتی ہے جو دانا چگ کر اڑ جاتے ہیں تاکہ بعد ازاں دل شکنی اور مایوسی نہ ہو۔

غصے پر قابو

اپنے غصے پر قابو رکھیں' صبر و تحمل سے کام لیں' انتقام سے پرہیز کریں اور معاف کر دینے کا رویہ اپنائیں۔ دوسروں کا برا نہ چاہیں۔ اپنے اندر ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کریں اور گمراہی سے بچیں۔

سات کا ہندسہ

سات کے ہندسے میں یقیناً کوئی خاص خوبیاں ہیں 7 زمینیں، 7 آسمان، ہفتے میں سات دن، قرآن میں 7 منازل، دنیا کے 7 براعظم، قوس قزح کے سات رنگ' طواف کعبہ' صفا و مروہ میں 7 چکر، حج میں شیطانوں کو 7 کنکریاں، سورۃ فاتحہ میں 7 آیات۔

پلٹنے کی آوازیں سب موقوف تھیں۔ ماحول پر ایک سوگوار خاموشی چھا گئی اور تایا جی کے مریدوں کے لب سل گئے۔

مس ایسٹر منیر

وطن عزیز میں ایک پھل ہر گھر کا ہر دلعزیز ہے جو بچوں بڑوں میں یکساں پسندیدگی کی سند رکھتا ہے۔ فروٹ چاٹ ہو یا خالی، اس پر لیموں اور مسالا چھڑک کر کھایا جاتا ہے۔ آپ جانتے ہیں ہم کس پھل کی بات کر رہے؟ جی ہاں! وہی امرود جسے بعض شرارتی بچے کبھی کبھی باغوں سے کچا توڑ کر کھانے میں بھی بے تحاشا خوشی محسوس کرتے ہیں۔

امرود ایک اہم سدا بہار پودا ہے۔ اس کی کاشت بہت پرانے وقتوں سے گرم مرطوب اور معتدل آب و ہوا والے علاقوں میں ہو رہی ہے۔ سب سے پہلے یہ جنوبی امریکہ میں پیرو کے درمیان پایا گیا تھا۔ وہاں سے یہ دنیا کے مختلف ممالک میں پھیلا۔ تقریباً ہر قسم کی زمین اور آب و ہوا میں اُگنے کی صلاحیت کی وجہ سے امرود نے ایک اہم تجارتی پھل کی حیثیت حاصل کر لی ہے۔

امرود کے چٹخارے

پاکستان میں یہ پھل تقریباً تمام شہروں میں اس وقت 7.45 ہزار ایکڑ رقبہ پر اُگایا جا رہا ہے اور اس کی مجموعی سالانہ پیداوار 3,340 ہزار ٹن ہے۔ پنجاب میں اس کی کاشت زیادہ تر شیخوپورہ، قصور، لاہور، شرق پور، سانگلہ ہل، گوجرانوالہ، ملتان، سرگودھا اور فیصل آباد کے اضلاع میں ہوتی ہے۔ جبکہ خیبر پختونخواہ میں کوہاٹ، ہری پور اور جنوں اس کی کاشت کے اہم علاقے ہیں۔ سندھ میں لاڑکانہ اور حیدر آباد ڈویژن میں یہ بکثرت کاشت کیا جاتا ہے۔ امرود کے زیر کاشت رقبہ میں بتدریج توسیع ہو رہی ہے۔

امرود کی اوسط قومی پیداوار اس وقت 4.7 ٹن فی ہیکٹر ہے جو بہت کم ہے۔ اس کی درج ذیل وجوہات ہیں:

☆ گرمی کی فصل پر پھل کی مکھی کا حملہ
☆ اچھی نسل کے قلمی پودوں والے باغات کا فقدان
☆ بیج سے اُگائے ہوئے پودوں کے باغات
☆ باغات کا نامناسب دیکھ بھال

سدا بہار پھل کی مزید دار اور لذت دار معلومات

غذائی اہمیت

غذائی اعتبار سے یہ پھل نہایت اہمیت کا حامل ہے۔ اس پھل کو حیاتین ''ج'' کا بادشاہ اور سستا ماخذ تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس میں حیاتین ''ج'' 100 گرام پھل میں 91 ملی گرام سے لے کر 280 ملی گرام تک موجود ہوتی ہے۔ جب کہ ترشاوہ پھلوں میں حیاتین ''ج'' کی مقدار صرف 30 سے 60 ملی گرام ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ امرود میں اعلیٰ قسم کی پیکٹن بھی خاصی مقدار میں موجود ہوتی ہے جو عمدہ کوالٹی کی جیلی بنانے کے کام آتی ہے۔

آب وہوا

امرود کے لیے گرم مرطوب و نیم گرم مرطوب معتدل آب وہوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا درخت بہت سخت جان ہوتا اور ٹھنڈے علاقوں میں بھی اُگ جاتا ہے مگر نیم گرم مرطوب آب وہوا میں خوب پرورش پاتا ہے۔ چھوٹی عمر کے پودوں کے لیے زیادہ سردی نقصان دہ ہے۔ اس لیے تین سے چار سال کی عمر تک کے پودوں کو سردی سے بچانے کے لیے ڈھانپ دینا چاہیے۔ ہوا روکنے والی باڑیں پودوں کو گرم لو اور سرد ہواؤں کو روکنے میں کافی مدد دیتی ہیں۔ زیادہ بارش پھل کی خاصیت کو نقصان پہنچاتی ہے۔ جس سے پھل پھٹنا شروع ہو جاتا ہے۔

زمین کیسی ہو؟

امرود کا پودا ہر قسم کی زمین میں اُگایا جا سکتا ہے۔ اس کا درخت بھاری زمین سے لے کر ہلکی ریتلی زمین تک اُگایا جاتا ہے۔ سیم اور تھور زدہ زمینوں میں بھی کامیاب رہتا ہے مگر دوسرے پھلدار درختوں کی طرح اس کے لیے بھی نرم اور زرخیز زمین بہت موزوں ہے۔

پودے لگانا

امرود کے پودے لگانے کا بہترین موسم اگست ستمبر ہے۔ فروری مارچ میں لگائے گئے پودوں کا جون کی گرمی میں سڑ جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ پودے لگانے کے فوراً بعد پانی ضرور دینا چاہیے۔ ہر پودے کا درمیانی فاصلہ 6 میٹر رکھنا نہایت ہی موزوں اور ضروری ہے۔

آب پاشی

آبپاشی کا انحصار علاقہ کی آب وہوا اور زمین کی خاصیت پر ہے۔ چھوٹے پودوں کو سارا سال تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پانی لگاتے رہنا چاہیے۔ جوان پودوں کو پھل لگنے پر زیادہ پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب پودوں پر پھول آ رہے ہوں، اس وقت پانی روک دینا چاہیے۔ جب تک پھل مکمل طور پر سیٹ نہ ہو جائے۔ سردیوں میں ہر ہفتہ پودوں کو پانی دینا زیادہ بہتر ہے۔ اس طرح پھل کی کوالٹی بہتر ہوتی اور پھل کورے کے مضر اثرات سے بھی بچ جاتا ہے۔ ایک اندازے کے مطابق امرود کو سال میں 12 سے 15 مرتبہ آبپاشی ضروری ہے۔

کھاد دینا

امرود کے پودے سال میں دو مرتبہ پھل دیتے ہیں۔ اس لیے پودوں کی صحت برقرار رکھنے کے لیے کافی مقدار میں نائیٹروجن کھاد کی ضرورت ہوتی ہے۔ گوبر کی کھاد سب سے اچھی تصور کی جاتی ہے۔ اس لیے گوبر کی کھاد 30 سے 40 کلو گرام فی پودا کے حساب سے دینی چاہیے۔ عام قاعدے کے مطابق گوبر کی کھاد دسمبر جنوری میں دینی چاہیے۔ کھاد دینے سے پیشتر پودے کے پھیلاؤ کے مطابق گوڈی کر کے پودے کے چاروں طرف اچھی طرح کھاد بکھیر کر آبپاشی کر دینی چاہیے۔ کیمیائی کھادوں میں ایمونیم سلفیٹ اڑھائی سے تین کلو فی پودا یا یوریا سوا ایک تا ڈیڑھ کلو، سپر فاسفیٹ اڑھائی تا تین کلو اور پوٹاش کے لیے ایک کلو پوٹاشیم سلفیٹ فی پودا پھول آنے سے پیشتر ڈالیں۔ یہ مقدار جوان پودوں کے لیے ہے۔

افزائش نسل

عام طور پر امرود کی افزائش بیج سے کی جاتی ہے مگر اس طرح اُگائے ہوئے پودے اصل درخت سے مشابہ نہیں ہوتے اور ان کے پھل کے طبعی اور کیمیائی خواص اپنے موروثی پودوں سے مشابہ نہیں ہوتے اس لیے اس پودے کی نباتاتی افزائش بذریعہ قلم یا گٹی کی جاتی ہے۔

بذریعہ قلم امرود کی افزائش نسل اگرچہ مشکل ہے۔ تاہم تحقیق نے یہ ظاہر کیا ہے کہ 80 فیصد نمی کے اندر گرین ہاؤس میں اگر درجہ حرارت 25 ڈگری سنٹی گریڈ رکھا جائے تو 10 سے 12 سنٹی میٹر لمبی، شاخ کے سرے والی قلمیں پتوں کے ساتھ تیار کر کے اگر 24 گھنٹے کے لیے تین پی پی پیکلو بیوٹرازول کے محلول میں قلموں کا نچلا سرا ڈبو کر ریت کے اندر لگائیں تو نوے فیصد قلمیں جڑیں نکال لیتی ہیں۔ تحقیق نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ اگر قلمیں موسم برسات میں لگائیں تو زیادہ جڑیں نکالتی ہیں۔ آٹھ ہفتوں کے بعد ان قلموں کو گرین ہاؤس میں ہی مومی تھیلوں میں منتقل کر دیا جاتا ہے۔ ان مومی تھیلوں میں مٹی، بھل اور اچھی گلی سڑی کھاد کی برابر مقدار کا آمیزہ بھرا جاتا ہے۔ تین ہفتوں کے بعد ان تھیلیوں کو شیڈ ہاؤس میں منتقل کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ہوائی داب یا گٹی اور پیوندکاری سے بھی مطلوبہ نسل کے صحیح پودے تیار کیے جا سکتے ہیں۔

شاخ تراشی

عام طور پر امرود کو شاخ تراشی کی ضرورت نہیں ہوتی لیکن چونکہ پھل نئی پھوٹ پر آتا ہے اس لیے تھوڑی سی سالانہ شاخ تراشی کر لینی چاہیے۔ چھوٹی عمر میں پودے کا ڈھانچہ یا ساخت صحیح کرنے کے لیے اور اسے مضبوط بنانے کے لیے اس کی شاخ تراشی ضروری ہے۔ بعض اوقات لمبی اور کمزور شاخوں پر پھل ہوتا ہے وہ بوجھ سے نیچے جھک جاتی ہیں۔ ایسی شاخوں کے سرے کاٹ دینے چاہئیں۔ اس کے علاوہ تنے کے نچلے حصے سے چھوٹی چھوٹی شاخیں پھوٹتی ہیں ان کو بھی کاٹتے رہنا چاہیے۔ فصل کی برداشت کے بعد سوکھی ہوئی، بیمار اور کمزور شاخوں کو بھی کاٹ دینا چاہیے۔ اچھی قسم کا پھل حاصل کرنے کے لیے پھل کی چھدرائی بھی ضروری ہے۔

کیڑوں اور بیماریوں کا تدارک

پھل کی مکھی

امرود کو گرمیوں کی فصل میں سے سب سے زیادہ نقصان پھل کی مکھی پہنچاتی ہے جو کہ پھل کے اندر اپنا ڈنک داخل کر کے انڈے دیتی ہے۔ جن سے چھوٹی چھوٹی سنڈیاں پیدا ہو کر گودے کو کھانا شروع کر دیتی ہیں اور پھل گل سڑ کر زمین پر گر پڑتا ہے۔ اس مکھی کی لمبائی تقریباً 5 ملی میٹر ہوتی ہے۔ اس کا رنگ کالا اور پیلا ہوتا ہے۔

تدارک

☆ گرے ہوئے تمام پھل اکٹھے کر کے زمین میں دبا دیں۔

☆ امرود کا پھل جب بڑے سائز کا ہو جائے تو میٹا سسٹاکس، ڈائی میکران یا ڈپٹریکس پانی میں ملا کر سپرے کریں۔

☆ سپرے فصل کی برداشت سے 20 دن پہلے بند کر دیا جانا چاہیے۔

☆ جنسی پھندوں کا استعمال پھل کی مکھی کو کنٹرول کرنے کے لیے بہت موزوں ہے۔

تنے کا گڑویں

یہ شاخوں میں سوراخ کر کے ٹہنیوں کے اندر چلے جاتے ہیں اور ٹہنیاں سوکھ جاتی ہیں۔

تدارک

☆ سوکھی ہوئی ٹہنیوں کو کاٹ دیں۔

☆ میٹاسٹاکس 5.2 ملی لیٹر فی لیٹر پانی میں ملا کر تین مرتبہ سپرے کریں۔

امرود کا سوکھنا

یہ بیماری گرمی اور کاشتی امور کی بے احتیاطی سے ہوتی ہے۔ جس سے پودا آہستہ آہستہ سوکھنا شروع ہو جاتا ہے۔

تدارک

☆ کاشتی امور کو بروقت سرانجام دیں۔

☆ ریڈ ڈل گولڈ پودے کی عمر کے مطابق سپرے کریں۔

کھادوں کا استعمال

امرود کے پودے سال میں دو مرتبہ پھل دیتے ہیں۔ اس لیے پودے کی صحت کو برقرار رکھنے کے لیے کافی نائیٹروجن کی ضرورت ہوتی ہے۔ گوبر کی کھاد سب سے اچھی تصور کی جاتی ہے۔ گوبر کی کھاد 30 سے 40 کلوگرام فی پودا کے حساب سے دینی چاہیے۔ عام قاعدے کے مطابق گوبر کی کھاد دسمبر اور جنوری کے مہینے میں دینی چاہیے۔ عام طور پر درجہ ذیل سفارشات کے مطابق کھاد کا استعمال کرنا چاہیے۔

اقسام

پاکستان میں اس وقت امرود کی جتنی بھی مختلف اقسام فروخت کے لیے بازار میں آتی ہیں ان میں ایک بھی خالص اور معیاری نہیں کیونکہ وہ زیادہ تر بیج سے لگائے گئے باغات کی پیداوار ہیں۔ یہاں قسموں کو جو نام بھی دیے گئے ہیں وہ یا گودے کو مدنظر رکھ کر دیے گئے یا اس علاقہ کے نام پر جہاں یہ پیدا ہوتا ہے۔ ان اقسام میں سب زیادہ مشہور ''سفیدہ'' ہے۔ اس کا پھل گول، چھلکا صاف اور ذائقہ کافی لذیذ اور میٹھا ہوتا ہے۔ ''چتی دار'' اس کے پھل پر چھوٹے چھوٹے سرخ نشان ہوتے ہیں اس کا ذائقہ بھی لذیذ اور میٹھا ہوتا ہے۔ ''حفضی'' بھی امرود کی ایک قسم ہے اس کا پھل گول اور گودا سرخ ہوتا ہے۔ یہ اتنی میٹھی نہیں مثلاً ''کریلا''۔ اس قسم میں پھل کی شکل ناشپاتی سے ملتی ہے۔ اس کا چھلکا کھردرا اور گودے کا رنگ سرخ یا سفید ہوتا ہے۔ امرود کی ایک قسم ''سیڈلیس'' ہے اس میں بیج نہیں ہوتے اس میں پیداوار تھوڑی اور پھل کی شکل بے قاعدہ ہوتی ہے۔ یہ ابھی تک تجارتی پیمانہ پر کاشت نہیں کیا جاتا۔

خیبر پختونخواہ میں امرود کی کاشت ہونے والی اقسام میں گولا اور صراحی شامل ہیں۔

پھل کا توڑنا اور پیداوار

امرود سال میں دو مرتبہ بار آور ہوتا ہے۔ ایک فصل موسم گرما جولائی اگست اور دوسری موسم سرما جنوری فروری میں حاصل ہوتی ہے۔ موسم گرما کی فصل کوالٹی کے لحاظ سے معیاری نہیں ہوتی۔ پکا ہوا پھل چمکدار سرخ یا سفید ہوتا ہے۔ پھل کو توڑنے کے بعد ٹوکریوں میں ڈال کر منڈیوں میں بھیجا جاتا ہے۔

جوان پودے کی اوسط پیداوار 60 سے 100 کلوگرام فی پودا ہے۔ اس کی پیداوار مختلف جگہوں پر مختلف ہوتی ہے۔ پکا ہوا پھل ہفتہ میں دو سے تین بار توڑا جاتا ہے کیونکہ اس کا پھل جلد خراب ہونے والا ہے اس لیے اسے فوراً منڈی بیچ دینا چاہیے۔

امرود کی مصنوعات

امرود کو پھل کے طور پر استعمال کرنے کے علاوہ اس سے بہت ساری چیزیں تیار کرنے مثلاً جیم، جیلی، جوس، نیکٹر، ڈبوں میں بند کرنے اور مٹھائی بنانے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔

ماہِ اگست کے لیے خصوصی تحاریر
اور تقسیم ہند سے متعلق سچی کہانیاں
ماہ جون کی ۲۰ تاریخ تک بھجوائی جاسکتی ہیں
تاکہ بروقت بہترین انتخاب کیا جاسکے۔

طارق محمود مرزا۔ سڈنی

سامان کی ٹرالی لے کر بینظیر ائیر پورٹ اسلام آباد کے بین الاقوامی ٹرمینل پر پہنچے ہی تھے کہ پورٹر نے آگے بڑھ کر اپنی خدمات پیش کر دیں۔

''صاحب مجھے خدمت کا موقع دیں۔ میرے ہوتے آپ کے سامان کی تلاشی ہوگی اور نہ زائد سامان کا کرایہ دینا پڑے گا۔''

معاشرے کا ناسور...

''اس خدمت کے عوض آپ کو کیا دینا ہوگا؟'' میں نے پوچھا۔

''تین ہزار دے دیں۔ اس میں کسٹم، ائیرلائن اور دوسرے کئی محکموں کا حصہ ہوتا ہے۔'' وہ سامان دیکھ کر بولا۔

''لیکن ہمارے سامان میں کوئی قابل اعتراض چیز ہے نہ ہی یہ مقررہ حد سے زیادہ ہے۔'' ہم نے اسے بتانا ضروری سمجھا۔

اس نے ایسی نظروں سے مجھے دیکھا جیسے اُستاد نادان طالب علم کو دیکھتے ہیں اور گویا ہوا، ''صاحب! کسٹم والوں سے مک مکاؤ نہ ہو تو وہ سارا سامان کھول کر بکھیر دیتے ہیں جسے اس ہجوم میں سمیٹنا اور دوبارہ پیک کرنا آسان نہیں ہوتا۔ اسی طرح چیک ان کے وقت تھوڑا بہت 'زائد سامان' نکل ہی آتا ہے۔ اس زائد سامان کا کرایہ آٹھ سو روپے کھولیا جاتا ہے۔ کبھی وہ آپ کے دستی سامان کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ میں ساتھ ہوں گا تو اس تمام جھنجٹ سے بچ جائیں گے۔'' اس نے پیشہ ورانہ مسکراہٹ سجائے جواب دیا۔

میں پچھلے تیس برس سے بیرونی سفر کر رہا ہوں۔ پورٹر نے

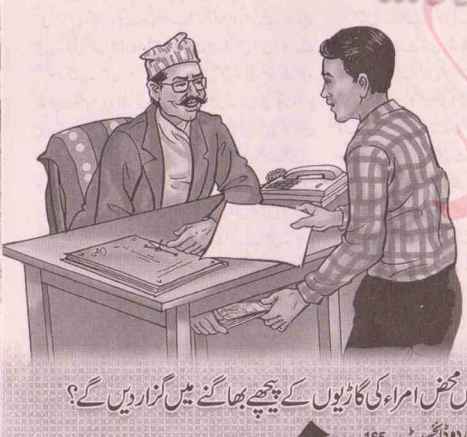

جونقشہ کھینچا تھا وہ بالکل درست تھا۔ بیرونِ ملک جانے والے ہر مسافر کوانھی حالات سے گزرنا پڑتا ہے۔ اُسے یا تو رشوت دینی پڑتی ہے یا پھر کسٹم، ائیر لائن اور ہوائی اڈّے پر موجود دوسرے عملے کے ہاتھوں ذلیل ہونا پڑتا ہے۔ پچھلے تیس برسوں میں جب سے میں سفر کررہا ہوں، کرپشن کی یہ صورتِ حال جوں کی توں قائم ہے۔ اس دوران جمہوریت، آمریت اور عسکری، ہر طرح کی حکومتیں بدلتی رہیں لیکن کرپشن کا یہ جن کسی کے قابو نہ آیا یا پھر دانستہ اسے کھلا چھوڑ اگیا تا کہ آنے جانے والے مسافروں کی جیبیں ہلکی ہوتی رہیں۔ جب میں یہ سطور تحریر کر رہا تھا، خبر آئی کہ گوادر میں ستر کروڑ روپے کی سرکاری زمینوں پر بااثر افراد نے کرپشن کے ذریعے قبضہ کر لیا ہے۔

یہ صرف دو مثالیں ہیں، ورنہ کرپشن کا یہ زہر پاکستان کے طول وعرض تک پھیلا ہوا ہے جس نے پورے معاشرے کی جڑیں، تنا اور برگ و بار سب زہر آلود اور کھوکھلے کر دیے ہیں۔ کوئی محکمہ، ادارہ، دفتر، جماعت اور انجمن اس زہر سے محفوظ نہیں۔ اس زہر آلود ماحول میں حق، سچ، میرٹ اور قابلیت نیم مردہ اور نڈھال پڑے ہیں۔ ان کی جگہ اقربا پروری، نا انصافی، رشوت، سفارش اور نااہلی راج کر رہی ہے۔ قابلیت، اہلیت اور صلاحیت کی یہاں کوئی وقعت نہیں۔ ہر جگہ نالائق، نااہل اور سفارشی لوگوں کا قبضہ ہے۔ یہ نااہل اور سفارشی اپنے جیسے لوگوں کو آگے لا کر اور اہل لوگوں کو پیچھے دھکیل کر اس کرپٹ سسٹم کو مزید مضبوط کر رہے ہیں۔ یوں انتہائی منظّم انداز میں پورے معاشرے کو کرپشن زدہ معاشرہ بنایا جا رہا ہے۔

کرپشن آج وطنِ عزیز کا سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ باقی سارے مسائل اس کے بطن سے جنم لیتے ہیں۔ اگر کسی اہم کرسی پر کسی بے ایمان شخص کو بٹھا دیا جائے تو اس سے ملک اور عوام کی بہتری کی کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے؟ ایسا شخص حق، ایمانداری، سچائی، محنت اور حب الوطنی کو کیسے اور کیوں پنپنے دے گا؟ ببول کے پودے پر پھل اور پھول تو آنے سے رہے۔ ایسا شخص اہل اور حق دار لوگوں کو آگے آنے سے حتی الوسع روکے گا۔ اس میں وہ جرأت اور بہادری بھی نہیں ہو گی جو زندہ قوموں کی نشانی ہوتی ہے۔

جس طرح ایک مردہ جانور پورے تالاب کو ناپاک اور گندا کر دیتا ہے اس طرح ان کرپٹ لوگوں نے پورے معاشرے کو آلودہ کر دیا ہے۔ اس کے اثرات آج ہمیں جا بجا نظر آتے ہیں۔ معاشرے سے خیر و برکت اُٹھ چکی۔ صبر، قناعت، برداشت، تحمل اور اخوت کا جذبہ ناپید ہو چکا۔ حق اور انصاف کے علمبردار اور برائی کو برائی سمجھنے والے ناپید ہو چکے یا ان کی پکار سننے والا کوئی نہیں۔ راشی گردن اکڑا کر دندناتے پھر رہے۔ وہ اپنے کرتوتوں پر شرمندہ ہونے کے بجائے اپنے کارناموں پر فخر کرتے ہیں۔

میں نے اپنے کانوں سے کئی لوگوں کو کہتے سنا کہ ہماری تنخواہ تو محدود ہے لیکن 'اللہ کا شکر ہے' اُوپر کی آمدنی کافی ہو جاتی ہے۔ ایسے لوگوں کو معاشرے، قانون اور خدا کا خوف بھی نہیں اور ان کا ضمیر بھی انھیں ملامت نہیں کرتا۔ یقیناً یہی وہ لوگ ہیں جن کے بارے کہا گیا ہے کہ ''ان کی آنکھوں پر پردہ اور دلوں پر مہر ثبت ہو چکی ہے'' (القرآن)۔

جب کسی معاشرے میں کرپشن اس حد تک گھر کر لے کہ بحیثیت مجموعی اسے بُرا نہ سمجھا جائے تو اس معاشرے کا زوال یقینی ہے۔ ایسے معاشرے سے اصول پسندی، اخلاقی جرأت اور قوت ایمانی بھی جاتی رہتی ہے۔ وہاں صبر، قناعت، ایمانداری، اخوت اور جذبۂ قربانی بھی باقی نہیں رہتے۔ صرف انحطاط، افراتفری، خود غرضی، لالچ، طمع اور ناانصافی رہ جاتی ہے۔

کیا ہمارا معاشرہ آج وہی تصویر پیش نہیں کر رہا؟ آج ہر طرف نفسا نفسی، راتوں رات امیر بننے کی اندھا دھند دوڑ، دولت اور طاقت حاصل کرنے کی بے مہار ریس اور دوسروں کو پیچھے دھکیل یا اُن کے حق پر ڈاکا ڈال کر آگے بڑھنے کا سلسلہ جاری وساری ہے۔ اس دوڑ میں بھائی بھائی کا گلا کاٹنے کے لیے تیار ہے۔ دوست، دوست کو لوٹنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔ اولاد دنیاوی آسائشوں کے لالچ میں والدین سے کنارہ کشی کے لیے تیار ہے۔ کوئی دوسرے کو خوش دیکھ نہیں سکتا۔ آج ہر آدمی ایک ہی مشن پر کاربند ہے کہ کس طرح جلد سے جلد دولت کے انبار اکٹھے کرے اور اس پر کھڑے ہو کر دوسروں کو نیچا دکھا سکے۔ کسی کو پروا نہیں کہ اُس نے حصولِ مقصد کے لیے کن اخلاقی اصولوں، ملکی قوانین، حقوق العباد، احکامِ الٰہی، سب کو پسِ پشت ڈال کر یہ آگ جمع کی ہے۔ کوئی یہ سوچنے کے لیے تیار نہیں کہ محض دولت پانے کے لیے انسان کتنی اہم چیزیں کھو دیتا ہے۔ کیا یہ اتنی اہم ہے کہ اس کے لیے انسان قیمتی رشتے، محبتیں، بھروسا، دوستی، قانون، مذہب اور اللہ کی خوشنودی سبھی کچھ داؤ پر لگا دے۔ یہاں تک کہ اپنی آخرت بھی۔

اس چند روزہ زندگی کے لیے دنیاوی دولت اتنی اہم کیسے ہو گئی؟ کیا ایسی دولت سے انسان سکون حاصل کر سکتا ہے؟ کیا ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے والے کا ضمیر ملامت نہیں کرتا؟ کیا اسے خدا یاد نہیں آتا۔ ایسا شخص اپنے خالق و مالک کا سامنا کیسے کر پائے گا؟ کیا یہ دولت اسے بچانے کے بجائے اس کے گلے کا پھندہ نہیں بن جائے گی؟

ہمارے معاشرے میں دولت کی اہمیت اتنی بڑھ چکی کہ لوگ اپنا تعارف دولت و جائیداد، گاڑی اور کوٹھی کے سائز سے کراتے ہیں۔ کسی اجنبی سے پہلی ملاقات ہو یا کسی پرانے جاننے والے سے، کچھ وقفے کے بعد ملنا ہو تو اگلے دو منٹ میں وہ اپنی کتابِ امارت کا ایک ایک صفحہ پڑھ کر سنا دیتے ہیں۔ وہ اپنی دولت کے مسلسل ذکر سے آپ کو متاثر کرنے میں یوں جُت جاتے ہیں جیسے شاعر اپنا کلام سنانے میں مگن ہو جاتا ہے۔ طرّہ یہ کہ شاعروں کی طرح داد کی بھی توقع کی جاتی ہے۔ ایسے میں وہ احباب جو اس دوڑ میں پیچھے رہ گئے، ان کے دل پر کیا گزرتی ہو گی؟ اس کا اندازہ لگانا چنداں مشکل نہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے لوگ بھی اس دوڑ میں شامل ہوتے جا رہے ہیں کیونکہ وہ اس معاشرے کا حصہ ہیں جہاں دولت ہی عزت کا معیار ہے۔

اگرچہ کرپشن کو لگام دینا اور معاشرے میں قانون کی علم برداری قائم کرنا حکومت کا کام ہے۔ اگر حکمران ایماندار ہوں اور وہ اس بیماری کا قلع قمع کرنا چاہیں تو یہ اتنا مشکل نہیں لیکن جس معاشرے کے حکمران کرپٹ ہوں اسے سدھارنا ناممکن ہے کیونکہ یہ بیماری اُوپر سے نیچے تک بلا رکاوٹ پھیل جاتی ہے۔ تاہم افراد کی انفرادی ذمہ داری بھی ہوتی ہے۔ زندگی کے کچھ اُصول وضوابط ہوتے ہیں۔

میں مغربی معاشرے میں رہتا ہوں جو مادّی دنیا ہے۔ یہاں بے شمار لوگ ایسے ہیں جن کا کوئی مذہب نہیں۔ وہ کسی خدا کو نہیں مانتے۔ دینی سزا اور جزا پر یقین نہیں رکھتے۔ اس کے باوجود معاشرے کی اکثریت دولت اکٹھی کرنے پر یقین نہیں رکھتی۔ ان کا بینک بیلنس ایسا بھاری بھرکم بھی نہیں ہوتا جیسا ہمارے یہاں۔ وہ صرف اتنا کماتے اور جمع کرتے ہیں جو ان کی زندگی میں کام آئے اور بس۔ ان کی بھی اولاد ہوتی ہے۔ ہر والدین کی طرح انھیں بھی یہ عزیز ہوتی ہے مگر وہ اسے مناسب تعلیم و تربیت دے کر اپنے فرض سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اکثر یہ سمجھتے ہیں کہ اولاد کے لیے مال اور ترکہ چھوڑنا انھیں خراب کرنے کے مترادف ہے۔ وہاں ہر شخص اپنی زندگی اپنی کوشش اور محنت سے بناتا ہے۔ اس کے لیے اسے سارے مواقع میسر ہوتے ہیں۔ پھر اس کا انحصار کسی دوسرے پر کیوں ہو؟ چاہے وہ والدین ہی کیوں نہ ہوں۔

میں یہاں ایسے کئی لوگوں کو جانتا ہوں جنھوں نے عین عروج کے وقت اپنا کاروبار اس لیے سمیٹ لیا کہ انھیں مزید

دولت کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ کم سے کم دولت کے ساتھ زیادہ سے زیادہ خوشیاں سمیٹنے لمبے دورے پر نکل جاتے ہیں۔ ایسے ہی ایک شخص نے مجھے بتایا کہ اس نے اپنا گھر بیچ دیا اور اب بیوی کے ساتھ دنیا کی سیر کے لیے جا رہا ہے۔ ایک بڑے عہدے سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لینے والے اس آدمی نے بتایا کہ وہ دوران سفر محنت مزدوری کر کے اپنا جیب خرچ بناتے رہیں گے اور فطرت کے نظاروں سے لطف اندوز ہوں گے۔

ذرا سوچیں! اس شخص کے پاس دولت کے انبار نہیں لیکن وہ کتنا ہلکا پھلکا ہو کر سکون کی نیند سوتا ہوگا۔ اس سے زیادہ زندگی میں اور کیا چاہیے؟ پاکستان میں کچھ لوگ اتنی دولت جمع کر چکے کہ اس کا شمار مشکل ہے لیکن وہ پھر بھی کرپشن سے باز نہیں آتے۔ مجھے سمجھ نہیں آتی کہ اتنی دولت کا وہ کیا کریں گے۔ اس چند روزہ زندگی میں تو اس کی قطعاً ضرورت نہیں، نہ ہی وہ اسے ساتھ لے کر جا سکتے ہیں تو وہ یہ آگ کیوں جمع کر رہے ہیں؟ یہ بات سمجھ سے باہر ہے۔

دوسری طرف عوام کا معیار بھی نرالا ہے۔ وہ امیر اور بااثر لوگوں کو جھک کر سلام کرتے، انھیں تو قیر دیتے، انھیں ووٹ دے کر اسمبلی میں پہنچاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں ایماندار، محنتی اور خوش اخلاق شخص کی وہ قدر نہیں جو صاحب ثروت کی ہے۔ معاشرے میں دولت کی نمائش اور اس کے پیچھے دوڑنے کا یہ سلسلہ آخر کہاں رُکے گا؟

ہم تو ایمان کی دولت سے بھی مالا مال ہیں پھر دنیاوی دولت کی اتنی ہوس کیوں؟ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کا قانون اور مقصدِ حیات واضح ہے۔ اللہ کے نبی ﷺ نے واضح فرما دیا تھا کہ اللہ کے نزدیک وہی برتر ہے جو تقویٰ میں برتر ہے۔ یہ معیار کب، کیوں اور کیسے بدل گیا؟ مہذب دنیا کے اصول کچھ اور ہیں۔ پوری دنیا میں پسندیدہ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کا اخلاق اچھا ہوتا ہے۔ وی آئی پی وہ ہوتا جس نے ملک اور قوم کے لیے کوئی کارنامہ سرانجام دیا ہو۔ مثلاً کسی

☆ بہترین زاد راہ تقویٰ ہے۔ (القرآن)

☆ فیاض خدا کا دوست ہے۔ (نبی کریم ﷺ)

☆ عبادت ایک پیشہ ہے، دکان اس کی خلوت ہے۔ راس المال اس کا تقویٰ ہے اور نفع اس کی جنت ہے۔ (حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ)

☆ جس نے کسی کے آگے ہاتھ پھیلایا، وہ گویا مر ہی گیا لیکن اس سے پہلے وہ مراجس کی زبان سے نہیں نکلا۔ (عبدالرحیم خانخاں)

☆ مجھے نیک خو شخص کے ساتھ دوستی کرنا پسند ہے اگرچہ وہ بدکار ہو، نہ کہ بدخو کے ساتھ جو فصیح و بلیغ ہو۔ (حضرت جنید بغدادی)

☆ میں ہی آگ ہوں، میں ہی کوڑا کرکٹ ہوں اگر میری آگ میرے کوڑے کو جلا کر جہنم کر دے تو میں اچھی زندگی پاؤں گا۔ (خلیل جبران)

تقریب میں قومی سطح کا کوئی کھلاڑی بھی ہو اور وہاں وزیر اعظم بھی موجود ہو تو مہمان خصوصی وزیر اعظم نہیں، کھلاڑی ہوتا ہے۔ کیا ہم نے اپنے اصل ہیرو کو یاد رکھا؟ سیاست دانوں کی گاڑی کی بتیوں کے پیچھے دوڑتے ہوئے عمر گزار دی۔ ہمیں اپنی ترجیحات کا از سرِ نو جائزہ لینے کی ضرورت ہے۔ اگر ہم سادگی اختیار کر لیں اور اپنے جیسے سادہ لوگوں کو ترجیح دیں تو یقین کریں اس سے نہ صرف معاشرے بلکہ ہماری زندگیوں میں بھی آسانیاں ہی آسانیاں ہوں گی۔ اللہ ہم سب کو آسانیاں دے اور آسانیاں بانٹنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ ◆◆◆

گدھم جی پدھم جی کی خدمت میں

محمد خالد اختر

امریکی ناول نگار سال بیلو کے ہاتھوں ہاتھ ملنے والے تازہ ناول ہرزوگ پڑھتے ہوئے مجھے یہ خیال گزرا کہ اسی طرح اس جدید میکانکی دنیا کے ستائے ہوئے ہم سب بے کس انسان اپنے ذہن میں ایسے خطوط لکھتے رہتے ہیں جو کاغذ پر منتقل نہیں ہو پاتے۔ یہ خطوط ہم بڑی محنت سے، کھولتے ہوئے غصے یا اعصابی دباؤ کے تحت، اپنے اذیت دہندوں کو لکھتے ہیں مگر ہم میں سے چند ایک انھیں حیطۂ تحریر میں لے آتے اور مقامی اخباروں کے ایڈیٹروں کے نام پوسٹ کرنے کا بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کے پاس یقیناً بے انداز فراغت ہوتی ہوگی اور میں ان پر رشک کرتا ہوں۔

ذیل میں چند ایک ایسے خط ہیں جو میں نے مختلف اشخاص اور اداروں کو پچھلے پندرہ دن کے دوران لکھے۔ غالباً آپ نے بھی بعینہٖ اس مطلب کے خط ان اشخاص اور اداروں کو لکھے ہوں گے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے انھیں تحریر میں نہ لا کر بڑی

بحالتِ مجبوری میں لکھے گئے خطوط کی داستانِ عجب جو کبھی چٹکیاں بھرتے تو کبھی گدگدیاں کرتے ہیں

دانشمندی کا ثبوت دیا ہے (چند ایک زود رنج مکتوب الیہ ایسے بھی ہیں جواز الہ حیثیت عرفی کا دعویٰ کرنے میں دیر نہیں کرتے)۔

☆☆☆

ڈیئر لیڈر

السلام علیکم۔ پرسوں کے اخبار میں پڑھا تھا کہ آپ کراچی میں ہیں اور آپ نے گولیمار میں ایک جم غفیر کو خطاب فرمایا۔ کل کے اخبار میں یہ خبر تھی کہ آپ نے ڈھاکے میں ایک بڑے جلوس کی قیادت کی۔ آج کے اخبار میں راولپنڈی میں آپ کی پریس کانفرنس کا تذکرہ ہے۔ حیران ہوں کہ آپ ایک جگہ کچھ دن ٹک کر کیوں نہیں بیٹھ سکتے اور آپ کے خیالات ایک ڈگر پر کیوں کر قائم نہیں رہ سکتے؟ آخر ہوائی جہاز کا کرایہ کون ادا کرتا ہے؟ اگر آپ خود کر رہے ہیں تو یہ سراسر زیادتی ہے۔ اسلام میں بے جا اصراف کی مذمت فرمائی ہے۔ خدارا اپنے بیوی بچوں پر رحم کھائیے۔

اگر گدھم جی پدم جی آپ کے یہ کرایے اپنی جیب خاص سے دے رہے ہیں تو اس کی کوئی خاص وجہ ہوگی۔ میں نے گدھم جی پدم جی سے چند ماہ ہوئے یہ گزارش کی تھی کہ چار سو روپے جلد از جلد مرحمتِ کریں کیونکہ درزی نے وکٹوریہ روڈ کو میرے لیے ممنوعہ علاقہ بنا رکھا ہے۔ ادھر سے تا حال کوئی جواب نہیں آیا حالانکہ پوسٹ مین کو میرے گھر کا پتا پوری طرح معلوم ہے اور دوسرے حضرات کے بل موصول ہو رہے ہیں۔ آخر آپ ہی کی ذات سے ان کی اس قدر شیفتگی کیوں؟ یہ خبر بھی اُڑی کہ اب کی بار آپ پچپن آدمیوں کا وفد لے کر کراچی میں وارد ہوئے، تو واہ واہ ہوٹل میں ایک پورا فلور آپ کے لیے مخصوص تھا اور آپ کے مصاحبین کا طعام و قیام کا بل پچپن ہزار کے لگ بھگ بنا شنید ہے کہ گدھم جی پدم جی کے منیم نے چپکے سے یہ بل چکا دیا۔

بندہ پرور! گستاخی نہ ہو تو عرض کروں ابھی سے گدھم جی پدم جی آپ پر اتنے مہربان ہیں۔ جب آپ زمام حکومت اپنے مبارک ہاتھوں میں لے لیں گے تو وہ آپ کے لیے کچھ نہیں کریں گے۔ غالباً آغا خان کی طرح سونے اور جواہرات میں تولا جائے گا۔ خوب کھائیے پیجیے تا کہ اس موقع پر آپ کا وزن دو سو پاؤنڈ سے کچھ اوپر ہی ہو۔ ویسے یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آپ اکثر تقریروں میں کہتے ہیں کہ قوم کو فقیر اور بھک منگے بنا دیا گیا ہے۔ عالی جاہ! آپ کے دل میں شاید یہ خیال آتا ہو یا نہیں کہ آپ بھی اسی زمرے میں ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ دوسرے بھک منگے چمٹے بجا اور نعتیں گا کر مانگتے ہیں اور وہ بھی دو دو آنے اور چار چار آنے کر کے مگر آپ تیور دکھا کر وصول کرتے ہیں اور لاکھوں کے حساب سے۔ آپ ان فقراء میں سے ہوں گے جو جلالی کہلاتے ہیں ورنہ گدھم جی پدم جی اپنی گاڑھی کمائی یوں آپ کے ہاتھ میں نہ تھما دیتے۔

قوم کا درد آپ کو کھائے جاتا ہے مگر قبلہ! دل پر ہاتھ رکھ کر کہیے کہ گدھم جی پدم جی کے ان نذرانوں کا کتنا حصہ آپ نے عوام کے دکھوں کو دور کرنے کے لیے خرچ کیا۔ پی آئی اے اور واہ واہ ہوٹل والوں نے تو خوب ہاتھ رنگے لیکن میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ نے جو خیراتی گھر یا یتیم خانہ بنایا وہ کہاں واقع ہے۔ آپ حال ہی میں قراقر معدہ کے علاج کی خاطر تین دن کے لیے یورپ تشریف لے گئے تھے۔ اخباروں میں یہ خبر پڑھی اور تشویش کے مارے نیند نہ آئی۔ آپ کی زندگی ملک و قوم کے لیے بڑی قیمتی ہے۔ اس کو بچانے کے لیے جتنا بھی خرچ کیا جائے تھوڑا ہے لیکن مجھے بتایا گیا ہے کہ قراقر معدہ کا شمار مہلک بیماریوں میں نہیں ہوتا۔

اس بیماری میں مبتلا حضرات کے معدے میں عجیب و غریب سی آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور میں مانتا ہوں کہ مجلس میں اس سے دوسروں پر ہنسی کے دورے پڑ سکتے ہیں اور لیڈری کے وقار کو اس سے گزند پہنچنے کا احتمال ہے مگر دوسروں کو ہنسانے میں آخر کیا حرج ہے؟ اپنی گفتگو میں تو آپ اتنی سنجیدگی اور مدبری برتتے ہیں کہ ہنسنا تو کجا کسی کو رونا بھی نہیں آ سکتا۔

عالی جاہ! قوم کی خدمت اقتدار کی کرسی پر تخت نشیں ہوئے بغیر بھی ہو سکتی ہے۔ آپ چاہیں تو اس کے بغیر بھی حتی المقدور اپنے کم نصیب بھائیوں کے زخموں پر پھاہے رکھ سکتے ہیں۔ آپ نے بیچارے ڈاکٹر البرٹ سوئٹزر کا نام تو سنا ہو گا جسے چند مسخروں نے نوبل پرائز بھی دے ڈالا۔ اس نے افریقا کے ایک دُور دراز کے خطے میں کوڑھیوں کے لیے ایک ہسپتال بنایا (گدھم جی پدم جی سے ایک کوڑی لیے بغیر) اور ساری عمر ان کی خدمت میں صرف کر دی۔ آپ نے فادر دامیان کا نام بھی سنا ہوگا جو جنوبی سمندروں کے ایک جزیرے پر کوڑھیوں کی کالونی میں ان کی تیمارداری کرتا رہا اور بالآخر خود کوڑھ کا شکار ہوا۔

آپ کے نزدیک یہ بیوقوف لوگ ہوں گے۔ آپ تو یہ سمجھتے ہیں کہ کرسی نشینی کے بغیر کوئی لطف نہیں اور عوام کی خدمت محلات اور موٹر کاروں کی گدگدی نشستوں میں سے ہی کی جا سکتی ہے۔ ہاں قبلہ، عوام کے اندر جانے سے، ان میں سے ایک بننے سے ہمیشہ کترانا چاہیے۔ ان سے بو آتی ہے۔ عوام صرف اس لیے ہیں کہ انھیں چبوتروں پر سے خطاب کیا جائے اور انھیں یہ بتایا جائے کہ وہ روٹی کپڑوں کے نعروں جھانسوں میں نہ آئیں۔

اللہ کے فضل اور گدھم جی پدم جی کی برکت سے آپ اور آپ کے مصاحبین کے پاس روٹی کپڑا وافر ہے۔ عوام کو روٹی کپڑے کی ضرورت ہرگز نہیں۔ انھیں اسلام کے دامن کو ہرگز نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ دوسری بات ہے کہ آپ نے خود نہ کبھی نماز پڑھی ہے اور نہ کبھی روزہ رکھا ہے۔ آپ یہ بھی برداشت نہیں کر سکتے کہ آپ کا کوئی نوکر آپ کے ساتھ بیٹھ کر روٹی توڑے۔ مساوات کی یہ رٹ مستقل آپ کے ہونٹوں پر جاری ہے۔ واقعی مسلمان کا یہی شیوہ ہے کہ مساوات کے گن گائے۔ یہ گن گانا اس وقت بڑا اسہل اور خوشگوار ہو جاتا ہے جب آپ کے گھر میں ایک نہیں دو ائیر کنڈیشنر لگے ہوں اور آپ کا ننگ بھجنگ ہمسایہ سامنے جھونپڑی میں اپنے بھوکے بچوں کے ساتھ جھلس رہا ہو۔

یہی مساوات چاہتے ہیں نا آپ حضرت! آپ اس پر یقین رکھتے ہیں کہ ہر کسی کو اس کی محنت اور لیاقت کے مطابق معاوضہ ملنا چاہیے لیکن یہ بتایے کہ اگر گدھم جی پدم جی آپ کے کفیل نہ بنتے تو آپ کہاں ہوتے؟ فرض کیا آپ اس جھونپڑی میں پڑے جھلس رہے ہوتے تو کیا آپ جب بھی اس اسلامی مساوات کی رٹ یوں موقع بے موقع لگاتے؟ سچ سچ بتایئے کیا دوسروں کے غموں اور مصیبتوں سے کبھی آپ کے پتھریلے دل میں کوئی ہلچل ہوئی؟ کیا آپ نے اپنی ذات والا صفات کی بہبودی اور برتری کے سوا کسی اور چیز کے بارے میں بھی سوچا؟ سوشلزم سے آپ کو چڑ ہے۔ کیا آپ کو یہ خدشہ ہے کہ سوشلسٹ آپ کے ائیر کنڈیشنر، موٹر کاریں اور دل کشا کوٹھی چھین لیں گے؟ آخر یہ نعمتیں آپ نے اپنی اور زیادہ تر اپنے آباء اور گدھم جی پدم جی کی ہمت سے پیدا کی ہیں۔ آپ کو ان سے فیض یاب ہونے کا پورا پورا حق ہے۔ کوئی اس حق سے آپ کو کیوں محروم کرے گا۔ اور فطرت نے ازل سے آپ کو مزاج کی ایسی نزاکت عطا کی ہے کہ آپ گرمی کی شدت کی تاب نہیں لا سکتے اور نہ ہی چار قدم پیدل چل سکتے ہیں۔

عالی جاہ! میری سنیے۔ آپ اپنے ننگے ہمسایے سے کسی طرح بہتر اور برتر نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ آپ کی گڈی آسمان پر چڑھی ہے۔ آپ کی فصاحت کی دھومیں ہیں اور اخباروں میں آپ کی تقریریں چھپتی ہیں۔ جہاں آپ وارد ہوتے ہیں وہاں پھولوں کے گجروں اور نعروں سے آپ کا استقبال ہوتا ہے۔ اس کے مقابلے میں آپ کے ہمسایے کو کوئی جانتا بھی نہیں۔ مگر ایک بات ہے قبلہ! وہ اپنے خون پسینے کی کمائی سے اپنا اور اپنے بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے اور جو کچھ عوضانہ اسے ملتا ہے، اس کے بدلے میں وہ دنیا کو کچھ دیتا ہے۔ آپ تو کچھ بھی نہیں دیتے سوائے تقریروں اور اخباری بیانوں کے۔

ہل کا پھل آپ نے نہیں دیکھا۔ ہل چلانا تو کجا جوتے

آپ نہیں بنا سکتے۔ کپڑا آپ نہیں بن سکتے۔ آپ محض اپاہج اور پیرا سائٹ ہیں۔ امریکا کی مادی ترقی اور شوکت سے آپ غایت درجہ متاثر ہیں۔ کبھی آپ نے وہاں کے ایک مصنف ہنری ڈیوڈ تھوریو کا نام بھی سنا ہے؟ کاہے کو سنا ہوگا؟ کتابیں پڑھنے کا آپ کے پاس وقت کہاں؟ آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس تھوریو نے ایک کتاب ''والڈن'' لکھی ہے۔ والڈن کے جوہڑ اور آس پاس کے جنگل میں اسے جو ذہنی اور عملی مہمیں درپیش ہوئیں، وہ آپ کو خواب میں بھی نصیب نہ ہوں گی۔ اس شخص نے والڈن اور جنگل کے باسیوں، جانوروں، پرندوں کو اپنا دوست بنایا۔ تھوریو پنسلین بھی اچھی بنالیتا تھا اور کبھی کبھار شہر جا کر ان کو بیچ آتا۔ گدھم پدم جی کے چرچراتے نوٹوں کے بغیر بھی اس نے ایک بھرپور، مفید اور صحت مند زندگی گزاری۔ دنیا تھوریو کو ہمیشہ یاد رکھے گی اور یقین مانیے کہ مرنے کے بعد آپ کا نام بھی کوئی نہ لے گا۔

عزت مآب (ابھی تو آپ سیاست کے خاردار میدان میں ہیں۔ خدا کرے آپ جلدی عزت مآب بن جائیں اور آپ کی دیرینہ امنگیں رنگ لائیں)۔ یہ یاد رکھیے کہ اقتدار حاصل کرنے کے بعد اگر کھل کھیلنے کے ارادے ہوں تو گزارش ہے کہ ذرا احتیاط کے ساتھ پیش رووں کا حشر آپ دیکھ ہی چکے ہیں۔ طاقت کی شراب بڑی میٹھی ہوتی ہے لیکن تلچھٹ بے حد تلخ۔

خدا آپ کی حالت پر رحم کرے اور آپ کو صحیح فکر اور انسانیت عطا کرے۔

نمک خوار

☆☆☆

میں نے دوسرا خط ایک مشہور ادیب کو لکھا۔

محترمی ناول نگار صاحب

حال ہی میں آپ کا نیا ناول ''سرشاریٔ نظارۂ ابر'' کہیں سے ہاتھ لگ گیا۔ خود تو خریدنے کی ہمت نہ تھی۔ قیمت ناشر نے پندرہ روپے رکھی ہے۔ گرد پوش سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلے بھی آپ دو ناول تصنیف کر چکے۔ ایک ''طرزِ نگہ چشمِ فسوں ساز'' اور دوسرا ''تیری زلف کے سر ہونے تک''۔ یہ بھی پتا چلا کہ جذبات کی نقاشی میں جدید ادب میں آپ کا ہمسر کوئی اور نہیں۔

مولانا چراغ دین اور حکیم ناطق گیراج پوری نے اس ناول کے تعارف ناموں میں آپ کی صلاحیتوں کو دل کھول کر سراہا ہے۔ میں تو ان دونوں حضرات کو اچھے خاصے پڑھے لکھے اور ذی ہوش انسان سمجھتا تھا۔

آپ نے واقعی ناول نگاری کا حق ادا کر دیا۔ ایک ہزار سے کچھ اوپر صفحات یوں بے تکان لکھتے جانا کوئی خالہ جی کا گھر نہیں۔ کردار اُوپر تلے آپ نے بیسیوں نبٹائے ہیں مگر کمال یہ ہے کہ ہیرو بدایع الزماں سے لے کر بس کنڈیکٹر جیرے تک سب آپ ہی کی زبان میں باتیں کرتے ہیں۔ سب کی گفتگو علم وفکر اور فلسفہ سے معمور ہے۔ غالباً آپ بھی عام بول چال میں ایسی فصاحت و بلاغت کی بات چیت کرتے ہوں گے۔ ویسے آپ کی رفیقہ حیات آپ کو چھوڑ کر سسرال تو نہیں چلی گئیں؟

جذبات کی نقاشی اور فطرت کے مناظر کی مصوری میں آپ نے جو جوہر دکھائے ہیں وہ کچھ آپ ہی کا حصہ ہیں۔ مثلاً ہیرو بدایع الزماں کا اپنی محبوبہ شفتو بی بی کے ڈوب مرنے کی خبر سنتے ہی خود بھی چھلانگ لگانے کے لیے دریا کے پل کی طرف بھاگنا اعلیٰ درجے کی جذبات کشی ہے۔ آمد شب کو آپ نے کس خوبی سے بیان کیا ہے:

''سورج دیوتا لال بھبھوکے اپنے سنگھاسن پر سے اُتر کر پچھّم میں آرام کرنے چلے گئے اور رات کی دیوی اپنی سیاہ معنی خیز زلفیں بکھیرے غمِ فراق میں آنسو بہاتی چاروں اور سے دبے پاؤں چلتی آئی'' ...... پھر آپ نے اپنے ناول کو عالم گیر بنا دیا ہے۔

وہ اس طرح کہ اس کا آغاز غالباً چندر گپت موریا کے عہد سے ہوتا ہے اور خاتمہ صدر ایوب کے زوال پر۔ ناول کے پہلے حصے میں گھوڑوں اور رتھوں کے سوا کسی اور سواری کا ذکر نہیں۔ آخری حصوں میں جا بجا موٹر کاریں...... اور وہ بھی ہیوک اور مرسڈیز...... دوڑتی نظر آتی ہیں۔ ناول کا انجام بھی آپ نے خوب سوچا ہے۔ بدیع الزماں اور بختو بی بی جو دوسری ہیروئن ہے، گلبرگ کی کوٹھی میں بیٹھے ٹیلی ویژن پر خود اپنی شادی کی فلم سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔

محترم ناولسٹ! آپ کیسا ذہن رسا رکھتے ہیں۔

اب آئیے ذرا آپ سے کچھ باتیں بانداز دگر بھی کر لیں۔

محترم! یقین مانیے آپ کا یہ ناول نہایت طویل جھک بازی ہے۔ غالباً اس کو تحریر کرتے وقت آپ ہوش میں نہیں تھے۔ خود کلامی آپ کو کرنا تھی تو کمرا بند کر لیتے اور مزے سے پہروں اول فول بکتے۔ سڑک پر خود کلامی کرنا بھی قانونی گرفت کی زد میں نہیں آتا۔ یہ کیا ضرور تھا کہ آپ اپنے بودے، بے ربط خیالات کو اس بے ہنگم انداز میں حیطہ تحریر میں لے آئے۔

بُرا نہ مانیے۔ آپ کے سخت کودن اور بور ہونے میں قطعی کوئی شبہ نہیں۔ آپ اپنے آپ کو چاہے کچھ سمجھیں، دراصل آپ کے ہوا خواہوں اور کاسہ لیسوں نے آپ کا دماغ بگاڑ دیا ہے۔ آپ کے ہر ناول کی اشاعت پر بہترین ہوٹلوں میں افتتاحی تقریبات ہوئیں۔ ہوٹل کا بل کچھ آپ نے پلے سے ادا کیا، کچھ کسی حکومتی ادارے نے دیا۔ وہاں کسی نے آپ کو دوستوسکی کا ہم پایہ بتایا، کسی نے کہا کہ آپ والیٹر کے سامنے خم ٹھونک کر آئے ہیں اور والیٹر کو چھپنے کے لیے جگہ نہیں ملتی۔ سنا ہے، اب آپ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے اور سمجھ بیٹھے ہیں کہ رتن ناتھ سرشار اور پریم چند کی گدی کے آپ بلاشرکت غیرے مالک ہیں۔ اپنی تحریر کے اعجاز اور سخن سنجی پر پہروں سر دھنتے ہیں۔ عام تحریروں میں ہر دوسرے فقرے میں ''میں'' استعمال کرنا آپ کا شیوا بن چکا۔

مغربی ادیبوں کو آپ نہیں پڑھتے۔ اتنی انگریزی آپ کو نہیں آتی اور پڑھنے سے حاصل بھی کیا جب خدا نے آپ کے ذہن کو مالا مال کر رکھا ہے۔ قومی خودداری کا تقاضا بھی یہی ہے کہ آدمی اپنے دل و دماغ کو باہر کے ادیبوں کی تحریروں سے ملوث نہ ہونے دے اور اپنی ادبی روایات کو حرف آخر سمجھے۔ محترم! اگر کبھی آپ ان کے عام ادیبوں کو بھی پڑھ کر دیکھیں جو وہاں کسی شمار و قطار میں نہیں تو آپ پر یہ عقدہ کھلے گا کہ جو کچھ آپ لکھتے ہیں اور جسے اردو ادب کا سرمایہ گمان کرتے ہیں، محض پوچ ہے۔ تلخی معاف کیجیے سچ مچ یہ پوچ ہے۔

گراہم گرین، پریسٹلے اور ایولن واہ کو تو چھوڑیے، وہ اپنے اپنے طور پر ناول کے بادشاہ ہیں۔ آپ تو جیمز بانڈ والے آئن فلیمنگ کی گرد کو بھی نہیں پہنچ پاتے۔ اس کے پاس کم از کم ایک کہانی تو کہنے کے لیے ہوتی تھی اور آدمی اسے اخیر تک غیر اغلب واقعات کے باوجود پڑھتا چلا جاتا تھا۔ آپ کے ناول کے ساتویں صفحے سے ہی جمائیاں آنے لگتی ہیں اور طبیعت پیچ و تاب کھانے لگتی ہے۔ سنبھل کر رہیے کہ کہیں آپ کا کوئی پڑھنے والا آپ کی ٹھکائی نہ کر بیٹھے۔ ایک ہوشیار کتا رکھ لیجیے اور اس کے بغیر خصوصاً گھر سے باہر قدم نہ رکھیے۔ آج کل زمانہ بڑا غیر محفوظ ہے۔ ہم سب ستائے ہوئے ہیں اور سڑکوں پر خون آلود خیالات دل میں لیے گھومتے پھرتے ہیں۔

خدا آپ کی حالت پر رحم کرے اور آپ کو نیک ہدایت دے۔

خیر خواہ

☆☆☆

ڈیئر عظیم صحافی صاحب!

تسلیمات، صحافی کے لفظ پر جزبز نہ ہو جائیے گا۔ میں جانتا ہوں کہ آپ خود کو اعلیٰ پایہ کا ادیب و شاعر سمجھتے ہیں جس کے رشحات قلم اکیسویں صدی کے وسط میں لوگ حرزِ جاں بنائے ہوئے ہوں گے۔ اخباروں میں آپ کے ثقافتی کالم اور اہم سیاسی شخصیتوں سے دوبدو انٹرویو تو ہم ایک مدت تک پڑھتے

آئے تھے جو کبھی سمجھ میں آئے کبھی نہ آئے۔ ہمارا یہی خیال تھا کہ قسامِ ازل نے یہی کام آپ کے مقدر میں لکھ رکھا ہے۔ آپ نے بھی خوب جان ماری اور دھڑا دھڑ یہ کالم تحریر کیے۔ حتیٰ کہ آپ کی چندیا کے تمام بال اُڑ گئے اور آپ کو عینک کے نمبر تین چار بار بدلنے پڑے۔ (ویسے آپ عینک تو اس وقت سے لگاتے تھے جب آپ دودھ پیتے تھے)۔

اب آپ کچھ کچھ چشمہ لگا ہمپٹی ڈمپٹی لگتے ہیں۔ پھر چھ ستمبر کی جنگ آئی اور آپ نے اپنی پہلی نظم ''ہلواڑہ'' پر لکھی جو آپ کی پاٹ دار آواز میں ریڈیو پر سے نشر ہوئی۔ اس بحر اور ردیف سے آزاد نظم میں مناسب گھن گرج تھی اور الفاظ مشین گنوں اور گرنیڈوں کی طرح کانوں کے پردے پھاڑتے تھے۔ آپ آٹھ ستمبر کی صبح کو سو کر اٹھے تو آپ ایک عوامی شاعر کی حیثیت سے مشہور ہو چکے تھے۔ بازاروں میں آپ کا طوطی بولتا تھا۔ جنگ ختم ہو گئی۔ آپ کی غیرت اور جوش بھی سرد پڑ گئے۔ آپ پھر اپنے ثقافتی کالموں کی طرف پلٹ آئے۔ جب ان کالموں نے کسی کا کچھ نہ بگاڑا تو آپ نے انٹرویو نگاری کو اپنا شعار بنا لیا اور ٹمبکٹو کے قاضی القضاہ سے لے کر قطب شمالی کے سفید ریچھ تک کے انٹرویو لے ڈالے۔ ایک انٹرویو کے لیے آپ نے بذریعہ طیارہ اور ریل (فرسٹ کلاس) ہزاروں میل سفر کیا اور زرِ کثیر خرچ کیا۔ وہ زرِ کثیر کہاں سے آیا؟ ہم سب جانتے ہیں۔ زبان نہ کھلوائیے۔

پہلا مارشل لا لگنے پر آپ نے اسے سراہا اور صدر ایوب کی اصلاحات اور پانچ سالہ منصوبوں پر بڑے پُرمغز مقالے لکھے۔ تب صدر ایوب آپ کو ملک و قوم کے جملہ امراض کی واحد دوا لگتے تھے۔ ایک مقالے میں آپ نے لکھا کہ پاکستان میں ویلفیئر اسٹیٹ قائم ہو چکی۔ آپ کا تجزیہ بالکل درست تھا۔ آپ اور آپ کے گھر والوں کے لیے بڑی ویلفیئر ہو گئی۔ آپ کو ایک چھاپے خانے کا لائسنس مل گیا اور اسے لینے کے لیے کوپن ہیگن تشریف لے گئے۔ خدا جانے اس چھاپے خانے کا کیا بنا۔ آپ کوپن ہیگن سے لوٹے تو ایک سیکرٹری آپ کے ہمراہ تھیں۔ بقول آپ کے سیکرٹری سے آپ کے تعلقات بھی داغِ معصیت سے آلودہ نہ ہوئے۔ آپ ایوب عہد کے ستون بن گئے۔

حکومت نے جب بھی ثقافتی وفد باہر بھیجا آپ اس میں کسی نہ کسی طرح جگہ پا لیتے۔ صدر ایوب کے خلاف جب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے تو آپ پہلے ہوا کا رُخ دیکھتے رہے۔ صدارتی نظام پر آپ کو اڑسٹھ کے آخر تک مکمل یقین رہا۔ جب آپ کو اس دورِ حکومت کا خاتمہ نزدیک نظر آیا تو آپ نے تسلیم کیا کہ آپ غلطی پر تھے اور پارلیمانی نظام ہی میں ملک و قوم کی نجات مضمر ہے۔ اس سے آپ قومی ہیرو بن گئے اور ہر کسی نے کہا کہ آپ سچے محبِ وطن تھے اور نڈر اور بےباک صحافی۔

معاف کیجیے عظیم صحافی صاحب! آپ مکمل طور پر تھالی کے بینگن ہیں۔ جو کچھ بھی آپ نے لکھا آپ نے صرف اس چیز کو مدنظر رکھا کہ آپ کی روٹی پر مکھن کس طرح لگا ہے۔ آپ کی بےباکی میں کوئی شبہ نہیں۔ نیا مارشل لا لگا تو آپ نے اس کے گُن گائے۔ آپ نے اپنا دو ماہی رسالہ جاری کیا اور کمیونسٹوں کے خوب لتے لے ڈالے۔ مسجد اقصیٰ جلی تو آپ نے اپنے فصیح و بلیغ اسلوب میں پُرزور مضمون لکھا اور عالمِ اسلام کی غیرت کو للکارا۔ آپ نے کہا کہ اب جہاد کا وقت آ پہنچا ہے لیکن جب میرے ایک دوست نے آپ کے جوش سے متاثر ہو کر آپ کی معیت میں جہاد پر چلنے کا ارادہ ظاہر کیا تو آپ چیں بجبیں اور کھسیانے سے ہو گئے۔ آپ نے کہا میرا ہتھیار قلم ہے، میں قلم سے جہاد کروں گا۔ ہے بھی درست، یہ اسی جہاد کی بدولت ہے کہ آپ اب لاکھوں میں کھیلتے ہیں۔ ایسی محب الوطنی خدا ہمیں بھی عطا کرے۔

☆☆☆

جنابِ ڈاکٹر صاحب!

چند روز ہوئے میں اپنے چھوٹے بچے کو دکھانے آپ کے نجی کلینک پر حاضر ہوا تھا۔ بچوں کے امراض کا ماہر ہونے میں آپ کی بڑی شہرت ہے اور آپ کے خوشنما بنگلے کی تختی پر آپ کے نام کے نیچے فارن ڈگریوں کا لمبا دم چھلا ہے۔ کوئی شخص اس سے مرعوب ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آپ بےحد مصروف آدمی ہیں۔ ہسپتال میں آپ کبھی نہیں ملتے۔ آپ ہمیشہ راؤنڈ پر رہتے ہیں۔ البتہ شام کو اپنے کلینک میں چھ سے نو تک ضرور مل جاتے ہیں۔ میرا بچہ بڑی تکلیف میں تھا۔ اس کی باری سب سے آخر میں آئی کیونکہ گھر میں فون نہ ہونے کی وجہ سے میں آپ سے پہلے اپائنٹمنٹ نہ لے سکا۔ بارے اس کی باری آئی اور میں اسے اندر لے گیا۔

آپ نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ ایسی خوش اخلاقی میں نے بہت کم لوگوں میں دیکھی ہے۔ آپ نے بچے کو بڑی اچھی طرح سٹیتھوسکوپ سے ٹٹولا۔ اسے ٹھونکا بجایا۔ اس کے گلے میں ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ میں بڑا متاثر ہوا اور مجھے امید بندھ گئی کہ میرا بچہ اب ضرور اچھا ہو جائے گا۔ چیک اپ کے بعد آپ نے نسخہ لکھنا شروع کیا۔ یہ کافی لمبا نسخہ تھا۔ آپ نے نسخہ میرے ہاتھ میں دیا اور کچھ ہدایات دیں۔ میں نے شکریہ ادا کیا اور فیس کے متعلق پوچھا۔

آپ نے مسکراتے ہوئے میز پر تختی کی طرف اشارہ کیا جس پر فیس مشورہ بتیس روپے لکھی تھی۔ میں نے بتیس روپے آپ کے ہاتھ میں دیے اور کرم دین کی دکان سے دوائیں خریدیں تو بل کوئی پینسٹھ کے لگ بھگ بنا۔ میں نے سوچا کہ سب بہترین دوائیں جو اس مرض کے لیے ہیں، آپ نے تجویز فرما دی ہیں۔ میرا بچہ ضرور تندرست ہو جائے گا۔

بچہ ایک مہینا آپ کے زیرِ علاج رہا۔ آپ ہر دفعہ چپکے سے بتیس روپے فیس لے لیتے اور مسکراتے ہوئے اسے جیب میں ڈال لیتے مگر میرے بچے کے مرض میں افاقہ نہ ہو۔ وہ اسی طرح بخار میں پھنکتا رہا اور کمزور ہوتا چلا گیا۔ جب کئی بتیس روپے آپ کی جیب میں جا چکے تو میں اسے ایک اور ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔ اس نے کہا کہ یہ تو کیس ہی سرجیکل ہے۔ لمبر پنکچر ہو گا اور بچہ ٹھیک ٹھاک ہو جائے گا۔ وہ بھی آپ کے بھائی نکلے۔

ڈاکٹر صاحب میں جانتا ہوں کہ شفا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ آپ کو جو پیٹنٹ دوائیں زبانی یاد تھیں یا جن کے سیمپل آپ کی میز پر رکھے تھے، آپ نے نسخے میں لکھ دیں۔ اس سے زیادہ آپ کیا کر سکتے تھے لیکن ڈاکٹر صاحب ایمانداری سے کہیے، کیا یہ بتیس روپے ایک چاقو کی طرح تیز مسکراہٹ اور کاغذ پر چند حروف کے بدلے میں کچھ زیادہ نہیں؟ مجھے تو آپ اور ان میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا۔ ماسوا اس کے کہ آپ ٹھنگنے اور پلپلے ہونے کے باوجود کچھ خوش وضع اور خوش قطع ہیں اور ایک یخ کر دینے والی مسکراہٹ کو عین موقع پر اپنی منشا کے مطابق ہونٹوں پر طلب کر لیتے ہیں۔ (اس کے برعکس عام گرہ کٹ جو میں نے دیکھے ہیں، میلے کچیلے کپڑے پہنتے ہیں)۔

جناب ڈاکٹر صاحب، یقین مانیے، ہمارا ملک مفلس اور قلاش ہے۔ آپ نے تو خیر کئی بتیس روپے کما لیے ہوں گے مگر آپ نے کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ بتیس روپے ایک معمولی شہری کے لیے اچھی خاصی رقم ہے۔ ابھی ہماری پلیننیں اور اقتصادی منصوبے اتنا رنگ نہیں لائے کہ روپے درختوں پر اُگنے لگیں۔ جب وہ وقت آیا تو آپ بے شک بتیس کے بتیس سو مانگیے گا تب آپ حق بجانب ہوں گے مگر تب آپ پریکٹس کیوں کرنے لگے؛ خدمتِ خلق کے نام سے۔ یہ رہزنی آپ اس لیے تو کرتے ہیں کہ روپیہ اور صرف روپیہ آپ کا منتہائے مقصد ہے۔

آپ کے بھائی بند کہتے ہیں کہ ڈاکٹری ایک بڑا نوبل پیشہ ہے۔ کیا آپ سنجیدگی سے اس پر یقین رکھتے ہیں؟ مجھے یقین ہے کہ آپ کا کوئی بھائی بند سڑک کے کنارے دم توڑ رہا ہو گا تو آپ اپنی کار میں بے اعتنائی سے فراٹے بھرتے گزر جائیں گے۔ آپ کے قریب وہی لوگ پھٹک سکتے ہیں جن کے پاس آپ کو دینے کے لیے روپوں کی بہت سی بتیسیاں ہوں۔ آپ کی مسکراہٹ بھی انھی کے لیے مخصوص ہے۔

ڈاکٹر صاحب! مانا کہ آپ کے والدین نے آپ کو

ڈاکٹری کی اعلیٰ تعلیم دلوائی اور ہزاروں روپے آپ پر خرچ کیے۔ کیا یہ تعلیم حاصل کرتے وقت آپ کا واحد مدعا یہی تھا کہ آپ بتیس روپے بنانے والی مشین بن جائیں گے؟ یقین مانیے اس سے زیادہ آپ کچھ بھی نہیں۔ کار بھی نئی نویلی لش لش کرتی آپ کے پاس ہے۔ گھر میں فریج بھی ہے اور ٹیلی ویژن بھی۔ لڑکے بھی آپ کے انگلش اسکولوں میں پڑھتے ہیں۔ آپ کامیاب آدمی ہیں لیکن مجھے آپ کے انسان ہونے میں شک ہے۔ انسانی بیچارگی اور درماندگی پر آپ کا دل کبھی نہیں پسیجا۔ بتیس روپے کے نظارے پر اچھلتا ضرور ہے۔ کیا اسی لیے خدائے عزوجل نے آدمی کو زمین پر اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے کہ روپے اور دنیا کی نمود و نمائش کی حرص میں اس کا دل پتھر ہو جائے اور اپنے بھائیوں کی مصیبت پر نہ تڑپے؟

ڈاکٹر صاحب ہسپتال میں ہمیشہ راؤنڈ پر رہنے کا راز بھی سب جانتے ہیں۔ یہ بھی سب جانتے ہیں کہ وارڈ میں وہی بچہ داخل ہوتا ہے جس کے والدین پہلے آپ کے کلینک پر حاضری دیتے ہیں۔ مجھے تو یہ بھی شک ہے کہ اپنی فیسیں کھری کرنے کے لیے آپ جان بوجھ کر مرض کو لمبا اور زیادہ پیچیدہ بنا دیتے ہیں۔ آپ کے پول آپ کے پیشے ہی کے ایک ناولسٹ ڈاکٹر کرائنن نے اپنے ناول ''سٹاڈل'' میں خوب خوب کھولے ہیں۔ اس ناول کے چھپتے ہی میڈیکل پروفیشن کے لوگ ڈاکٹر کرائنن کے پیچھے پڑ گئے۔ مگر ڈاکٹر کرائنن نے بالکل سچی سچی باتیں کہہ دی تھیں۔ وہ ایک آزاد معاشرے کا شہری تھا۔ ہماری طرح ایک بے حس ریاکارانہ نظام کا فرد نہیں تھا جہاں سچی بات کہی ہی نہیں جا سکتی۔

کیا کبھی آپ کے ذہن میں آیا کہ وہ علم جو آپ نے حاصل کیا ہے، اسے انسانی برادری کی بے لوث خدمت کرنے کے لیے بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ کتنا نوبل پیشہ ہے آپ کا اور کن حقیر مقاصد کے لیے استعمال کر رہے ہیں؛ آپ کے منہ سے یہ الفاظ بھی سنے گئے ہیں کہ ''بزنس از بزنس''۔ افسوس اس ملک میں کیا ہم سب... کیا ڈاکٹر، کیا وکیل، کیا لیڈر اور کیا صحافی...... سب بزنس کرتے ہیں۔ میں سوچتا ہوں کیا کبھی وہ وقت آئے گا جب ہم زندگی کو بزنس اور کیریئر سے ناپنا بند کر دیں گے اور صحیح معنوں دوسروں کے لیے جئیں گے!

ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر البرٹ شوٹیزر بھی آپ کا بھائی تھا۔ اگر وہ چاہتا تو جرمنی میں ایک بہترین معالج کی پریکٹس کرتا اور بلاشبہ لاکھوں کماتا۔ اس نے اس محفوظ کیریئر پر کیوں لات ماری؟ اور افریقا میں کوڑھیوں کے درمیان مرنے اور جینے کے لیے کیوں گیا؟ اس کی مثال سے بھلا آپ کیا سیکھیں گے؟ آپ تو بتیس روپے کی چکا چوند میں گم ہیں اور ہمیشہ اسی میں گم رہیں گے۔ یہی آپ کا مقدر ہے۔

خدا کرے کہ آپ کو کبھی اپنے علاج کے لیے کسی اور کو بتیس روپے نہ دینے پڑیں اور آپ تاقیامت زندہ رہیں۔

دعا گو......

☆☆☆

میرے ذہن میں کتنے اور غیر نوشتہ خطوط ہیں جو ان کے مکتوب الیہ حضرات کو کبھی موصول نہیں ہوں گے۔ انھیں لکھنے کے لیے طبیعت بے طرح مچلتی ہے مگر میرے پاس اتنا وقت نہیں، میں دنیا کے چند سست ترین وجودوں میں سے ہوں اور سوچتا ہوں کہ میں یہ خط لکھنے اور پوسٹ کرنے کا وقت بھی نکال لوں تو اُس سے حاصل؟ کھسیانی بلی کھمبا نوچنے سے چوہوں کی اچھل کود بدستور جاری رہے گی۔ وہ غالباً میرا خط ملنے پر خوب ہنسیں گے اور دل میں کہیں گے...... یہ شخص یقیناً خبطی ہے......

ہر آدمی اپنی ایک محدود دنیا میں رہتا اور خود کو افلاطون کا چھوٹا بھائی سمجھتا ہے۔

اس لیے میں قدم قدم پر توہینوں، حماقتوں، ناانصافیوں کو برداشت کرتا جاؤں گا۔ اپنے غصے کو پی جاؤں گا۔ غیر نوشتہ خطوط کو اپنی ذہنی فائل میں محفوظ کرتے رہنا ہی میرا مقدر ہے اور پیارے پڑھنے والے! شاید تمہارا بھی۔ ◆◆◆

میں شاعر تو نہیں...

شوہر کے غیر مادّی اور نظریاتی چلن سے تنگ آئی ایک مادّہ پرست بیوی کی ڈرامائی کہانی

سلطان جمیل نسیم

''بیچارے برق صاحب پر بجلی گرنا شروع ہو گئی۔''

نیچے کی منزل سے تیز تیز آوازیں اُوپر آنے لگیں تو باجی نے مجھ سے کہا اور میں نے خجل ہو کر سر جھکا لیا کہ یہی ایک فنکار کا مقدر ہے۔

برق صاحب کا شمار ان شاعروں میں ہوتا ہے جن کے نام ہماری شاعری کا بھرم قائم رکھے ہوئے ہیں۔ زندگی کے چالیس پینتالیس سال انھوں نے اپنے آدرش اور اپنے فن کی لو اونچی کرنے میں صرف کیے ہیں۔ مزدوروں کے ترجمان، غریبوں کے ہمدرد اور انقلابی دستے کے سالار رہ چکے۔ انھوں نے اپنی شاعری سے استعمار پسند قوتوں کو للکارا ہے۔ آزادی کے جذبے کو اُبھارا اور استحصالی طبقے کے خلاف مظلوم کو سینہ سپر ہو جانے کا حوصلہ عطا کیا ہے۔ آزادی مل جانے کے بعد بھی ان کے خیالات نے مظلوموں کی طرف سے منہ نہیں موڑا۔

جب وہ تحریک ختم ہو گئی۔ اس کے اثرات مدھم پڑ گئے تو برق صاحب نے نظم کے بجائے غزل کو ترسیل خیال کا ذریعہ بنا لیا۔ غزل کو وہ مقام

دیا کہ سارے دیش میں ان کی جے جے کار ہونے لگی۔ سرکار نے پدم بھوشن کا خطاب دیا لیکن بیوی کے ہاتھوں لاچار ہیں۔ گھر میں کوئی وقعت ہی نہیں۔

میں برق صاحب کے شاعرانہ کمال کا بہت عرصے سے معتقد تھا لیکن ملاقات کی کوئی صورت پیدا نہ ہو سکی تھی۔ آخر ملازمت کے سلسلے میں یہاں آنا ہوا تو برق صاحب سے ملنے کی آرزو دل میں تڑپ پیدا کرنے لگی لیکن رہائش کے مسئلے نے مجھے اس قدر الجھائے رکھا کہ کئی مہینے تک برق صاحب سے ملاقات کی سبیل پیدا نہ کر سکا۔ اسی دوران ایک مشاعرے میں شرکت کا موقع ملا۔ برق صاحب کو وہاں دیکھا تو ماند خواہش جگمگ جگمگ کرنے لگی۔

برق صاحب نے میری غزل کو بہت توجہ سے سنا۔ کئی مصرعوں کو دہرایا۔ چند اشعار پر داد دی اور چلتے وقت مجھے اپنے دولت کدے پر حاضر ہونے کے لیے فرمایا۔ چنانچہ میں دوسرے ہی دن پہنچ گیا۔ بہت خوش ہوئے۔ بڑی دیر تک مختلف ادبی مسائل پر گفتگو فرماتے رہے۔ باتوں باتوں میں یہ تمنا لب پہ آ ہی گئی کہ میں اپنی غزلیں ان کی خدمت میں اصلاح کی غرض سے پیش کر دیا کروں۔ میری اس خواہش پر وہ ذرا مسکرائے پھر فرمایا:

''یہاں روز ہی احباب کا اجتماع ہوتا ہے۔ استادی شاگردی کا جھنجھٹ میں نے کبھی نہیں پالا۔ آپ تشریف لاتے رہیے۔ لوگوں کو سنیے اور ان کو سنایئے۔ اس طرح بہت سے گوشے روشن ہو جائیں گے اور اسی روشنی میں آپ اپنی چیزوں کو دیکھیے اور خود ہی ترمیم و تنسیخ کیجیے۔ ویسے آپ کی رہائش کہاں ہے؟''

ان کو بتایا کہ میں ایک معمولی سے ہوٹل میں ٹھہرا ہوں۔ والدین پاکستان جا چکے اور بڑی بہن آگرہ کے آبائی مکان میں رہ رہی ہیں۔ ان کے شوہر دبئی میں ہیں۔ وہ بھی پاکستان جانا چاہتی ہیں لیکن میری وجہ سے رکی ہوئی ہیں کہ میرے چند معاملات سلجھ جائیں تو وہ میرے ہی ساتھ پاکستان کا رخ کریں۔ میری کتھا سن کر وہ مسکرائے۔

''حضرت۔ آپ نے اتنا تفصیلی تعارف پہلے کیوں نہیں کرایا؟ آپ کے والد سے میری یاد اللہ ہے۔ اس نسبت سے آپ میرے لیے اور عزیز ہو گئے۔ بھئی یہ دو منزلہ مکان ہے۔ اُوپر کا حصہ خالی ہے۔ گھر والی کئی بار مجھ سے کہہ چکی ہیں کہ وہ کرائے پر دے دوں۔ آپ سے زیادہ بھروسے کا اور کون ہوگا۔ بشیر کو بلا لیجیے اور یہاں منتقل ہو جایئے۔''

یہ سن کر سوکھے دھانوں پانی پڑا۔ برق صاحب نے مجھے آشیانہ عطا کر کے پریشانیوں کی دھوپ سے بچا لیا۔ میں اسی رات باجی کو لینے چلا گیا۔

برق صاحب کی صحبت میں میرا شعور نکھرنے لگا۔ میری شاعری میں معنی آفرینی اور زبان و بیان کی خوبیاں بڑھنے لگیں۔ زندگی کے مسائل چند مصرعوں میں بیان کرنے کا سلیقہ آنے لگا۔ شام کو دفتر سے آنے کے بعد زیادہ وقت برق صاحب کے ساتھ گزرتا۔ ایک ہی گھر میں رہتے اور کچھ باجی کے توسط سے ان کی نجی زندگی سے بھی شناسائی ہو گئی۔

برق صاحب کے دو بچے ہیں، ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ ان کے صاحبزادے، جن میاں سے تو میری کبھی رسم و راہ ہو گئی تھی۔ اس لیے کہ برق صاحب کو جب کبھی دوسرے شہر مشاعرے میں شرکت کے لیے جانا پڑتا تو میں شام کا کچھ حصہ ان کے بیٹے کے ساتھ بھی گزارتا۔ البتہ صاحبزادی کے بارے میں اتنا ہی معلوم ہو سکا کہ قبول صورت اور پردے کی پابند ہے۔

ایک دن دفتر سے واپس آیا تو باجی کے ساتھ ایک حسین لڑکی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ باجی نے مجھے دیکھا تو چلا کر بولیں:

''ارے اِدھر پردہ ہے۔ اپنے کمرے میں چلے جاؤ۔''

میں الٹے قدموں پلٹ تو گیا لیکن وہ موہنی صورت نظروں میں گھُب گئی۔ ایک بار دیکھا ہے، دوسری بار دیکھنے کی

تمنا ہے۔ دل پکارنے لگا۔

اس لڑکی کے جانے کے بعد باجی نے بتایا کہ یہ برق صاحب کی بیٹی منن تھی۔ کالج میں پڑھتی اور اپنی امی سے چھپ کر آزاد نظمیں لکھتی ہے۔ میں دل ہی دل میں ہنسنے لگا۔ رسم و رواج میں جکڑی ہوئی لڑکی اور آزاد نظمیں..... پھر میں نے باجی سے کہا:

''برق صاحب نے اپنے بچوں کے نام خوب رکھے ہیں۔ جن اور منن.....''

''ارے یہ تو پیار کے نام ہیں۔ لڑکے کا نام حبیب اور اس کا نام انجم تاب ہے۔''

''انجم تاب..... اخیر لڑکے کا نام تو ٹھیک ہے لیکن یہ انجم تاب.....''

''انجم تاب..... کیوں..... اچھا تو نام ہے.....''

''ہاں اچھا ہے لیکن کسی شاعری کے مجموعے کے لیے۔''

باجی ہنس دیں۔ پھر ہم دونوں دیر تک برق صاحب کے بارے میں باتیں کرتے رہے کہ ایسے اچھے شاعر کی گھر میں کیا درگت بنتی ہے۔ برق صاحب کی بیگم ایسی جھگڑالو ہیں کہ توبہ..... وہ صلواتیں سناتی ہیں کہ پتہ پانی ہو جاتا ہے مگر شاباش ہے برق صاحب پر کہ یہ سب کچھ نہایت خاموشی اور خندہ پیشانی کے ساتھ برداشت کر لیتے ہیں۔ باجی نے کہا:

''کام بھی تو نہیں کرتے سوائے شاعری کے..... مشاعروں کی آمدنی سے کہیں گرہستی چلتی ہے..... نظریات اور تحریکوں سے وابستہ رہ کر بچے نہیں پالے جا سکتے۔''

میں نے ان کو چھیڑنے کے لیے کہا:

''باجی..... اگر ہر آدمی دبئی چلا جائے تو پھر شاعری کون کرے؟''

''اگر صرف شاعری ہی کرنا ہے تو گھر کیوں بساتے ہیں۔ رہیں اکیلے۔ خوب شاعری کریں، کون منع کرتا ہے۔ یہ مکان ان کی بیگم کو جہیز میں ملا تھا۔ بقول بیگم برق..... اگر یہ ٹھکانا بھی نہ ہوتا تو برق صاحب کی آمدنی دربدر لیے پھرتی.....''

باجی نے ایک سانس میں کہا۔ میں برق صاحب کو موضوع بنا کر بحث کرنا نہیں چاہتا تھا، اس لیے خاموش ہو گیا۔

ایک دن بہت دیر سے آنکھ کھلی۔ میں نے جلدی جلدی ناشتا کیا۔ کوٹ کندھے پر ڈال کر زینے کی طرف بھاگا اور جیسے کسی سے ٹکرا گیا۔ ایک چیخ اُبھری..... وہ تو خیریت ہوئی کہ میں نے اسے سنبھال لیا ورنہ میرے کوٹ کے بجائے وہ زینے سے گر گئی ہوتی۔ چیخ کی آواز سن کر باجی دوڑی آئیں۔ انجم کو بدحواس دیکھ کر وہ بھی گھبرا گئیں۔ میں شرم سے پانی پانی اپنا کوٹ پہنتا ہوا نیچے کی طرف اُتر گیا۔

انجم کو میں نے پہلی بار اتنے قریب سے دیکھا کہ دن بھر دل نے مجھے اس کے سوا کچھ اور سوچنے ہی نہ دیا۔ سارا دن میری عجیب سی حالت رہی۔ کسی کام میں جی ہی نہ لگا۔ انجم کے خیال سے ایک لمحہ کی جدائی بھی بری لگنے لگی۔ بس میں اسی کے تصور میں مگن رہا۔

شام کو گھر پہنچا تو باجی کھانے کے بعد صبح کے تصادم کا قصہ لے بیٹھیں۔

''انجم بیچاری سویرے سے کتنی ہی مرتبہ آ کے اپنا پچھتاوا ظاہر کر چکی۔ دراصل وہ اس لیے آ رہی تھی کہ تم سے پڑھنے کے لیے بات چیت کرے۔''

''مجھ سے بات چیت؟''

''ہاں گرتم نے زینے پر ہی ساری گفتگو کر ڈالی۔''

''کیا بتاؤں باجی۔ دفتر کے لیے پہلے ہی دیر ہو گئی تھی اس لیے میں ایک دم جلدی میں بھاگا تھا۔ وہ بھی شاید کچھ بتلانے میں تھی اور.....'' میں اپنی خجالت چھپانے لگا۔

''لڑکی پسند ہے.....؟'' باجی نے مسکرا کے پوچھا اور پھر میرے جواب کا انتظار کیے بغیر کہنے لگیں:

''وہ صبح یہ کہنے کے لیے آئی تھی کہ امتحان سر پہ آ گیا ہے اور وہ انگریزی میں بہت کمزور ہے۔ اگر تم کچھ وقت نکال سکو تو

شاید وہ امتحان میں کامیاب ہو جائے۔'' میں نے باجی کے مسکراتے ہوئے چہرے سے ان کی مرضی بھانپ لی اور لاتعلقی کے انداز میں کہا۔

''لیکن یہ پردے کی پڑھائی، کچھ عجیب سا نہیں لگے گا؟''

''یہ بات میں نے بھی کہی تھی..... وہ تم سے کانا پردہ کیا کرے گی۔''

''یعنی۔ صاف چھپتے بھی نہیں سامنے آتے بھی نہیں..... گویا اس شعر کی تفسیر بن کر بیٹھا کریں گی محترمہ.....''

دوسرے دن انجم پڑھنے آئی تو وہ شرمار ہی تھی اور میں جھجک رہا تھا۔ باجی قریب بیٹھی مسکرا رہی تھیں۔ میری ہچکچاہٹ تو دو چار دن میں ختم ہو گئی مگر انجم کا حجاب باقی رہا۔ باجی پہلے دن تو ہمارے ساتھ بیٹھیں۔ دوسرے دن تھے جاوید کو بہلانے کے لیے اُٹھ گئیں۔ پھر ایک دن پانی اُبلنے لگا۔ ایک دن ہنڈیا جلنے لگی۔ چار پانچ دن کے بعد انھوں نے ساتھ بیٹھنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔ لڑکی پسند ہے؟ باجی کے اس سوال کا جواب تو پہلے ہی دن میرے دل نے اقرار میں دے دیا تھا۔ اب انجم کو پڑھانا شروع کیا تو اس کے گُن گانے لگا۔ دل کی دھڑکن کے ساتھ جذبات کی ادائیگی ممکن نظر نہ آئی تو میں روز ایک غزل کہنے لگا۔

برق صاحب نے روز ایک غزل سنی تو زیرِ لب تبسم کے ساتھ فرمایا۔ ''خوب آمدے آج کل۔''

مگر..... وہ میرے جذبات واحساسات سے بیگانہ بس اپنی پڑھائی میں مگن تھی اور میرا حال یہ کہ رات کی پرتوں میں اس کی مسکراہٹ روشنی کی لکیروں کے مانند دیکھوں۔ آئینے میں نظر پڑے تو اس کا چہرہ دکھائی دے۔ ستاروں میں وہ پلکیں جھپکاتی نظر آئے..... چاندنی میں اس کے سائے سمیٹے ہوئے ملیں۔ اس کی مہک فضا میں گھلی ہوئی معلوم ہو۔ میں کہاں ہوں، اپنا پتہ ہی نہ ملے۔ ہر لحہ، ہر طرف..... بس انجم ہی انجم۔ میں بے کہے لفظوں کے ساتھ بیٹھا تھا تو انھوں نے کہا۔

''میری زندگی سامراج کے خلاف جدوجہد کرتے گزری ہے۔ نظریہ کوئی جامد حقیقت نہیں، اٹل حقیقت آزادی ہے۔ میں نے گیارہ برس جیل میں گزارے ہیں۔ اب اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ آزادی مقدر تھی۔ وہ مل گئی اور بچوں کا مقدر پاکستان ہے۔ لاکھوں انسان جس ملک کے لیے اپنی زندگی کا نذرانہ دے چکے، اب وہاں جانے کا فیصلہ کر لیا ہے..... آپ کے جانے میں اب کیا رکاوٹ باقی ہے۔''

میں نے تفصیل کے ساتھ انھیں اپنی مجبوریوں سے آگاہ کیا۔ وہ میری بات سن کر فرمانے لگے۔ ''اپنی بہشیر کو ہمارے ساتھ بھیج دیجیے۔ آپ جب مجبوریوں سے دامن چھڑا لیں تو چلے آیئے گا۔''

برق صاحب کی اس رائے سے باجی بھی متفق تھیں۔ ہفتہ بھر بعد برق صاحب اپنا مکان میری تحویل میں دے کر پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔

سب لوگوں کے جانے کے بعد مجھ پہ کیا گزری، میں نے وقت کیسے کاٹا؟ اپنے جلدی جانے کے سلسلے میں کیا کیا تدابیر اختیار کیں؟ یہ قصہ طولانی ہے۔ مختصراً یہی کہا جا سکتا ہے کہ میں دن کے ہنگامے اور رات کی تنہائی میں تقسیم ہو کر رہ گیا۔ فطرت کا یہ عجیب دستور ہے کہ دن کے اُجالے میں تکلیفیں بھی روپوش ہو جاتی ہیں اور یادیں بھی لیکن جہاں رات کے زینے پر دن کا پہلا قدم اُٹھا، وہیں درد کی چاندنی پھیلی اور یادوں کی پازیب کھنکی۔

انجم نے کسی طرح بھی مجھے یہ احساس نہیں دلایا تھا کہ وہ میرے جذبات میں شریک ہے۔ میں ان کہے انداز ہی سے جان گیا تھا کہ جو راستہ میں نے اختیار کیا ہے، وہ بھی اسی پر چل رہی ہے۔ چلتے وقت جس طرح اس نے اپنی آنکھوں کو چھپایا تھا۔ جس طرح لرزتے ہونٹوں کو دبایا تھا۔

میرے لیے وہی اظہار بہت تھا۔ میں جب خالی گھر میں آ کر لیٹتا۔ جب کبھی سونے کمروں میں چکر لگاتا تو اس کی آنکھوں کو بولتے اور لبوں کو اپنے آپ سے گفتگو کرتے محسوس کرتا۔ یہ احساس مجھ میں اور وحشت پیدا کر دیتا۔ پھر ایک دن مجھے باجی کے خط کے ساتھ انجم کا چند سطری خط بھی ملا۔

''آپ کیسے ہیں؟ اکیلے میں عجیب سا لگتا ہوگا۔ اپنا خیال رکھیے اور پاکستان آ جایئے.....''

ان لفظوں میں اس نے سارے جذبے سمیٹ لیے تھے۔ میں بار بار پڑھتا اور بار بار روتا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ پرلگا کر اڑوں اور پاکستان جا پہنچوں۔

میں نے باجی کو لکھا کہ بس اب آنکھوں کی سوئیاں رہ گئی ہیں۔ مجھے پاکستان پہنچا ہی سمجھیں اور امی، پاپا سے بات کر کے برق صاحب کے ہاں جایئے۔ پھر برق صاحب کو بھی ایک نیاز مندانہ خط لکھا اور ساتھ ہی اپنی تازہ غزل بھی بھیج دی۔

باجی کا خط آیا۔

''ہم لوگ برق صاحب کے ہاں گئے تھے۔ سب بہت تپاک سے ملے۔ سارے معاملات طے ہو گئے ہیں۔ تم آ جاؤ تو رہی سہی کسر بھی پوری ہو جائے۔''

باجی کے خط نے وظیفے کا کام دیا۔ مہینوں سے رُکے ہوئے کام دو چار دن میں نمٹ گئے۔

پاسپورٹ اور ویزا سب تیار تھا۔ میں نے برق صاحب کا مکان ان کے دوست جگل پرشاد کے حوالے کیا۔ جس شام میری روانگی تھی۔ اسی دن باجی کا ایک اور خط ملا:

''یہ بات میں تمہیں لکھنا نہیں چاہتی تھی کہ تم خود یہاں آ کر سب کچھ دیکھو اور سنو اور فیصلہ کرو..... مگر میں عجیب قسم کی کشمکش میں مبتلا ہوں۔ کل انجم کی امی آئی تھیں۔ بُشرے سے غصہ ظاہر ہو رہا تھا اور گھبراہٹ بھی۔ برق صاحب بھی ساتھ تھے۔ وہ تو پاپا کے ساتھ جا بیٹھے اور ان کی بیوی امی کو عجیب نظروں سے دیکھتی رہیں۔ میں حیران تھی کہ آخر بات کیا ہے۔ پھر گھبرا کے میں نے ان سے پوچھا۔

''کیا بات ہے خالہ۔ کچھ تو بتایئے۔''

خالہ نے وحشت بھری نظروں سے مجھے دیکھا اور پوچھا:

''وہ تمہارا بھائی..... کیا وہ شاعر بھی ہے۔''

''جی ہاں..... اچھا شاعر ہے۔ برق صاحب کا تو شاگرد بھی ہے۔''

یہ سنتے ہی انھوں نے ہاتھ میں تھاما ہوا لفافہ امی کی گود میں ڈال دیا اور دوٹوک لہجے میں کہا:

''میں یہ رقعہ واپس کرنے آئی ہوں..... من زندگی بھر کنواری رہے، یہ مجھے منظور ہے۔ پر میں اسے جیتے جی دوزخ میں نہیں جھونک سکتی۔''

میں نے اور امی نے حیرت سے انھیں دیکھا۔ وہ اپنی اسی جھوک میں بولیں۔

''بی بی۔ میں اپنی بیٹی کو کسی شاعر سے ہرگز نہیں بیاہوں گی۔ میرا ذاتی تجربہ ہے کہ شاعر کوڑی کے کام کا نہیں ہوتا.....''

مجھ سے آگے نہیں پڑھا گیا اور میں سر تھام کے بیٹھ گیا۔ ◆◆◆

اگر آپ آن لائن مصنف بننا چاہتے ہیں تو آج ہی قلم اُٹھایئے، لکھیے اور ہماری ویب سائٹ پر پوسٹ کر دیجیے۔

www.urdudigest.pk/onlinewriter

جب ہم فیس بکیے ہوئے

فیس بک کی کہانی، ایک لڑکی کی زبانی

سبیغ ضو

اس کتاب چہرہ یعنی فیس بک کی جادوئی دنیا میں آئے ہمیں اس مہینے پورے تین سال ہوگئے۔

صاحبو...... تین سال قبل اس تیز ترین دور میں بھی ہم تیسری دنیا کے فرد کی طرح سادہ اور معصوم تھے۔ انٹرنیٹ کا نام تو سنتے رہتے تھے مگر لکھنے کے شوق کے باوجود کبھی کمپیوٹر کو ہاتھ نہ لگایا تھا...... فیس بک کیسے استعمال کرتے ہیں؟ اس کی معلومات بھی بس سننے تک ہی محدود تھیں۔

فیس بک میں ہماری اپنی کوئی شناخت نہ تھی اور نہ یہ اندازہ تھا کہ تین سال بعد ہم کسی جونک کی طرح اس بلا سے چمٹ جائیں گے۔ مزے میں جی رہے تھے۔ خطوط، افسانے، مضامین، ڈاک کے ذریعے پوسٹ کیا کرتے تھے۔ ہم سے پوچھا جاتا آپ ای میل کیوں نہیں کرتیں؟ ہم بھلا انھیں کیا بتاتے کہ ای میل کیا ہوتا ہے؟ ہم نہیں جانتے بلکہ ہمارے دماغ میں جو ای اور میل کی تشریح تھی شکر ہے اس پر تبادلۂ خیال سے ہم نے ہمیشہ گریز ہی کیے رکھا۔

جب ایک دن بھانجے کو تحریریں پوسٹ کرنے کے لیے تھمائیں تو اس نے دانت پیستے ہوئے ہم پر چوٹ کی۔

''خالہ کبوتر کیوں نہیں رکھ لیتی؟'' ہم نے اُسے گھورا۔ جلدی سے بات بناتے ہوئے کہنے لگا۔

''ای میل کر دیا کریں نا۔'' اس کے چھوٹے ہونے کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے ہم نے اسی کے سامنے اپنی بیچارگی کا اظہار کر دیا کہ ہمیں نہیں معلوم ای میل کیسے کرتے ہیں؟

بھانجے میاں نے پہلے تو حیرانی سے دیکھا۔ گویا پھر تو کھڑوس خالہ کی کم مائیگی ہاتھ آ جانے پر مذاق اڑانے کا سرا ہاتھ آ گیا کہ ہماری لکھاری خالہ ای میل کی ای تک سے واقف نہیں۔

خیر مختصر یہ کہ پھر اسی نے ہمیں ای میل اکاؤنٹ بنا کر دیا اور سمجھایا۔ لگے ہاتھوں فیس بک اکاؤنٹ بھی بنا کر ہمارے ہاتھوں میں تھمایا اور کہا استعمال کرتے کرتے خود ہی سمجھ آ جاتی ہے۔

ہم نے جیسے ہی فیس بک آن کیا۔ خود سے ابھی سمجھ ہی رہے تھے کہ photo choose کا آپشن دب گیا۔ ہماری گیلری کی تمام تصویریں چوائس کے لیے سامنے آ گئیں۔ اب تو ہماری حالت غیر ہوگئی کہ لگتا ہے کچھ غلط کر دیا ہم نے اور تمام تصاویر وال پر آویزاں کر دی ہیں۔

فوراً سے پیشتر آئی ڈی بند کی۔ سب سو رہے تھے پوچھتے کس سے۔ ساری رات بے چین گزری۔ صبح اٹھتے ہی باجی کو ڈرتے ڈرتے بتایا، پھر ان کی ہنسی کا فوارہ تھا اور ہماری ہونق صورت۔

دوسری بیوقوفی بلکہ یادگار شرمندگی کا قصہ سنیے۔ ہوا یوں کہ ہم نے ایک دوست کو درخواست بھیجی انھوں نے قبول تو نہیں کی لیکن آٹومیٹکلی ہم انھیں فالو کرنے لگے۔ دو تین دن ہی ہوئے تھے فیس بک استعمال کرتے۔ کوئی تین چار دوست ہی تھے۔ اس لیے تمام دوستوں کی سرگرمیاں بھی بآسانی نظر آ جاتی تھیں۔

ہم نیوز فیڈ چیک کر رہے تھے اور ہمارے دوست کچھ ایسی چیزوں کو لائیک کر رہے تھے جو ہمیں قابل قبول نہ تھیں۔ ہم دیکھ کر اُچھل پڑے۔ ہمیں لگا یہ ہماری وال پر سج رہی ہیں۔ اب ہمیں فکر...... ہائے ربا! یہ تو تمام لوگ دیکھ رہے ہوں گے۔ بس آؤ دیکھا نہ تاؤ، انباکس میں پہنچے، بھاشن دیا، ادھر میسیج دیکھ کر بھی خاموشی رہی۔ پھر آپی کو ہی بتایا۔ انھوں نے ہمیں بری طرح گھورا اور سر پیٹ لیا۔ فون چھینا اور دانت پیستے ہوئے سمجھایا:

''بی بی یہ نیوز فیڈ ہے تمہاری وال نہیں۔''

خیر! اب تو ہم بڑے ہو گئے ہیں۔ اس برقی دنیا کی رونق میں ہم بھی حصہ ڈالنے لگے ہیں۔ اس کتاب چہرہ میں گردن سے اُوپر خود کو اپنی مرضی کا چہرہ دیے بھانت بھانت کے خیالات کو حقیقت کا رنگ دیتے ہیں جن کا عملی زندگی میں تصور ممکن ہی نہیں۔ اس رنگین دنیا میں ایک ہم ہی کیا ہر چنا منا دانشور، افلاطون بنا اپنی دیوار گریہ سے مُنڈی نکالے، محلے داروں کو اپنی دانشوری کا ناشتہ کرائے بغیر آگے بڑھنے نہیں دیتا۔ جہاں لائکس کمنٹس کے لیے بونگیاں بھی ماری جاتی ہیں۔

خیر فیس بک کی دنیا پر تفصیلی تجزیہ پھر کبھی...... ابھی ہمارے منفرد نام کی کچھ کہانی سن لیجیے۔

لوگوں کو ہمارا نام سبیغ ضو بہت وکھرا سا اور منفرد لگتا ہے۔

جب بھی کوئی ہمارے نام کی تعریف کرتا ہے، ہماری طبیعت مغرور مغرور سی اور گردن میں سریے جیسی اکڑ...... ہرگز نہیں آتی بلکہ ہم نہایت متانت سے ایک بڑی حقیقت کا بوجھ دل میں لیے شکریہ کہہ دیتے ہیں۔ ہمیں اپنا نام خود بھی کچھ کم پیارا نہیں۔ یہ نام باقاعدہ ایک تاریخ رکھتا ہے۔ کس طرح ہم اس نام کی بدولت میل ''کے ملبوس میں آسانی سے پھرتے رہے۔

ہر فیس بک کی دنیا میں اس نام کی ہی بدولت ہمیں بھائی، سر، صاحب کا لقب ملتا رہا۔ پھر لوگ آہستہ آہستہ ہمیں پہچاننے

لگے۔ (ویسے اب تک کئی لوگ ہمیں ہمارے نام کی وجہ سے ہمارے تبصروں کا جواب شکریہ محترم سے ہی دیتے ہیں)

اس کے باوجود اس نام کی مردانہ دہشت نے ہمارا دل کبھی کھٹا نہیں کیا اور ہم اس میں نازکی ہی محسوس کرتے رہے لیکن کچھ دن پہلے کچھ واقعات ایسے ہوئے کہ ٹیلی فونک گفتگو میں اپنا نام دوسروں کو سمجھانا جوشیر لانے کے مترادف ٹھہرا۔

ہوا کچھ یوں کہ کچھ رسالوں میں ہم نے اپنے افسانے بھیجے کچھ دن بعد معلوم کرنے کے لیے جہاں جہاں بھی فون کیا جب ہم سے نام پوچھا جاتا۔ ہم بہت فخر سے کہتے جی سبیغ ضو۔

پہلا جواب کچھ یوں ملا۔

”جی کیا؟ قدیر ذوق......ہم اپنے نام کا یہ حشر دیکھ کر تقریباً اُچھل ہی پڑے۔

دوبارہ بتایا، ”نہیں جی سبیغ ضو......معصومیت سے سوال آیا۔

”صغیر ضو؟؟

ہم جی بھر کے بدمزہ ہوئے۔ ہجے کر کے نام سمجھانے کی کوشش کی۔ کہیں ناکامی کا منہ دیکھا تو کہیں کامیابی ہو ہی گئی۔ ایک ایسی ہی آنے والی کال کو اپنی اماں کے گھر باآواز بلند اپنا نام سمجھا رہے تھے۔ کال کرنے والی خاتون نے اپنی جھنجھلاہٹ کو لہجے کی شیرینی میں غرق کرتے ہوئے پوچھا۔

”ماشاءاللہ کس نے نام رکھا تھا آپ کا اور کیا سوچ کر رکھا تھا؟“

ہم شوخے ہو کر پہلے سے گھڑی گھڑائی وجہ تسمیہ بتانے ہی لگے تھے کہ کہ جانے کب سے یہ گفتگو سن کر جلال میں آتی اماں جان کی ہوائی چپل میزائل کی صورت ہماری کمر پر حملہ آور ہوئی اور ہماری دبی دبی سی چیخ کے ساتھ امی کا بیان بھی محترمہ کے کانوں میں رس گھول گیا۔

اماں جلالی لہجے میں بولی:

”تیرے ابا نے بڑی چاہت سے جو نام رکھا تھا اس کا کیا کیا؟ جو یہ واہیات ”سری طوق“ گلے میں ڈال لیا......!

◆◆◆

کالی یا سفید

ایک نیوز رپورٹر منڈی میں ایک گائے بیچنے والے کا انٹرویو لینے آیا۔ نیوز رپورٹر: آپ اپنی گائے کہاں نہلاتے ہیں؟ بیوپاری: جی کالی یا سفید؟ رپورٹر: کالی والی۔ بیوپاری: جی میں اسے دریا پر نہلاتا ہوں۔ رپورٹر: اور سفید والی کو؟ بیوپاری: جی اسے بھی دریا پر نہلاتا ہوں۔ رپورٹر اس جواب پر تھوڑا حیران ہوا لیکن اس نے انٹرویو جاری رکھا۔

آپ اپنی گائے کو کیا کھلاتے ہیں؟ بیوپاری: کالی یا سفید؟ رپورٹر: کالی والی۔ بیوپاری: جی میں اسے چارا کھلاتا ہوں۔ رپورٹر: اور سفید والی کو؟ بیوپاری: جی اسے بھی چارا ہی کھلاتا ہوں۔ نیوز رپورٹر کو اس بار اور بھی عجیب لگا لیکن اس نے سوچا کہ ایک اور سوال پوچھتا ہوں۔ رپورٹر: آپ اپنی گائے کو رات کو کہاں باندھتے ہیں؟

بیوپاری: کالی یا سفید؟

رپورٹر: کالی والی۔ بیوپاری: جی میں اسے رات کو باڑے میں باندھتا ہوں۔ رپورٹر: اور سفید والی کو؟۔ بیوپاری: جی اسے بھی میں رات کو باڑے میں ہی باندھتا ہوں۔ اب نیوز رپورٹر سے رہا نہ گیا۔ رپورٹر: آپ مجھ سے بار بار کالی یا سفید کے بارے میں کیوں پوچھتے ہیں جبکہ آپ کا دونوں کے بارے ایک ہی جواب ہوتا ہے۔

بیوپاری: جی وہ اصل میں کالی والی گائے میری اپنی ہے۔ رپورٹر: اور سفید والی؟

بیوپاری: جی وہ بھی میری اپنی ہی ہے۔

اردو کلاسیک

عشق ہے اختیار کا دشمن
صبر و ہوش و قرار کا دشمن
دل تری زلف دیکھ کیوں نہ ڈرے
جال ہو ہے شکار کا دشمن
ساتھ اچرج ہے زلف و شانے کا
مور ہوتا ہے مار کا دشمن
دل سوزاں کوں ڈر ہے انجھواں سیں
آب ہو ہے شرار کا دشمن
کیا قیامت ہے عاشقی کے رشک
یارِ ہوتا ہے یار کا دشمن
آبرو کون جا کے سمجھاوے
کیوں ہوا دوست دار کا دشمن

(آبرو شاہ مبارک)

☆☆☆

چمن ہوں چاند جیسے، کھیتیاں ہوں کہکشاں جیسی
زمیں اپنے وطن کی ہو الٰہی! آسماں جیسی
وطن کا ذرہ ذرہ رنگ و شادابی کی دنیا ہو
اُجالا ہو سحر جیسا، فضا ہو گلستاں جیسی
وطن کی روشنی سے ساری دنیا جگمگا اُٹھے
چمک ہو اس کی پیشانی پہ مہرِ ضوفشاں جیسی
مسافریوں چھوئیں منزل کو، جیسے موج ساحل کو
ہمارے پاؤں کی رفتار ہو آبِ رواں جیسی
وہ ہمت دے، کریں اس کی حفاظت ہم دل و جاں سے
یہ خطہ ہم کو دل جیسا، یہ دھرتی ہم کو جاں جیسی

(عاصی کرنالی)

☆☆☆

آغاز عشق عمر کا انجام ہو گیا
ناکامیوں کے غم میں مرا کام ہو گیا
تم روز و شب جو دست بدست عدو پھرے

میں پائمال گردش ایام ہو گیا
میرا نشاں مٹا تو مٹا پر یہ رشک ہے
ورد زبان خلق ترا نام ہو گیا
دل چاک چاک نغمۂ ناقوس نے کیا
سب پارہ پارہ جامۂ احرام ہو گیا
اب اور ڈھونڈیئے کوئی جولاں گہہ جنوں
صحرا بقدر وسعت یک گام ہو گیا
دل پیچ سے نہ طرۂ پرخم کے چھٹ سکا
بالا روی سے مرغ ستہ دام ہو گیا
اور اپنے حق میں طعن تغافل غضب ہوا
غیروں سے ملتفت بت خودکام ہو گیا
تاثیر جذبہ کیا ہو کہ دل اضطراب میں
تسکین پذیر بوسہ بہ پیغام ہو گیا
کیا اب بھی مجھ پہ فرض نہیں دوستیٔ کفر
وہ ضد سے میری دشمن اسلام ہو گیا
اب تک بھی ہے نظر طرف بام ماہ وش
میں گرچہ آفتاب لب بام ہو گیا
اب حرف ناسزا میں بھی ان کو دریغ ہے
کیوں مجھ کو ذوق لذت دشنام ہو گیا
(اسمٰعیل میرٹھی)

☆☆☆

عصرِ حاضر کا کلام

میں ایک کانچ کا پیکر وہ شخص پتھر تھا
سو پاش پاش تو ہونا مرا مقدر تھا
تمام رات سحر کی دعائیں مانگی تھیں
کھلی جو آنکھ تو سورج ہمارے سر پر تھا
چراغ راہ محبت ہی بن گئے ہوتے
تمام عمر کا جلنا اگر مقدر تھا
فصیل شہر پہ کتنے چراغ تھے روشن
سیاہ رات کا پہرا دلوں کے اندر تھا
اگرچہ خانہ بدوشی ہے خوشبوؤں کا مزاج
مرا مکان تو کل رات بھی معطر تھا
سمندروں کے سفر میں وہ پیاس کا عالم
کہ فرش آب پہ اک کربلا کا منظر تھا
اسی سبب تو بڑھا اعتبار لغزش پا
ہمارا جوشش جنوں آگہی کا رہبر تھا
جو ماہتاب حصار شب سیاہ میں ہے
کبھی وہ رات کے سینے پہ مثل خنجر تھا
میں اس زمیں کے لیے پھول چن رہا ہوں رئیسؔ
مرا نصیب جہاں بے اماں سمندر تھا
(رئیس وارثی)

☆☆☆

آپ کا کلام

(حمدِ باری تعالیٰ)

تیرے حضور میں آیا ہوں اس دعا کے لیے
فقیر اپنا بنا لے مجھے سدا کے لیے
کرم کو دیکھ میرے، چہرہ سیہ کو نہ دیکھ
کہ تُو عطا کے لیے، میں فقط خطا کے لیے
کرم سے موئے سیہ کو میرے کیا ہے سفید
"سفید" روئے سیہ کو بھی کر سدا کے لیے
قریب مرگ ہوں عصیاں کے مرض کے باعث
بڑھاؤ دستِ مسیحا میری شفا کے لیے
تیرے کرم نے محبت کا درد بخشا ہے
یہی حیات کا سامان ہے گدا کے لیے
تیرا ہی درد محبت ہے زندگی میری
تمہارا درد ہے کافی میری بقا کے لیے
جو دن بچے ہیں میری زندگی کے اے مالک
ہر ایک پل کو گزاروں تیری رضا کے لیے
شفیق بندۂ احقر کی عرض ہے اتنی
زبان وقف ہو میری، تیری ثنا کے لیے
(شفیق احمد)

☆☆☆

تمہارے ناولوں میں لکھا شہزادہ نہیں ہو سکتا،
با خدا جو ہوں، اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا،
کیوں اتنے پیچ وخم ڈال کے بات کرتے ہو؟
تمہارا کلام مجھ سا سادہ نہیں ہو سکتا؟
تمہاری پوشاک کے دھاگوں میں لپٹا ہوا،
میں تمہاری ناموس کا لبادہ نہیں ہو سکتا؟
مانتا ہوں غلطی پہ خود کو، خطاوار ہوں،
کسی طور غلطیوں کا اعادہ نہیں ہو سکتا؟
سبز رنگ نظر آیا تھا بعد از استخارہ،
کوئی خواب ایسا با ارادہ نہیں ہو سکتا،
وقتِ رخصت جو پوچھا اگلی ملاقات کا،
کہنے لگے ایسا کوئی وعدہ نہیں ہو سکتا،
اب طرز بدل رہے ہیں زمانے میں محبت کے،
احمد، اس منصب پہ ایستادہ نہیں ہو سکتا..!
(منیب نثار)

☆☆☆

خال وخد پہلے سے ہیں اور نہ شباہت میری
آئینہ دنگ ہے کیا ہو گئی صورت میری
رائے جو مرضی رکھیں آپ کا حق ہے لیکن
پہلے دیکھیں تو سہی آپ ریاضت میری
دیو مامور ہیں اس غار کے دروازے پر
اور اک سانپ بھی کرتا ہے حفاظت میری
وقت سے آگے نکلنے کا نتیجہ کیا ہو؟
مجھ کو برباد نہ کر دے کہیں عجلت میری
مفت مل جاؤں تو مل جاؤں وگرنہ گوتم
دے نہیں سکتا یہاں کوئی بھی قیمت میری
(گوتم ملتانی)

☆☆☆

ماں بیٹے کی گفتگو (سفر کراچی سے پہلے)

ماں ہر روز مجھ سے لڑتی ہے
آج کچھ خفا خفا سی لگتی ہے
تجھے خیال اپنا ہے نہ پروا میری
تیری جدائی بیٹا! مار دیتی ہے
میں جا رہا ہوں تو لوٹ آؤں گا
میرے جانے سے کیوں اتنا ڈرتی ہے
بیٹا! خواب اک عجب دیکھا ہے
کچھ پرندے اور اک آس جلتی ہے
تیری دعاؤں میں دور تک جانا ہے
پروا میری، فکر اتنی کیوں کرتی ہے
کچھ اشک بہائے ماں نے دعا دی
کچھ منہ میں دہرائے جاتی ہے
میں جدا ہوا اور سفر میں آنکھ لگی
ڈر اٹھ بیٹھا جو ماں کی آواز آتی ہے
پھر چیخ و پکار کی اک لہر آئی ایسے
لگا ان آوازوں میں ماں بلاتی ہے
جن کی اولادیں بچھڑ گئیں ویر
مائیں ایسی عیدیں کہاں مناتی ہیں
(تنویر علی)

☆☆☆

دوری پکارتی ہے وہ پاس ہے بہت ہی
ڈر ہو فقط اُسی کا اک آس ہے بہت ہی
کتنا قدم جمائے انساں ہے اب بھی بے بس
یوں اُس کی قدرتوں کا احساس ہے بہت ہی
مخلوق نے ذرا سی دنیا ہلا کے رکھ دی
اوقات کیا ہے تیری؟ کیسے بتا کے رکھ دی
تیری مجال کیا ہے اے وقت کے سکندر
طاقت کے زعم نے تو گردن جھکا کے رکھ دی

کیا عام سا ہو انساں شاہان شاہ کوئی ہو
وہ جس پہ رحم کھائے وہ خاص ہے بہت ہی
دنیا میں کوئی بھی اب جائے اماں نہیں ہے
ہر کوئی کسی سے خائف کہاں نہیں ہے
لیکن نظر کو دل کو اُس سے بڑی اُمیدیں
مایوس اُس سے اب بھی اس کا جہاں نہیں ہے
(اسماء صدیقہ، کراچی)

☆☆☆

پریشاں حال ہیں سارے
غم و آلام کے مارے
اسی اک سوچ کو لے کر
یہ آخر کیسی آفت ہے
بلا کیسی یہ ٹوٹی ہے؟
کہ ہر سو ایک وحشت ہے
چلو تم کو بتاؤں میں
یہ قدرت کا وتیرہ ہے
کلام اللہ شاہد ہے
خدا کی سرزمیں پر جب
خدا کے باغی و سرکش
نہایت بدصفت بندے
خدا کے حکم کو پامال کرتے ہیں
بجائے، صالح اعمال
یا احسان کرنے کے
وہ بد اعمال کرتے ہیں
تو ایسے میں
زمیں بھونچال کھاتی ہے
پہاڑ ایسے لرزتے ہیں
بجائے آبشاروں کے
محض پتھر اُترتے ہیں
فلک سے مینہہ کے بدلے
فقط اولے برستے ہیں
اُلٹ جاتی کہیں پر بستیوں کی بستیاں ہیں تو
کہیں اک چیخ سے
جانیں نکلتی ہیں
کہیں اک دھاڑ
آلیتی ہے لوگوں کو
تو وہ اوندھے پڑے رہ جاتے ہیں
بے سُدھ
کہیں شکلیں بدلتی ہیں
بپھر جاتے سمندر اور دریا بہہ نکلتے ہیں
ہوائیں سرخ چلتی ہیں
کبھی طرح کے موسم بس
محض شعلے اگلتے ہیں
پکی فصلیں یکایک سوکھ جاتی ہیں
خدا کی نعمتیں بھی روٹھ جاتی ہیں
غرض ہر سمت سے جیسے بلائیں ٹوٹ پڑتی ہیں
وبائیں پھوٹ پڑتی ہیں
مگر اک آیۂ یونس
ہمیں یہ بھی بتاتی ہے
اگر انساں پلٹ آئے
خدائے مہرباں سے مغفرت مانگے
کرے توبہ گناہوں کی
سرِ تسلیم خم کر لے
خدا کی بارگاہ میں
قبولِ جرم کر کے گڑگڑائے، رحمتیں مانگے
طلب بخشش کرے رب سے
اور آئندہ نہ کوئی جرم کرنے کی قسم کھائے
تو سب غم، سب بلائیں اور وبائیں ٹل بھی سکتی ہیں
(عبدالباسط آدم گشکوری)

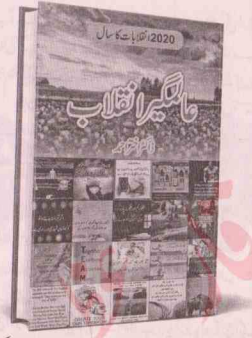

☆☆☆

کیسی حیرت کی بات ہے کہ سال ۲۰۲۰ میں کتنے انقلابات آئیں گے یہ کوئی نہیں جانتا تھا اور جب میں نے یہ کتاب پڑھنا شروع کی تو میں بھی آنے والے وقت سے بے خبر تھی۔ اس کتاب کا نام اتنا دلکش اور پُرکشش تھا کہ میں اسے پڑھے بغیر نہ رہ سکی۔ مجھے جاننا تھا کہ آخر اس کتاب میں کون سے انقلابات کی بات کی گئی جس سے ہم انجان تھے۔ شاید صدی کا سب سے بڑا انقلابی سال ہی ۲۰۲۰ ہے جس میں ہمیں کورونا، ٹڈی دل سمیت اور کئی عجیب و غریب بلاؤں سے واسطہ پڑا۔

ایسے میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ایسے عنوان والی کتاب ہاتھ آئے اور آپ اسے پڑھے بغیر سکون کا سانس لے سکیں۔ جیسے جیسے میں اس کا مطالعہ کرتی گئی ذہن میں بند سوچوں کی کھڑکیاں کھلتی گئیں اور کچھ دیر کے لیے میں دنیاوی معاملات و پریشانیوں سے جیسے کوسوں دُور چلی گئی۔ یہ کتاب بلاشبہ پہلے سے لے کر آخری صفحے تک کمال اور لاجواب ہے۔ اس کا موضوع ہمارے اندر کا انقلاب ہے۔ جب تک انسان اپنے اندر عظیم انقلاب نہیں لے آتا تب تک وہ دنیا کی بھول بھلیوں میں بے نام و نشاں پھرتا رہتا ہے۔

اسے پڑھنے سے زندگی کی نئی اُمید جاگتی ہے۔ مایوسیوں میں ڈوبے ہوئے افراد کو جینے کی راہ سجھائی دیتی ہے۔ آج کے دور میں ایسی کتاب یقیناً وقت کی اشد ضرورت ہے اور شاید مصنف نے یہ بھانپ لیا تھا اسی لیے انھوں نے عام انسان کی راہنمائی کے لیے اسے تخلیق کر ڈالا۔

یہ کتاب بتاتی ہے

☆ دنیا سے غربت اور جہالت کے خاتمے کے لیے قرآن کریم سے لیا گیا ایسا انقلابی لائحہ عمل جس پر عمل کرنے سے دنیا سے غربت اور جہالت کا خاتمہ ہو جائے گا۔

☆ وہ کون انقلاب انگیز لوگ ہیں جو وقت سے آگے ہوتے ہیں اور وہ خواب دیکھتے ہیں اور دنیا کو بدل کر رکھ دیتے ہیں۔ ایسے عظیم لوگوں کا تذکرہ یقیناً آپ کے اندر کامیابی کا جذبہ پیدا کر دے گا۔

اسلام دنیا کا واحد دین ہے جو تمام مذاہب کا خیر خواہ ہے اور کسی کا دشمن نہیں۔ اسے دینِ فطرت بھی اس لیے کہا جاتا ہے کیونکہ یہ انسانی فطرت کے قریب ترین ہے اور یہ واحد ایسا مذہب ہے جو انسان کی روح و جسم دونوں کو راہنمائی دیتا ہے۔

مثال کے طور پر ایک چھوٹا سا حکم قرآن پاک میں ہے کہ کھاؤ پیو مگر اصراف نہ کرو۔ یہ چھوٹا سا فقرہ میڈیکل سائنس کی سینکڑوں کتب پر بھاری ہے۔ اگر انسان اسلام کے بتائے اصولوں پر چلے تو کبھی بیمار نہ ہو۔

قرآن ہمیں یہ تعلیم دیتا ہے کہ صفائی نصف ایمان ہے۔ دنیا میں اگر بیماریوں کا جائزہ لیا جائے تو اس کی زیادہ وجہ گندا پانی، خراب آب و ہوا اور گندی خوراک ہے۔ اپنے جسم کی صفائی رکھ لینے سے ہی انسان ہزار بیماریوں سے محفوظ

ہوجاتا ہے۔

اس کتاب کا ایک نہایت اہم اور خوبصورت باب غیر مسلم دانشوروں کا انقلابات کی مقدس کتاب قرآن کی عظمت کا اعتراف ہے۔ بلاشبہ یہ سچ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی انسان خواہ وہ کسی بھی مذہب سے تعلق رکھتا ہو اگر قرآن سے روشنی حاصل کرے تو قرآن اس کی زندگی بدل کر رکھ دے گا۔ یہ واحد کتاب ہے جس کا مصنف کوئی انسان نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے الفاظ ہیں۔

مشہور جرمن ادیب گوئٹے کہتا ہے:

''میں ارادہ رکھتا ہوں کہ وہ رات عقیدت و احترام کے ساتھ مناؤں جس رات میں سیدنا محمد ﷺ پر قرآن نازل ہونے کی تکمیل ہوئی۔''

اس کتاب کا ایک اور بے حد اہمیت کا حامل باب آنے والی نسلوں کو گلوبل وارمنگ کے اثرات سے بچانے سے متعلق ہے۔ ہم سب نے دیکھا ہے کہ کورونا اور لاک ڈاؤن کے نتیجے میں ہماری نسل نو نے جس طرح کا خوبصورت اور شفاف ماحول دیکھا وہ اس سے پہلے انھیں نصیب نہ ہوا تھا۔ آسمان میں طرح طرح کے پرندوں کا اُڑنا بھی اس بات کا ثبوت تھا کہ گلوبل وارمنگ اور فضائی آلودگی کے بداثرات ہرذی حس پر اثر انداز ہوتے ہیں اور جب دھوئیں اور گرد و غبار کے بادل چھٹتے ہیں تو کیسی نکھری زندگی معلوم ہوتی ہے۔

ہمیں یہی زندگی اپنی آنے والی نسلوں کو دینا ہوگی۔ کسی لاک ڈاؤن کے نتیجے میں نہیں بلکہ ایک بہترین منصوبہ بندی کے ذریعے۔ گلوبل وارمنگ سے بچنے کے لیے ہم کئی طرح کے اقدامات کر سکتے اور اپنی آنے والی نسلوں کو خوبصورت دنیا دے سکتے ہیں۔

یوں تو تمام کتاب ہی بہترین موضوعات پر مبنی ہے لیکن وہ چیدہ چیدہ موضوعات جن پر قلم اُٹھانے کی آج کل شدت سے ضرورت ہے وہ تمام میں نے اس کتاب میں پائے ہیں۔

اب آتے ہیں اس کتاب کے سب سے دلچسپ حصے کی طرف جہاں آپ کو پوری دنیا کے عظیم لوگوں کی ایسی ایسی انقلاب انگیز نادر کہانیاں پڑھنے کو ملتی ہیں کہ آپ دنگ رہ جاتے ہیں۔

یہ ان لوگوں کی داستانیں ہیں جو زندگی میں مایوس نہیں ہوئے اور انھوں نے اپنی سوچ اور عمل کے یکساں تعاون سے اپنی راہیں خود استوار کیں اور دنیا میں نام روشن کیا۔

اگر آپ فوربس میگزین کی ویب سائٹ پر جا کر اب پتوں کی فہرست دیکھیں اور اس میں موجود نوجوانوں کی پروفائل نکال کر پڑھیں تو آپ کو ورجنوں ایسے ملیں گے جن کے خاندانی حالات ایک عام غریب اور ناکام انسان سے مختلف نہیں تھے لیکن انھوں نے اپنی دن رات کی محنت، مثبت سوچ اور عمل سے دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا اور آج ایک مطمئن، خوشحال اور کامیاب زندگی گزار رہے ہیں۔

ہر انجام کے بعد ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، جس طرح ہر رات کے بعد ایک روشن صبح ہوتی ہے۔ اسی طرح ایک مشکل دور کے بعد ایک دور خوشحالی کا آتا ہے۔ بہ قول ایک مفکر آپ کی زندگی کے دو دن بہت اہم ہیں۔ ایک وہ جب آپ پیدا ہوئے اور دوسرا وہ جب آپ کو یہ شعور آیا کہ میں کیوں پیدا ہوا؟ اس کتاب میں یہی کوشش کی گئی ہے کہ آپ میں وہ شعور اور آگہی پیدا ہو جائے جس کے بعد ہر انسان اپنے مقام کو بہتر معنوں میں پہچان سکتا ہے۔ ہر شخص میں ایک انقلاب خوابیدہ ہوتا ہے۔ اس انقلاب کو ضرور جگائیں۔ بقول ایک مفکر: 'اگر آپ چاند کو چھونا چاہیں اور اگر نہ چھو سکیں تو ستاروں کو ضرور چھو لیں گے۔'

اس خوبصورت کتاب کی قیمت صرف ۸۰۰ روپے ہے اور اپنی زندگی سنوارنے کا یہ سودا مہنگا نہیں۔ یہ خضر جاوید پریس کے زیر اہتمام شائع ہوئی اور مصنف ڈاکٹر اختر احمد سے براہ راست اس نمبر پر فون کر کے منگوائی جا سکتی ہے۔

◆◆◆ 03335242146

ضلع گورداسپور بھارت میں کیسے شامل ہوا؟

میری عمر تقریباً 74 سال ہے۔ ستے تھے کہ گورداسپور میں مسلمان اکثریت میں تھے، لہٰذا اسے پاکستان میں شامل ہونا چاہیے تھا لیکن قادیانیوں نے سازش کے تحت یہ موقف اپنایا کہ تقسیم چونکہ مذہب کی بنیاد پر ہو رہی ہے اور مسلمان ہمیں غیر مسلم کہتے ہیں، لہٰذا ہمیں (قادیانیوں کو) مسلمانوں میں سے تفریق کر دیں اس طرح مسلمان وہاں تعداد میں کم ہو گئے اور غیر مسلم معمولی فرق سے بڑھ گئے۔

یوں ضلع گورداسپور بھارت میں چلا گیا اور بھارت کو کشمیر کے لیے زمینی راستہ مل گیا اور پاکستان کو مسائل میں دھکیل دیا گیا۔

یہ بات میں نے 70-1969 کے لگ بھگ ہفت روزہ صفحہ نبوت انٹرنیشنل ملتان میں پڑھی تھی اس زمانے میں، میں ہفت روزہ کا خریدار تھا۔

اب مجھے وہ اعداد و شمار زبانی یاد نہیں۔ آپ سے درخواست ہے کہ کسی قریبی اشاعت میں اس موضوع پر قلم اٹھا کر قوم کی راہنمائی فرمائیں اور حقائق سے آگاہ کریں۔ شکریہ

(محمد نسیم، لاہور)

☆☆☆

ایک خط ..... صدر محترم کے نام

آپ کو اللہ پاک نے اس مملکت خداداد کا سربراہ اور حکمران بنایا ہے۔ آپ نے رعایا کے حالات معلوم کرنے کے لیے کوئی رابطہ نمبر کوئی عدل جہانگیر نما زنجیر نہیں رکھی تاکہ اس ملک کی مظلوم عوام اور سرکاری ملازم نہ آپ سے رابطہ کر کے فریاد کر سکیں تاکہ اُن کو اور تو پہنچ نہیں، کم از کم وقتی طور پر تسلی تو ہو جائے۔ کیا آپ نہیں جانتے کہ بیوروکریسی کتنی خودسر ہو چکی؟ کہ وہ نہ تو محتسب اعلیٰ کے فیصلوں کو کوئی اہمیت دیتی ہے اور نہ سرکاری ملازمت کی عدالتوں کے فیصلوں پر عمل درآمد کرتی ہے۔ بس ایک ہی رٹا رٹایا جواب ملتا ہے کہ فنڈ نہیں ہیں۔ یہ فرسودہ جواب پہلی حکومتوں میں بھی ہم سنتے آئے

ہیں۔ تحریک انصاف کی حکومت سے اُمید نہ تھی۔ ہمیں الحمدللہ سب کچھ ملتا ہے۔ نہیں ملتا تو انصاف نہیں ملتا۔ کیا آپ سے آپ کی رعایا کے بارے میں پوچھا نہ جائے گا۔ کیا ہم آپ کی رعایا نہیں ہیں۔ آپ ہمیں افتتاح کرتے نظر آتے ہیں یا سبکدوش ہونے والے سفیروں سے ملاقات کرتے اور نئے سفیروں کو خوش آمدید کہتے نظر آتے ہیں۔ کیا فارغ اوقات میں آپ مظلوم عوام کی دادرسی نہیں کر سکتے؟ کیا آپ جانتے ہیں کہ پاکستان ہیلتھ ریسرچ کونسل PHRC اسلام آباد کے 205 گھرانوں کی پنشن بددیانت افسران نے ایک سازش کے تحت بند کرا دی ہے۔ ان متاثرہ افراد میں بیوہ عورتیں اور یتیم بچے بھی شامل ہیں۔ کیا خوشامدی ٹولہ آپ کو A E E O.K کی رپورٹ دے کر آپ کو دھوکا نہیں دے رہا؟ آپ کو عوام سے دور رکھنے کا یہ بھی ایک حربہ ہے۔

خدارا چیک اینڈ بیلنس کی آہنی تلوار ان ظالموں کے سروں پر لٹکا کر ان سے مظلوم عوام کے ساتھ زیادتی کرنے سے توبہ کرائیں تاکہ یہ حرام خوری سے باز آ جائیں۔ مجھے معلوم ہے کہ آپ کے گرد منڈلانے والا خوش آمدیوں کا ٹولہ ہرگز آپ کو اصل حقائق سے آگاہ نہیں کرے گا۔

اللہ آپ کا حامی اور ناصر رہے مگر اتنا تو بتایئے کہ آپ کے عہدے کا کیا تقاضا ہے؟ آپ کب تبدیلی لائیں گے اور کب لوگوں کو انصاف ملے گا؟ میں معافی چاہتا ہوں۔ میری باتیں آپ کو کڑوی محسوس ہوں گی مگر عوام سے وفا کر کے اس کڑواہٹ کو مٹھاس میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ اگر میں نے یہ خط لکھ کر کوئی جرم کیا ہے، تو مجھے سزا دی جائے۔ آپ چونکہ ایک دینی اور مذہبی جذبات سے سرشار ہیں اور اپنی رعایا کے مجھ جیسے شہری کی کڑوی کسیلی باتوں کو نظرانداز کریں گے تاکہ میں آپ کو اور بہت سے اور حالات بھی بتاؤں کہ ملک میں کیا ہو رہا ہے؟ میرا اگلا موضوع بددیانت پٹوار سسٹم ہے۔ جو کمپیوٹرائزڈ ہونے کے باوجود ایسے گُل کھلا رہا ہے کہ جنہیں سن کر آپ یہ کہنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ یہ لوگ اب ایمانداری کا لبادہ اوڑھ کر اپنی رشوت کو فیس کا نام دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ فیس اُن کی ہے اور اتنی فیس نائب تحصیلدار صاحب کی اور گرداور کی فیس علیحدہ ہے اور انتقال کی اتنی فیس گورنمنٹ کی ہے، جو کافی زیادہ ہے۔ پہلے ایک غریب آدمی چھ مرلے زمین آسانی سے خرید سکتا تھا اور بیچ سکتا تھا۔ اب اشٹام رجسٹری پر سب جھوٹ لکھا ہوتا ہے۔ زمین لاکھوں کے ریٹ سے بکتی ہے مگر پراپرٹی ڈیلر بہت ہی کم قیمت پر فروخت کرتے ہیں اور یوں گورنمنٹ کی فیس کم ہو جاتی ہے۔ یہ سراسر دھوکا دہی ہے۔ کیا حکومت اس طرف توجہ دے گی؟

تیسرا مسئلہ جو صدر محترم کی خدمت میں لانا چاہتا ہوں۔ وہ یہ کہ نجی اسکولوں کے لیے ایک جیسا آئین اور قانون بنائے جائیں۔ اسکول کا مالک اپنے آپ کو پرنسپل کہتا ہے، مگر اس کی تعلیمی قابلیت اتنی نہیں ہوتی اُس کے اسکول میں پی ایچ ڈی اور ایم فل اساتذہ ہوتے ہیں۔ جن کو وہ صرف لیکچرر ہی کہتا ہے۔ ہائیر ایجوکیشن کمیشن بھی اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ سول اسکولوں میں ایسا ہوتا ہے جبکہ سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں پروفیسر بننے سے پہلے لیکچرز۔ اسسٹنٹ پروفیسر۔ ایسوسی ایٹ پروفیسر اور پھر پروفیسر اور پرنسپل کی باری آتی۔ میٹرک پاس اسکولوں کے مالک اپنے آپ کو اسٹاف سے پرنسپل کہلوانا پسند کرتے ہیں۔ اسٹاف کی مجبوری ہوتی ہے۔ انھیں ملازمت بچانے کے لیے پرنسپل کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ میں اپنا مضمون ختم کرتا ہوں۔ ''انجام چمن کیا ہو گا؟''

☆☆☆

شفاف پاکستان خوشحال پاکستان

وقت کی لوح پر تاریخِ نو رقم ہوئی۔ یہ مملکتِ خداداد جس

کی جبیں پر اسلامی جمہوریہ پاکستان اور لاالہ الااللہ کندہ ہے، ماہ مقدس کی پُرنور ساعتوں میں یہ جنتِ نظیر خطہ مسلمانانِ برصغیر کی فقیدالمثال قربانیوں کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آیا۔ یہ چار موسموں، گنگناتے دریاؤں، ناپیدا کنار سمندروں، وسیع و عریض صحراؤں، فلک شگاف کوہستانوں، سرسبز و شاداب میدانوں اور سفید پوش برفستانوں کا مسکن ہے۔ یہ ذہین دماغوں اور نہ تھکنے والے بازوؤں کے فکر و عمل کا حاصل ہے۔ یہ ہر حرم کا پاسبان، اسلام کا قلعہ اور تجربہ گاہ ہے۔ اس کی فکری و نظریاتی اساس قرآن و سنت ہے۔ ہر نوع کی بدعنوانی سے پاک ہمہ گیر شفافیت کی حامل اسلامی فلاحی ریاست کا قیام یہاں کے باشندوں کا مطمحِ نظر ہے مگر ہر ذی شعور کو بصد ندامت اعتراف ہے کہ اس خواب و خیال کو 70 سال سے زائد کا عرصہ بیت جانے کے باوجود حقیقت کا روپ نہیں دیا جا سکا۔

ارضِ پاک پر مسلط ہونے والی بیوروکریسی اشرفیہ اور حکمران طبقے تک نے اس کو مالیاتی، نظریاتی، ادارہ جاتی اور انتخابی بدعنوانی سے بری طرح آلودہ کر دیا ہے۔ نام نہاد دانشوروں اور علمائے سوء نے علمی و اخلاقی بدعنوانی کو عام کرنے میں کوئی کسر اُٹھا نہ رکھی۔ شخصی و قومی اعتبار و وقار عالمِ نزع میں ہے۔ تمام سرکاری و نجی ادارے اور تمام شعبۂ جات اس وبا عام میں مبتلا ہو چکے۔ ہر سطح پر مقدار و معیار کے پیمانے ٹوٹ چکے۔ ترقی معکوس کا سفر ختم ہونے کا نام نہیں لے رہا۔ عدیم ہاشمی کے الفاظ میں ''زوال آئے تو پورے کمال میں آئے'' کا عملی منظر آنکھوں کے سامنے ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان ''مسائلستان'' بن چکا۔ لوگوں کا معیارِ زندگی آئے دن فروتر ہوتا جا رہا ہے۔ بنیادی نوعیت کی ضروریات و سہولیات ناپید ہیں۔ مہنگائی اور بیروزگاری کا غریب کش عفریت دندناتا پھر رہا ہے۔ چور بازاری، کذب بیانی، رشوت ستانی، بے یقینی، محرومی، مایوسی، بداخلاقی اور عدم احساسِ تحفظ امیر کشی اور غریب کشی میں بدستور اضافہ ہو رہا ہے۔ طبقاتی تفریق نے اتحادِ قومی کی چولیں ہلا رکھی ہیں۔ بین الاقوامی منظرنامے پر ہماری شناخت اور ساکھ غریب کی جورو سے کچھ زیادہ نہیں۔ ان تمام مسائل اور رذائل کے محرکات کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو ان سب میں قدرِ مشترک ''عدم شفافیت'' ہے۔ فکری و عملی، انفرادی و قومی نیز حکومتی عوامی و حکومتی سطح پر شفافیت کا جوہر شاذ بلکہ معدوم نظر آتا ہے۔

انسانی مطالعے، مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں یہ بات حقیقت ہے کہ ہمہ گیر شفافیت ہی ہمہ جہت خوشحالی اور تعمیر و ترقی کی ضامن ہے۔ شفافیت کے بغیر خوشحالی کا حصول کریلے کی بیل سے خوشۂ انگور کی توقع رکھنے کے مترادف ہے لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر سطح پر ہمہ نوعی شفافیت کو یقینی بنایا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے شخصی اور قومی کردار کی تعمیر کی جائے۔ جذبہ حب الوطنی اُجاگر کیا جائے۔ بے لاگ احتساب کو رواج دیا جائے۔ اسلامی اقدار و تعلیمات کو قومی مزاج اور شعور کا حصہ بنایا جائے۔ ہر فرد کو ملت کے مقدر کا ستارہ سمجھتے ہوئے فرد کی تربیت کا اہتمام کیا جائے۔ ذرائع ابلاغ اور دیگر رجحان ساز اداروں کو اس ضمن میں قائدانہ اور معلمانہ کردار ادا کرنا ہو گا، نیز قومی اداروں کو سیاست سے پاک کیا جائے۔ استحقاق اور اہلیت کی بنیاد پر عہدوں اور وسائل کی تقسیم کار کو یقینی بنایا جائے۔

یاد رہے کہ شفافیت کے جادہ مستقیم پر چل کر ہی خوشحالی کی منزل کو پایا جا سکتا ہے، بصورت دیگر خوشحالی کا حصول خوش فہمی، خوش خیالی اور ''ایں خیال است و محال است و جنوں'' کے سوا کچھ نہیں۔

(ملک اسماعیل۔ خیرال)

☆☆☆

(ایوب خاور)

''خود کلامی''

☆ آئسولیشن میں ایک مریض اپنے ہمزاد سے ☆

اگر ہم ایک ہیں
تو پھر
ہمیں ڈرنا نہیں
لڑنا ہے، ایک ان دیکھے دشمن سے
جو خیمہ زن ہے، میرے اور تمہارے جسم کے خُلیوں کے
اردگرد
اپنی سانس روکے
ٹکٹکی باندھے
مسلسل گھورتا جاتا ہے ہم کو، چاروں سمتوں سے
نڈر، چالاک اور ماہر شکاری کی طرح سے
منجمد کرتا چلا جاتا ہے میری اور تمہاری ہر رگِ جاں کو
مگر نظروں کے قابو میں نہیں آتا
اگر ہم ایک ہیں
تو پھر

مرے بھائی
ہم اپنی مشترک تنہائی اوڑھے
آئسولیشن کے در و دیوار سے چپکے ہوئے
بے مہر سناٹے کی ٹک ٹک میں
جگر کو تھام کر، سانسوں کے بے ترتیب وقفوں میں
جمع کرتے رہیں گے اپنی ہمت آخری دم تک
اگر ہم ایک ہیں
تو پھر
صرف لڑنا اور بچنا بھی نہیں ہے
مارنا ہے
اس کرونے، اس گھناؤنے وائرس کو مارنا ہے

....

ادھر دیکھو!
حواسِ خمسہ کو ترتیب دو بھائی
ہوئے ہم ایک تو پھر
اس کے ان دیکھے بدن میں گاڑ دیں گے سارے
مل جُل کر، کروڑوں انگلیوں کے تیز خنجر
بالآخر اس ''وبالِ جاں'' وبا کی ہر نشانی کو مٹادیں گے
وہاں سے بھی
جہاں کی تجربہ گاہوں میں بوئی اور پھر کاٹی گئی
پھر ساری دنیا کے غریبوں اور امیروں میں
مساوی طور پر بانٹا گیا اس کو!

☆☆☆

انعم توصیف

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
''اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طریقوں سے مت کھاؤ۔'' (سورۃ النساء)

پہلا قدم

Pakistanipoint

آمنہ بیٹھی اپنا سبق یاد کر رہی تھی۔ اس آیت پہ پہنچ کر وہ ٹھٹک کر رک گئی۔

''آپی! سب کتنا پریشان ہو رہے ہیں آپ کی شادی کی وجہ سے۔ سلمان بھائی کے گھر والوں کے مطالبات ختم ہی نہیں ہو رہے۔ ان کا یوں جہیز کے سامان کی فہرست دینا۔ کیا یہ ناحق طریقے سے مال کھانا نہیں؟

عطیہ کے پاس اس کی بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

''بابا کو دیکھ دیکھ کر میرا ابھی بہت دل دُکھتا ہے۔ کبھی کسی سے قرض کی درخواست تو کبھی کسی کے آگے منتیں کرنا۔'' نم آنکھوں سے عطیہ کہنے لگی۔

''آپی! بیٹیاں واقعی ماں باپ پر بوجھ بن کر ان کے

جہیز کی نحوست کب تک والدین کو رونے سسکنے پر مجبور کرتی رہے گی...؟

کاندھے جھکا دیتی ہیں۔ میں تو شادی ہی نہیں کروں گی۔''
آمنہ دکھ سے گویا ہوئی۔

''ایسا نہیں کہتے بے وقوف لڑکی! امی ابا پہلے رشتے کے لیے پریشان تھے۔ اب رشتہ ہو گیا تو اس جہیز کی وجہ سے۔'' ایک سرد آہ بھرتے ہوئے عطیہ نے سر جھٹکا۔

☆☆☆

ہمارا معاشرہ جن بے شمار مسائل میں گھرا ہوا ہے۔ ان میں سے ایک اہم مسئلہ ''جہیز'' ہے۔ ہم کہہ تو دیتے ہیں کہ جہیز ایک لعنت ہے لیکن اس لعنت کا سدِ باب ہم تلاش نہیں کرتے۔ یہی وجہ کہ یہ اب ناسور کی صورت اختیار کر چکا۔

والدین جہاں لڑکیوں کی شادی کے لیے پریشان رہتے ہیں، وہیں مناسب رشتہ مل جانے کے بعد بھی انھیں سکھ نصیب نہیں ہوتا۔ نکاح کو شریعت نے کس قدر آسان بنایا ہے، اس کا ہم سب کو ہی اندازہ ہے لیکن دین سے دُوری اور ظاہری شان و شوکت کی بنا پر نکاح جیسا مقدس بندھن باندھنے کے لیے بہت سے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں۔

لڑکے والوں کی طرف سے مختلف اور جدید چیزوں کی مانگ نہ صرف والدین کی کمر جھکا دیتی بلکہ بعض اوقات رشتہ ختم ہونے کی نوبت بھی آ جاتی ہے۔ میں نے اس جہیز جیسی نحوست کی وجہ سے لڑکیوں کے والدین کو روتے سسکتے دیکھا ہے۔ قرض پر قرض چڑھ رہا مگر لڑکے والوں کی فرمائش پوری کرنا بھی ضروری ہے۔ کہیں عزت کا سوال ہے تو کہیں رشتہ ختم نہ ہو جائے، یہ خوف دامن گیر رہتا ہے۔ لڑکے والے فرمائشیں بھی ایسی چیزوں کی کرتے ہیں کہ جنہیں رکھنے کی ان کی اپنی اوقات بھی نہیں ہوتی۔ طرّہ یہ کہ سینا تان کر چلتے ہیں۔ (ایسے بھکاری جو بھیک مانگ کر اس پر اکڑتے ہوں)

جدید طرز کا فرنیچر، ڈھیروں کپڑے، سونے کا سیٹ، سونے کی چوڑیاں، فریج، ٹیلیویژن، برتن، الیکٹرونک کا سامان یہ سب تو عام چیزیں ہیں۔ ان میں سے تو کوئی چیز کم ہونی ہی نہیں چاہیے کیونکہ لڑکی تو بیاہ کر مریخ پر جا رہی ہے۔ جہاں ویرانی ہی ویرانی ہے اور اس کے سامان سے ہی نئی دنیا بسے گی اور لڑکا شاید اس قابل بھی نہیں کہ گھر میں چند چیزیں اپنی پیسے کی لا سکے۔

ساتھ اماں کا جوڑا، ابا کا جوڑا، نندوں کے، نندوئی کے، جیٹھ جٹھانی، دیور دیورانی الانہ فلانہ پورے خاندان کے لیے کوئی نا کوئی تحفہ بھی لازمی ہونا چاہیے۔ شادی سے پہلے چاہے لڑکے نے بسوں کے دھکے کھائے ہوں لیکن شادی کے وقت موٹر سائیکل نہ ہونے کا غم یاد آ جاتا ہے اور اس بوجھ کو لڑکی کے والدین کے کندھوں پر ڈال کر بے غم ہوا جاتا ہے۔ اکثر لڑکوں کو شادی کے بعد موٹر سائیکل یا گاڑی چلانا سیکھتے ہوئے بھی دیکھا گیا۔ کہ اصلیت یہ ہوتی ہے ان کی۔ اپنی تمام محرومیوں کا ازالہ لڑکی کے جہیز سے کیا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ کئی گھروں میں لڑکے کے کمرے میں شادی سے پہلے زمینی بستر استعمال ہوتے ہیں کہ جب بیٹے کی شادی ہو گی تب بیڈ لڑکی لے کر آئے گی۔ تف ہے ایسی ذہنیت پر۔ اس کے باوجود چوری اُوپر سے سینہ زوری کا یہ عالم کہ لڑکی شادی کے بعد بھی طرح طرح کے طعنے سنتی ہے کہ یہ نہیں لائی اور وہ نہیں لائی۔

مرد کے اندر کی انا و خودداری ایسے وقت پر کہاں مر جاتی ہے؟ جب وہ اپنی بیوی کی لائی چیزیں استعمال کرتا ہے۔ کیا اسے عار محسوس نہیں ہوتی؟

ہم یہ سوچ سکتے ہیں کہ شاید غلطی اس میں مرد کی بھی نہیں۔ اس نے بھی اپنی بہن کی شادی پر یہی سب کچھ دیا ہو گا، اس لیے اب وہ اس جہیز کو اپنا حق سمجھ کر وصول کرتا ہے۔ سوچنے کی بات صرف اتنی ہے کہ جو تکلیف اس نے اپنی بہن کی شادی کے وقت اُٹھائی، کم از کم اسے اس اذیت کا احساس ہونا چاہیے اور خود کسی کی تکلیف کی وجہ بننے سے گریز کرنا چاہیے۔ کب تک اپنی بہنوں پر کیے جانے والے خرچے کا ازالہ دوسروں

کی بیٹی سے وصول کرتے رہیں گے۔ اس سلسلے کو کبھی تو کوئی پہلا قدم اُٹھا کر روکے۔ یہ پوری ایک زنجیر (Chain) بن چکی جس نے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں جکڑ رکھا ہے۔

ایک دوسری بگڑی شکل اس لعنت کی یہ ہے کہ اگر لڑکے والے کچھ نہ مانگیں تب بھی والدین کو بسا اوقات اپنی نمود و نمائش دکھانا مقصود ہوتی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ ایک ہی تو لاڈلی بیٹی یا بہن ہے۔ اس کی شادی پر ارمان نہ نکالے تو کیا فائدہ ایسی دولت کا۔ اس سے ان کے دو مقاصد پورے ہوتے ہیں۔ ایک تو شان و شوکت میں اضافہ، دوسرے لڑکا تمام عمر ان سے دبتا ہے اور ان کی بیٹی اسے اپنے اشاروں پر چلاتی ہے۔

اس برائی کا سدّ باب کرنے میں سب سے اہم کردار آپ کی تربیت ہی ادا کر سکتی ہے۔ نوجوان لڑکوں کے ذہن میں جہیز کی نفرت بٹھائی جائے۔ انھیں کسی اور کے پیسوں سے لی ہوئی چیزیں برتنے میں شرم دلائی جائے اور انھیں ایسا کرنے میں عار محسوس ہو۔

شادی کے مواقع پر بے جا رسومات جیسے مہندی، مایوں، ڈھولک، نکاح الگ، بارات الگ (یہ عجیب طریقہ کار بھی اب زور پکڑتا جا رہا) کے بجائے صرف شادی اور ولیمے کی رسم ادا کی جائے۔ ولیمے کی لمبی چوڑی تقریب کے بجائے قریبی افراد خصوصاً وہ رشتے دار جو مالی حیثیت میں کچھ کم ہوں، کو اس خوشی کے موقع پر مدعو کیا جائے۔ جو پیسے ان فضول رسومات سے بچیں، اس میں ایک فرنیچر سیٹ تو باآسانی آ سکتا ہے۔ جس کی سب سے زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ باقی چیزیں جو آپ کے گھر میں ہیں وہی آپ کی بیوی بھی استعمال کر سکتی ہے۔ ورنہ چیزیں تو شادی کے بعد بھی آہستہ آہستہ آ سکتی ہیں۔ آپ اچھا اور نیک قدم اُٹھائیں گے تو یقین کیجیے اللہ بھی آپ کی خوب مدد کرے گا۔ آپ جہیز لینے سے انکار کریں گے تو کل کو آپ کی بہن، بیٹی کو بھی اللہ ایسے لوگوں سے ملوائے گا جو آپ کے لیے آسانی پیدا کریں گے۔

میں نے ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں جو جہیز کو صرف لعنت سمجھتے ہی نہیں بلکہ واقعی اس سے بچتے بھی ہیں۔ ان پہ رزق کی برسات ہوتے بھی دیکھی ہے۔ کسی کو تکلیف پہنچا کر لیا ہوا سامان کب تک چل سکتا ہے؟ کیا والدین کا اپنے جگر کا گوشہ آپ کی جھولی میں ڈال دینا کافی نہیں؟ جو زندگی بھر آپ کی خدمت کرتی اور آپ کا ساتھ نبھاتی ہے، بغیر کسی لالچ کے۔

نکاح کے دو بول وہ طاقت ہیں جو ایک عورت کو اپنا گھر بار چھوڑ کر ایک اجنبی کے ساتھ زندگی گزارنے پر آمادہ کرتے ہیں۔ لڑکیاں بوجھ نہیں ہوتیں لیکن بنا دی جاتی ہیں۔

خدارا ہوش کے ناخن لیں۔ اس رسم کو جہاں تک ممکن ہو ختم کرنے کی کوشش کیجیے۔ یہ مت سوچیے کہ میں ہی کیوں؟ کوئی اور کیوں نہیں؟ کسی نہ کسی کو تو پہلا قدم اُٹھانا ہی ہو گا۔ تو وہ آپ کیوں نہیں؟؟

◆●●

جہیز ایک ناسور ہے جو ہمارے معاشرے میں کینسر کی طرح پھیل چکا۔ اس لعنت نے لاکھوں بہنوں اور بیٹیوں کی زندگی کو جہنم بنا رکھا ہے۔ ان کی معصوم آنکھوں میں بسنے والے رنگین خواب چھین لیے اور ان کی آرزوؤں، تمناؤں اور حسین زندگی کے سپنوں کا گلا گھونٹ دیا ہے۔ انھیں نا اُمیدی، مایوسی اور اندھیروں کی ان گہری وادیوں میں دھکیل دیا ہے جہاں سے اُجالے کا سفر ناممکن ہو چکا۔

اس لعنت نے موجودہ دور میں ایسے پھن پھیلا لیے کہ غریب گھروں کی لڑکیاں شادی سے محروم اپنی چار دیواری میں بیٹھی رہنے پر مجبور ہیں۔ جہیز ایک غلط اور فطرت کے خلاف رسم ہے۔ آج اس رسم نے جو قبیح صورت اختیار کر لی ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔

(ماہین چودھری)

	IV. Body Construction All wledded mild steel construction to match with multi loader vehicales. V. Floor. Floor fabricated with 5-mm thick M.S Steel reinfroced by channel VI. Side Valve. Side valve fabricated with 3-mm thick M.S sheet reinfroced by channel Rear Tail Gate. VII. Front. Front side fabricated with 3mm thick M.S sheet reinfroced by channel Rear Tail Gate. VII. The Container is equipped with 4 mnos of KLock.			
2-3	**SUPPLY OF CONTAINER SMALL SIZE FOR COLLECTION OF SOLID WASTE MC LALIAN** CONTAINER 2.5x5x3.5-ft-30.62 CFT General The 2.5x5x3.5 Container is manufactured from Meild Steel Frame and G,.I Sheet with 3-Nos Moveable Tyres and Handle for pulling the Container by manually Capacity. 2.5x3.5x3.5x.3.5-30.62-CFT Body Type. G,.I Sheet 14-SWG Side wall. G,.I Sheet 16-SWG Lifting Hook. M.S Pipe 1.50' dia Handle type Moving Type. Having –Nos Tyres front type pvc is rotatable and 2-nos Typre fixed.	1 no		=

IPL - 4312

چیف آفیسر
میونسپل کمیٹی لالیاں

الشہر
اسسٹنٹ کمشنر ایڈمنسٹریشن

	Bucket with Digging Teeth X. Bucket Volume: 1 Cubic Meter XI. Lifting Time 3-6 Second XII. Maximum lift Capacity: 1000KG XIII. Operation Hydraulic XIV. Lift Ram 2, double acting etc.			
	SUPPLY OF LIFTER FOR CARRIAGE CONTAINER MC LALIAN SPECIFICATION OF LIFTER Power 136- PSI Torque 38-KG-M Clutch 300-mm-Hydraulic Electrical Batteries 2x12-V Wheel and Tyre 7-50-16-14 PR Fule Tank 100 Ltr GVW 7200-KG on 6 Tyre Control for tipping & lowering located in driver's cabin steel body Automatic Cylinder Heavy steel body Automatic tailgate opening on lifting Closed coupled hydraulic pump to avoid mechanical complexity.	1 no		=
2-2	**SUPPLY OF CONTAINER LARGE SIZE FOR COLLECTION OF SOLID WASTE MC LALIAN** SPECIFICATION OF CONTAINERS: I. General: The 2.5 3-m-3 Container is manufactured from, Mield Steel from and mield steel and is computable with multi loader vehicales having following feature. II. Capacity 3.5 3mm3 III. Body Type Multi Loader open type	1 no	5.0	=

از دفتر میونسپل کمیٹی لالیاں

کوٹیشن مطلوب

میونسپل کمیٹی لالیاں کو درج ذیل کاموں کے لیے/ سپلائی برائے پنجاب میونسپل سروسز پروگرام سال 2020-2019 (فیز1) کے لیے درج ذیل آئیٹم کی سپلائی کے لیے رجسٹرڈ گورنمنٹ آف پنجاب کی مینوفیکچرنگ کمپنی/ سیلز ٹیکس دہندہ پیپر اورلز (سنگل سٹیج ٹو انویلپ/ ٹیکنکل پروپوزل + فنانس پروپوزل) کے تحت کوٹیشن درکار ہیں جو کہ مورخہ 2020-06-15 بوقت 1:30 بجے دوپہر تک وصول کی جائیں گی اور اسی روز مورخہ 2020-06-15 کو بوقت 2:00 بجے دوپہر حاضر آمدہ کوٹیشن دہندگان یا ان کے نمائندگان کی موجودگی میں دفتر میونسپل کمیٹی لالیاں میں کھولی جائیں گی۔ ہر کام کے لیے نیچے درج شدہ زر ضمانت کسی بھی شیڈول بینک سے کاڈیپازٹ کی صورت میں بحق میونسپل کمیٹی لالیاں میں دی گئی کوٹیشن کے ساتھ منسلک کرنا ضروری ہے۔ کوٹیشن بذریعہ ڈاک/TCS وصول نہیں کی جائے گی۔ مشروط کوٹیشن یا جن کے ہمراہ ضمانت (کال ڈیپازٹ) درج شدہ سے کم ہو یا شیڈول بینک کی جاری کردہ ہو یا اصل CDR لف نہ ہو تو کوٹیشن مسترد کر دی جائے گی۔ تاریخ اور وقت مقررہ کے بعد وصول ہونے والی، مشکوک اور کٹی پھٹی کوٹیشن بھی قابل قبول نہ ہوگی۔ ہر آئیٹم کا ریٹ صحیح علیحدہ علیحدہ درج کرنا ضروری ہے۔

نوٹ:۔ گورنمنٹ تمام ٹیکسز بذمہ کوٹیشن دہندہ ہوں گے۔ دیگر تمام تفصیلات میونسپل آفیسر (آئی اینڈ ایس) سے دفتری اوقات کار میں کسی بھی وقت ملاحظہ کی جاسکتی ہیں۔ تفصیل درج ذیل ہے۔

Sr No.	Name of Qutation (PMSP-1)	Qty.	Earnest Money Rs.	Time Limit as Per Work Supply Order
1	**Supply of Tractor 75 HP with front end loader MC** SPECIFICATION: I.maximum Engine Power: 2200rpm 75-HP II.Make Type: Perkins/4.41 II. No Cylinder: 4 III. Injection: Direct IV. Bore: 101 mm VII. Capacity: 4.11 VIII. Compression Ratio: 15.3:1 etc FRONT END LOADER: IX. Bucket Types: Closed earth	1 no	1.0 Lac	=

ناولٹ

عِشق جُنوں پیشہ

ماہ رخ ارباب

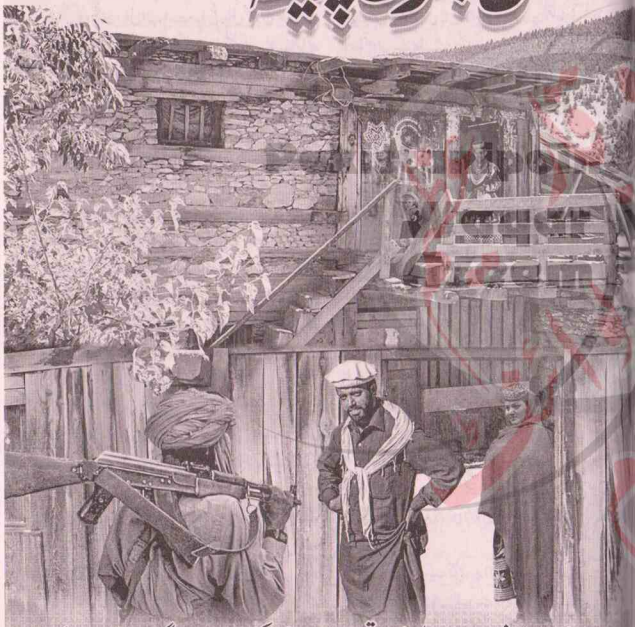

روایتوں کے قیدی دشمنیاں سنبھالنے کے شوقین، حالات کے شکنجوں میں پھنسے لوگ جب فطرت کے زیرِ اثر آتے ہیں تو اُن کی ضد جیتتی ہے یا فطرت... اسی نقطے کے گرد گھومتی ایک داستان محبت

اس نے آسمان کی جانب نگاہ کی۔ سرمئی بادل کسی بھی وقت چھلک پڑنے کو بے تاب تھے اور یہ بے موسم کی پہلی برف باری ہوتی جس کے شروع ہوتے ہی وہ گھر میں قید ہو جاتی۔ اس کے خاوند کی شہر جانے سے پیشتر، پرزور لہجے میں کرائی گئی یقین دہانی اب اسے دروغ بیانی محسوس ہونے لگی تھی۔ سردیوں کے لیے خشک لکڑیاں اکٹھی کرنے کے ساتھ ساتھ اسے اب ایک اور پریشانی بھی تنگ کرنے لگی تھی کہ اگر برف باری شروع ہو گئی تو شہر اپنے مویشیوں کا سودا کرنے گیا اس کا خاوند سفیر گل واپس کیونکر آ پائے گا؟ راستوں پر موجود خطرناک گھاٹیاں برف سے ڈھک جاتیں اور کوئی بھی انجان مسافر اس پوشیدہ قاتل کا شکار بن سکتا تھا۔

ابھی اسے گھر واپس جا کر، سکھایا گیا گوشت بھی محفوظ کر کے رکھنا تھا۔ اس کا بیٹا گھر میں اکیلا تھا اور وہ خود بھی اس موسم میں تنہا کام کرنے پر مجبور تھی۔ یہ تنہائی کی زندگی بعض اوقات اسے اُکتاہٹ میں مبتلا کرنے لگتی۔ یہاں آس پاس سوائے مہیب تنہائی کے اور کچھ نہیں تھا۔ وہ انسانوں کی صورت دیکھنے کے لیے ترس جاتی۔ سب سے نزدیک ترین پڑوسی گاؤں بھی دو دن کی مسافت پر واقع تھا۔

اس کا گھر ایک ہری بھری پہاڑی ڈھلان پر کچھ اس طرح بنا تھا کہ، پہلی بار میں اسے دیکھ پانا ناممکن تھا۔ ویسے بھی اس چھوٹی سی وادی میں دشوار راستوں پر سفر کر کے آنے کا کشٹ کوئی اُٹھاتا بھی کیوں؟ شادی کے ابتدائی دنوں میں وہ بہت خوش تھی۔ اس کا خاوند علاقے کے دوسرے مردوں کے مقابلے میں ایک نرم خو اور اچھا انسان تھا۔ وہ شہر کی رہائشی اور دسویں کا امتحان دے کر فارغ تھی جب اسے رخصت کیا گیا۔

سسرال اسی شہر میں ہونے کے سبب اسے ابتدا میں کچھ زیادہ تبدیلی محسوس نہ ہوئی اور وہ بہت جلد نئے ماحول میں گھل مل گئی۔ ایک دن جانے سفیر کو کیا سوجھی کہ وہ اچھا بھلا گھر اور کاروبار فروخت کر اس ویرانے میں آن بسا۔ مویشی پالنا اور کاشت کاری اس کا خاندانی پیشہ تھا۔ وہ اس علاقے میں آسانی سے اُگنے والی چند سبزیاں کاشت کر لیتا اور مویشی پالتا جنھیں ہر سال تعداد بڑھنے پر شہر جا کر فروخت کر دیا کرتا۔

باپ کی یاد آئی تو اسے ماں کا جھریوں بھرا چہرہ بھی یاد آ گیا۔ اس کی آنکھوں میں موتیوں کی صورت جھلملاتی شفقت اور ہاتھوں کے بوڑھے نرم لمس کو یاد کرتے ہی ترستے دل میں ہوک سی اُٹھی۔ اس نے ایک گہری سانس خارج کی اور تیز تیز ہاتھ چلاتے ہوئے درختوں کی گری ٹہنیاں سمیٹنے لگی۔ پیر ایک خشک ٹہنی پر پڑا تو چرچراہٹ کی آواز پیدا ہوئی۔ وہ ٹھٹھک کر رک گئی۔ خشک پتوں میں دبا وہ ایک نشان ایک عام سا گھوڑے کے سم کا تھا مگر اس جگہ ایسا نشان موجود ہونا خطرے کی علامت تھا۔ اس نے بدک کر دائیں بائیں دیکھا۔ دور تک پھیلے درختوں کے درمیان سرسراتی ہواؤں اور گہرے بادلوں سے گرتی تاریکی کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔

فضا میں نباتات کی مہک تھی۔ جس میں اس وقت وہ گھری کھڑی تھی۔ اسے شام ڈھلنے سے پہلے گھر پہنچنا تھا اور وقت مزید تحقیق میں ضائع نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس نے ہاتھ میں موجود لکڑیوں کو ڈور باندھ کر رکھے گئے گٹھڑ میں گھسایا اور اسے دو رسیوں کی مدد سے کسی بستے کی طرح پشت پر لاد لیا۔ سرد موسم اپنی موجودگی کا بخوبی احساس دلا رہا تھا۔ بھاری بھر کم لباس اور اس پر لادی گئی اونی شال کے باوجود سرد ہوا، درختوں کے جھنڈ سے باہر نکلتے ہی کسی برچھی کے مانند جسم سے پار ہونے لگی یا شاید وہ کسی انہونی کا خوف تھا جو اس پر حاوی تھا۔

گھر کے نزدیک پہنچنے پر اس کے خدشات پھر سے سر اُٹھانے لگے جب وہاں ایک سے زائد گھوڑوں کے سموں کے نشانات نظر آئے۔ اس نے چلنے کی رفتار بڑھا دی۔ وہ اس قدر تیز چل رہی تھی کہ بادی النظر میں کسی بھی دیکھنے والے کو اس پر دوڑنے کا گمان ہوتا۔ سر پر رکھے گٹھے کو مضبوطی سے تھامے، وہ

چڑھائی پر بنے اپنے اُس کیبن تک بڑھتی چلی گئی جو دو کمروں، باورچی خانے اور چھوٹے سے غسل خانے پر مشتمل تھا۔ چھوٹا مگر خوب مضبوط لکڑی کا بنا ہوا وہ خوبصورت سا مکان اس کے خاوند نے قریبی گاؤں سے مزدور بلوا کر اور خود ان کے ساتھ مل کر تعمیر کیا تھا۔ گھر کے ساتھ متصل ایک بڑا سا احاطہ تھا۔ مویشیوں کے لیے بنائے گئے اس باڑے میں اناج اور لکڑی ذخیرہ کرنے کی بھی کافی جگہ موجود تھی۔ اس نے دروازے کے سامنے بنے لکڑی کے چوبی برآمدے پر چڑھ کر لکڑی کا گٹھا ایک جانب پھینکا اور آہستہ سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اس نے باہر کنڈی چڑھانے کے علاوہ بچے کو اندر سے بھی کنڈی چڑھانے کی ہدایت کر دی تھی۔

اپنی دستک کے جواب میں کوئی آہٹ نہ پا کر اس نے آہستگی سے کنڈی ہٹائی اور لکڑی کے بنے بھاری دروازے کو دھکیلا۔ زنگ آلود قبضے ایک آواز کے ساتھ کھلتے چلے گئے۔ ابھی اسے اپنے لڑکے کی حالت دیکھتے ہوئے اس کے لیے کچھ رقیق خوراک بھی تیار کرنی تھی۔ سر پر بندھا اضافی کپڑا ایک کھونٹی پر لٹکاتی، وہ اس کے سرہانے آ کھڑی ہوئی۔ معصوم بچے کا ننھا سا سفید چہرہ بخار کی حدت سے سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے آتشدان میں مزید لکڑیاں جھونکیں تو شعلوں کا دھیما پڑتا رقص پھر سے تیز ہو گیا۔

بچے کا نام رحمت سفیر گل نے اپنے دادا کے نام پر رکھا تھا۔ لوئی کو بستر کے کناروں میں اُڑستے ہوئے وہ اس کے نزدیک جا بیٹھی۔ ننھا سا ماتھا کسی بھٹی کی مانند تپ رہا تھا۔ اس نے پُرتشویش نگاہوں سے اسے دیکھا اور پھر کچھ سوچتی ہوئی کمرے سے متصل باورچی خانے میں جا گھسی۔ یہاں دیواروں پر بنے لکڑی کے طاقچوں میں اسٹیل کے برتن ترتیب سے رکھے تھے۔ زمین پر برابر برابر بنے چولہے اور تندور اس وقت ٹھنڈے پڑے تھے۔ اس نے ایک طرف رکھے ایندھن کے ڈھیر میں سے کچھ لکڑیاں اُٹھائیں اور انھیں چولہے پر ترتیب سے رکھ کر دیا سلائی دکھا دی۔ باہر سے بکری کے گوشت کے پارچے لا کر اندر رکھتے ہوئے اس نے کچھ خشک گوشت اور مُٹھی بھر جَو ایک مٹی کی ہانڈی میں ڈال کر اسے چولہے پر اُبلنے کے لیے رکھ چھوڑا۔ ناند میں بھرا ٹھنڈا پانی ایک کٹورے میں لیے وہ بچے کے پاس بستر پر آ بیٹھی۔ جو ابھی تک غنودگی آمیز نیند میں تھا۔ آدھے گھنٹے کے پُرمشقت انتظار نے رحمت کے بخار کو ہلکا اور ہانڈی میں چڑھے مرکب کو قابل ہضم کر دیا تھا۔ کمرے میں اناج اور گوشت کی اشتہا انگیز خوشبو پھیلنے لگی تو وہ پانی کا کٹورہ اور ماتھے پر رکھی پٹیاں سمیٹتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ابھی اس نے شوربا کٹورے میں انڈیل کر بچے کے سرہانے رکھا ہی تھا جب خاموش شام میں گھوڑوں کے ہنہنانے اور چوبی تختوں پر بھاری قدموں کے چلنے کی آواز اُبھری۔ وہ ہاتھ روکے بغور سنتی رہی۔ قدموں کی آواز جلد ہی زوردار دستک میں تبدیل ہو گئی۔ وہ سینے پر ہاتھ رکھے ہراساں سی دروازے کی جانب تک رہی تھی۔ دوسری بار دروازہ زیادہ زور سے بجایا گیا۔

اس نے دیوار پر ٹنگی بندوق کی جانب نگاہ دوڑائی۔ گھر میں حفاظت کے نام پر بس یہی قدیم ہتھیار تھا۔ قدموں کی چاپ بتاتی تھی کہ دراندازی ایک سے زائد ہیں۔ اس نے تیزی سے بندوق اُٹھائی اور آواز کی لرزش پر قابو پانے کی کوشش کرتی دروازے کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''تہ سوک یئ؟ سہ غواڑے؟'' (کون ہو تم؟ کیا چاہیے)۔ لرزتے لبوں سے مضبوط آواز برآمد ہوئی تھی۔ باہر ایک پل کو خاموشی چھا گئی۔

''ہم مسافر ہیں بی بی! مدد چاہیے۔ ایک زخمی ہے ساتھ۔ اگر مدد نہ ملی تو وہ مر جائے گا۔'' مخاطب نے کوہستانی علاقوں میں بولی جانے والی پشتو میں جواب دیا۔

وہ ایک باہمت عورت تھی جو اس ویران جگہ پر جنگل کے نزدیک، تنہا اپنے بچے کے ساتھ دن گزار رہی تھی مگر یہ ہمت

بس اسے فطرت کے خلاف نبرد آزما ہونے کا حوصلہ دینے کے لیے ہی تھی۔ وہ اس قدر باہمت بھی نہیں تھی کہ شوہر کی غیر موجودگی میں کسی اجنبی مرد کو گھر میں ٹھہرا لیتی جبکہ وہ تعداد میں ایک سے زائد تھے۔

’’میں ایسا نہیں کر سکتی۔ تم لوگ یہاں سے جاؤ۔‘‘ اس نے قطعی انداز میں کہا اور واپس پلٹ گئی۔

’’ٹھیک ہے بی بی! بس ایک مدد کر دو۔ ہمیں کچھ دوائیں اور فالتو کپڑا دے دو تا کہ ہم اپنے دوست کی پٹی کر لیں۔ یہ سفر کے قابل نہیں۔ اس کی ہڈی ٹوٹ چکی۔ خدا تم کو جزا دے گا۔‘‘ بولنے والے کا لہجہ اکھڑ مگر الفاظ نرم تھے۔

وہ کچھ دیر یونہی کھڑی سوچتی رہی۔ خدا کے واسطے نے اسے مشکل میں ڈال دیا تھا۔ چند لمحے وہ کمرے کے بیچوں بیچ کھڑی غور کرتی رہی اور پھر اپنے بچے پر نظر پڑتے ہی وہ جیسے کسی فیصلے پر پہنچ گئی۔

اپنے کمرے سے ملحقہ چھوٹے کمرے میں داخل ہو کر کچھ دیر بعد واپس آئی تو ہاتھ میں گرم چادریں اور کچھ پرانے کپڑے تھے۔ پھر ایک خیال آنے پر طاق پر پڑیا میں بندھی افیم بھی اُٹھا لی۔ اپنے بچے کے سخت بخار میں اس نے بس اسے تھوڑی سی مقدار میں استعمال کر کے باقی کسی مشکل وقت کے لیے رکھ چھوڑا تھا۔

اس دُور دراز علاقے میں تکلیف سے فوری نجات کا بس یہی ایک ٹوٹکا کارآمد تھا۔ نزدیک ترین ڈسپنسری بھی کئی میل کے فاصلے پر بڑے قصبے میں موجود تھی اور بالائی گاؤں جہاں بس چند مکانات گاؤں ہونے کی تہمت اُٹھائے ہوئے تھے۔ ایک نوّے سالہ سن رسیدہ طبیب موجود تھا جو علاج اس شرط پر کرتا کہ مریض کو اس کے پاس لایا جائے، پھر اس کے بعد اس کے قویٰ اور قدرت اجازت دیتے تو مرض کی صحیح تشخیص کر لیتا ورنہ ستم رسیدہ مریض کا نصیب۔

اس نے تمام اسباب ایک بازو اور دیوار کے درمیان یکجا کیا اور دوسرے ہاتھ سے کھڑکی کا پٹ تھپتھپایا۔ باہر پُرشور ہواؤں کے علاوہ کوئی آواز موجود نہیں تھی۔ اسے خوف محسوس ہوا کہ شاید وہ لوگ مایوس ہو کر وہاں سے جا چکے مگر فوری ردِعمل آیا۔

’’ہاں، بہن!‘‘ وہی سابقہ آواز گونجی۔

یہ کچھ گرم چادریں اور زخمی کی پٹی کے لیے کپڑا۔‘‘ کھڑکی کھلتے ہی ایک تیز ہوا کا جھونکا اندر در آیا۔ اس نے جلدی سے اسے افیم کی پڑیا تھمائی اور کھڑکی بند کر دی۔ سرد ہواؤں کا شور اس سناٹے میں جیسے اس کے اندر گونجنے لگا۔ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی احساسِ جرم میں مبتلا ہونے لگی۔ یہ ضمیر بھی بے وقت جاگتا ہے اور اس کا جاگ جانا بعض اوقات انسان کو سلا دیتا ہے۔ اس کے خاوند کو اگر علم ہو جاتا کہ اس نے غیر مرد کو گھر میں پناہ دی، تو اس کی قبر کی مٹی بھی رسوا ہو جاتی۔ اس نے نیک خیالات کو جبراً ذہن سے جھٹکا اور موٹے اُونی تکیے کو برابر کر کے کمر ٹکالی۔

مسلسل کروٹیں بدلتے رہنے کے بعد اسے یاد آیا کہ سرہانے، تپائی پر رکھا جگ خالی ہے۔ میٹھے پانی کی بھری ناند سے پانی جگ میں انڈیلتے ہوئے اس نے ایک علیحدہ برتن میں پانی بھرا اور ایک بڑے سے کٹورے میں بچا ہوا شوربا بھی ڈال لیا۔ کھڑکی کے نزدیک پہنچتے ہی ایک پُرسوز لے کانوں میں پڑی۔ گانے والے کی آواز میں موجود سوز ماحول کو سوگوار بنا رہا تھا۔ اس نے آہستہ سے کھڑکی بجائی تو آواز یکدم تھم گئی۔ تختوں کے چرچرانے کی آواز اُبھری۔

’’کیا بات ہے، بہن؟‘‘

اس نے اجنبیوں کو گودام کا راستہ سمجھایا اور ہاتھ میں تھامی چیزیں بھی انھیں پکڑا دیں۔ چار دیواری کم از کم انھیں یخ بستہ ہواؤں اور متوقع برف باری سے محفوظ رکھتی۔ اب وہ سکون سے سو سکتی تھی۔ اسے یقین تھا صبح ہوتے ہی وہ یہاں سے چلے جائیں گے اور وہ ان کی موجودگی کی تمام علامات مٹا

دے گی۔ اس نے پُرسکون ہو کر بچے کا ماتھا چھوا۔ بخار کی شدت کم ہو چکی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا اور لحاف سر تک تان لیا۔

☆☆☆

قدرت کے نادیدہ ہاتھ کو اپنی بساط پر اس کے منصوبے کچھ بھائے نہیں اور انھیں یوں چوپٹ کیا کہ زرین بوکھلا سی گئی۔ برف اُگلنے کو تلے کھڑے بادل برسنا شروع ہوئے تو روئی کے نرم گالوں نے ہر درخت، ہر شاخ، ایک ایک پتے کو ڈھانپ کر رکھ دیا۔ اس نے شوہر کی بروقت واپسی کی اُمید پر فاتحہ پڑھتے ہوئے، کھڑکی سے دُور تک بکھری سفید چادر کو دیکھا اور خود کو پُرسکون کرنے کے لیے ایک گہری سانس اندر کھینچی۔ گودام سے متصل باڑے میں بندھی بکریاں اور بھیڑوں کا دودھ دوہنے کے لیے اسے باہر جانا ہی تھا اور یکسر اجنبی لوگوں کے سامنے جانے سے وہ خوفزدہ تھی۔ ’ہوسکتا ہے وہ برف باری شروع ہونے سے پہلے ہی یہاں سے رخصت ہو چکے ہوں۔‘ اس نے سوچا اور چولہے پر پانی گرم ہوتا چھوڑ کر ایک بڑا سا برتن لیے باہر نکل آئی۔ اس کے بچے کا بخار مکمل طور پر اُتر چکا تھا مگر احتیاطاً اسے گھر میں بند رکھنا ضروری تھا۔ وہ ایک انتہائی چلبلا اور ذہین بچہ تھا جسے موسم کی پروا کیے بغیر ہر طرح کے مہم جوئیانہ کاموں میں ملوث ہونے کا جنون تھا۔

اصطبل تک جانے کے لیے اسے ڈھلوان کے کنارے بنی کچی پگڈنڈی پر چل کر جانا پڑتا جو اس وقت برف سے پیدا ہونے والی کیچڑ کے باعث حد درجہ پھسلواں تھی۔

ابھی تک وہاں کوئی حفاظتی جنگلا تعمیر نہیں کیا جا سکا تھا۔ اب کے سفیر گل واپس آئے تو سب سے پہلے یہی بنواؤں گی۔ اس نے ارادہ باندھ لیا۔ جسم پر لپٹی اُونی شال مضبوطی سے تھامے، کیچڑ میں پیر جماتی، آہستہ آہستہ باڑے تک پہنچ گئی۔ اب جانوروں کے لیے خوراک کی فراہمی بھی مشکل ہو گئی تھی۔ اسے محفوظ شدہ اناج لے کر پھر یہاں آنا تھا اور دوبارہ برف پڑنے سے پہلے بہت سی لکڑیاں مزید جمع کرنی تھیں۔

وہ احتیاط سے سہج سہج چلتی باڑے پر پہنچی تو نگاہ پہلے اجنبی پر پڑی۔ وہ پچیس چھبیس سال کا دبلا پتلا چھریرے جسم کا نوجوان تھا۔ جسم پر سمور کی جیکٹ اور سر پر اُلجھے بکھرے سیاہ بالوں کے جھنڈ نے اسے ٹوپی کی ضرورت سے بے نیاز کر رکھا تھا۔ کندھوں پر موٹی چادر لپیٹے ہاتھ میں پانی کا گلاس لیے وہ منہ پر پانی کے چھینٹے مار رہا تھا۔

وہ ٹھٹھک کر وہیں رک گئی۔ زرین پر نگاہ پڑتے ہی وہ اندر ہو گیا تا کہ اس کے لیے راستہ کشادہ ہو سکے۔ برتن دیکھ کر اسے اس پُراسرار تنہا مکان مالکہ کی وہاں موجودگی کے سبب کا اندازہ ہو گیا تھا۔ اس نے برتن اس سے لیا اور خود دودھ دوہنا شروع کر دیا۔ زرّین نے ذرا سا اندر جھانکا۔ وہاں دو نہیں، بلکہ تین لوگ موجود تھے۔ اپنے گھوڑے انھوں نے وسیع احاطے کے اندر ہی باندھ رکھے تھے۔ ایک طرف بھیڑ بکریاں، دوسری جانب گھوڑے اور درمیان میں ان تینوں کے گھاس پھوس پر چادریں بچھا کر بنائے گئے بستر دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ وہ سخت کوش زندگی گزارنے کے عادی رہے ہیں۔ دو بستر خالی تھے جبکہ تیسرے پر ایک بھاری تن و توش کا نوجوان دراز تھا۔ ایک پیر پر بندھی خون آلود پٹیوں اور لکڑی کی کھپچیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ یہ وہی ہے جس کے لیے انھیں کل سفر ترک کرنا پڑا تھا۔ وہ دونوں بازو اپنے پہلوؤں میں رکھے، چت لیٹا ہوا تھا۔ دراز بال چہرے کے گرد بکھرے تھے۔ تینوں کے لباس کی خستہ حالی سے ان کی درازیٔ سفر کی کہانیاں عیاں تھیں۔

’’آپ لوگ اُوپر گاؤں میں کس کے پاس جا رہے ہیں؟‘‘ اس نے کچھ سوچ کر گفتگو کرنے میں ہرج نہ جانتے ہوئے شستہ پشتو میں سوال کیا۔

’’ہم ادھر بالا میں سفیر گل سے ملنے جا رہے ہیں بہن۔ کچھ ادھار نکلتا ہے میرے دوست کا اس کی طرف۔ وصول کرنا

ہے اس سے۔ اب یہ زخمی ہو گیا ورنہ ہم آج واپسی کے سفر پر ہوتے۔'' اس نے تفصیل سے بتایا مگر اُدھار کا ذکر کرتے اس کا لہجہ معنی خیز ہو چلا تھا۔

''تمھارا خاوند کہاں ہے بہن؟'' اس نے اچانک پوچھا تو خاموشی سے اس کی بات سنتی زرین کا جسم تن سا گیا۔ وہ سوچنے لگی کہ اگر انھیں علم ہو گیا اس کا خاوند سفیر گل ہی ہے جو اس وقت گھر پر بھی نہیں تو جانے ان کا رویہ کیا ہو؟ بظاہر وہ اسے بہن کہہ رہا تھا مگر حلیے سے آوارہ گرد نظر آتے ان لوگوں سے اس کے خاوند کا کیا معاملہ تھا؟ وہ نہیں جانتی تھی۔

''وہ اب ہمارے ساتھ نہیں۔'' اس نے مزید کئی سوالوں کو جنم دیتا ہوا جواب دیا۔ اجنبی نہ جانے کیا سمجھا جو افسوس سے سر ہلانے لگا۔ برتن دودھ سے لبالب بھر گیا تو زرّین نے برتن سنبھالا اور اسی محتاط روی سے قدم بڑھاتی واپس ہو گئی۔ گھر آ کر اس نے تندور سلگایا اور خمیر ملا آٹا نکال لائی۔ ذہن میں سوچوں کا طوفان لیے وہ مسلسل کام میں مصروف تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو اس نے تیار نان ڈھانپ کر رکھ دیے۔ اس نے دروازے میں ایک جھری پیدا کی اور باہر جھانکا۔ وہاں اُونی شال میں لپٹا ایک نسبتاً فربہی مائل قبائلی نوجوان نظر آیا۔ اس کا صرف آدھا چہرہ شال سے باہر تھا۔ زمین پر گیلی لکڑیوں کا ڈھیر رکھے دستک دے کر وہ منتظر کھڑا تھا۔

''بی بی! کیا پینے کا پانی اور کھانے کو کچھ مل سکتا ہے؟'' اس نے پوچھا تو وہ اسے گرم دودھ کا تھرماس اور نان تھما کر جانوروں کو چارا دینے کی تاکید کرتی کام میں مصروف ہو گئی۔

''تو یہ ان کا تیسرا ساتھی ہے۔' اس نے سوچا۔ اب تک وہ لوگ مددگار اور شریف النفس ثابت ہوئے تھے اس لیے اس کا خوف دھیرے دھیرے کم ہونے لگا۔ رحمت کے لیے نئے مہمان دلچسپی کا باعث تھے مگر وہ اسے مناسب ہدایات دیے بغیر اجنبیوں کے پاس نہیں چھوڑ سکتی تھی۔

دوپہر میں غیر متوقع طور پر یکدم ہی بادل چھٹ گئے اور ہلکی برف پگھلنے لگی۔ جہاں برف زیادہ تھی وہاں جم کر سخت اور پھسلواں ہو گئی۔ اسے اُمید پیدا ہوئی کہ وہ ناخواستہ مہمان اب جانے کی تیاری کریں گے مگر تقدیر پھر اس کی خواہش پر خندہ زن ہوئی۔ زرین دھوپ کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کچھ سیلن زدہ کپڑوں کو دھوپ لگوانے باہر نکلی تو اس کا پانچ سالہ بیٹا بھی باہر نکل آیا اور گھر کے سامنے کھیلتے کھیلتے جانے کس وقت باڑے کی طرف جا نکلا۔ وہ ہراساں سی اس کے پیچھے لپکی۔

گودام میں سناٹے کا راج تھا۔ رحمت آس پاس نظر نہیں آیا تو وہ دیوانہ وار اندر گھستی چلی گئی۔ رحمت سامنے بندھے گھوڑے کی تھوتھنی سے منہ جوڑے کچھ راز و نیاز میں مصروف تھا۔ اپنے گھوڑے کی دیکھ بھال وہ باپ سے بڑھ کر کرتا تھا۔ بچے کو بخیر پا کر اس کی جان میں جان آئی تو اس کا دھیان باڑے کی ویرانی کی طرف مبذول ہوا۔ اسے حیرت تھی اپنے دوست کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر اس کے دونوں ساتھی کہاں غائب ہو گئے۔

اس نے رحمت کا ہاتھ تھاما اور زخمی کے پیروں کے پاس آ کھڑی ہوئی۔ کھڑکی سے آتی دھوپ میں اس کا سانولا چہرہ پیلاہٹیں چھلکا رہا تھا جیسے خون کا آخری قطرہ تک بہا چکا ہو۔ اس نے ذرا سا جھک کر جھجکتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوا اور گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ سرد موسم میں بھی اس کا بدن بخار کی حدت سے شعلوں میں لپٹا محسوس ہوا۔ وہ خون کی شدید کمی کا شکار بے یار و مددگار اس ویرانے میں پڑا تھا۔ وہ اسے کچھ دیر یونہی رہنے دیتی تو یقینی موت اس کی منتظر تھی۔ اسے یوں چھوڑنے کا مطلب ایک انسان کو مارنے کی دانستہ کوشش کہلاتی۔ اجنبی نوجوان کے بتانے کے انداز سے اندازہ تھا کہ سفیر گل سے نکلتا حساب کچھ خوشگوار نہ تھا۔ شش و پنج میں گھری زرّیں نے پلٹ کر دیکھا اور آخر کار اندرونی کشمکش سے ہار مان لی۔ آسمان کی جانب دیکھ کر جیسے اللہ سے شکوہ کیا کہ اس نے یہ بھاری

ذمہ داری اس کے ناتواں کندھوں پر کیوں ڈالی؟ اس نے رحمت کو گھر میں چھوڑا اور پانی اور کپڑے کی پٹیاں لیے باہر آ گئی۔ اس ویرانے میں کسی مریض کی تیمارداری کا اس کے پاس اور کوئی طریقہ موجود نہیں تھا۔

سرد پانی نے حرارت کے لیے جاذب کا کام کیا۔ وہ ایک تھرماس میں یخنی تیار کر لائی تھی۔ بخار کی شدت کم ہونے پر مضروب کو بھوک ضرور محسوس ہوتی۔ کسی خودکار مشین کی مانند یخ برفیلے پانی میں ہاتھ دیے ایک ہاتھ سے چہرے پر شال کا نقاب کیے وہ ایک کے بعد ایک پٹیاں بدلتی رہی۔ سرد ہوائیں چنگھاڑتی رہیں۔ دھیرے دھیرے اسے اپنا جسم پتھر کا محسوس ہونے لگا بس جیسے آنکھوں میں جان باقی تھی۔ رحمت کو شاید گھر میں تنہا بیٹھنا پسند نہ آیا۔ وہ بھی دھیرے دھیرے چلتا اس کے برابر آ بیٹھا تھا اور اب خاموشی سے اس کی حرکات و سکنات کا مشاہدہ کر رہا تھا۔ یونہی بیٹھے بیٹھے بچے کو نیند کا جھونکا آیا اور اس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر زخمی کی مضروب ٹانگ پر جا پڑا۔ زرین چونک اُٹھی۔ اسے لگا زخمی تڑپ کر جاگ اُٹھے گا۔ ٹوٹی ہڈی کا درد تو مردے کو جگا دے مگر اس کی سانسوں میں تغیر تک نہ آیا۔ زرین نے بصد احتیاط ٹانگ کو ہاتھ سے چھوا پھر پٹی کو ذرا سا کھول کر دیکھا۔ کپڑا خون سے تربتر تھا۔ انھوں نے رات میں یونہی کپڑا لپیٹ دیا تھا۔ اندر ایک انچ گہرا زخم پنڈلی سے گھٹنے کے جوڑ تک چلا گیا تھا۔ اسی تکلیف نے اسے بخار میں مبتلا کر رکھا تھا۔

زرّیں نے زخم صاف کر کے کچھ جڑی بوٹیوں کو پیس کر لیپ بنایا اور زخم پر نئی پٹی لپیٹ دی۔ اس کے اپنے ہاتھ اور کپڑے جا بجا خون آلود ہو چکے تھے مگر زخم اب خراب ہونے سے محفوظ ہو چکا تھا۔ بخار کافی کم ہو چکا تھا اور تب ہی اچانک زخمی نے آنکھیں کھول دیں۔ زرین کا وہ ہاتھ جو کپڑے کی دھجی اُٹھانے کو آگے بڑھا ہی تھا یکدم اس کی گرفت میں آ گیا۔ وہ اپنی بڑی بڑی سرخ آنکھوں میں وحشت بھرے اسے گھور رہا تھا۔

''کون ہو تم اور یہاں کیا کر رہی ہو؟'' اس نے درشتگی سے پوچھا۔

''میں...... اس گھر کی مالکن ہوں اور تم زخمی ہو۔'' وہ بمشکل بول پائی۔ اس نے زرین کا ہاتھ جھٹکا اور تیزی سے اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ ٹانگ میں اُٹھتی درد کی لہر کے سبب، پہلی بار اسے احساس ہوا کہ وہ شدید زخمی ہے۔ اس نے ٹانگ کو ہاتھ سے چھوتے ہوئے حرکت دی۔ قدرے تکلیف کے ساتھ ہی سہی مگر ٹانگ متحرک تھی۔ اس نے ٹانگ کا زخم نظر انداز کرتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی تلاش میں اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔

''میرے دوست کہاں ہیں؟'' اس نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

''مجھے نہیں معلوم۔ میں تمہارے دوستوں کی چوکیدار نہیں۔ وہ تمھیں اس حال میں چھوڑ کر صبح سے غائب ہیں۔ واپس اگر آ جائیں، تو انھی سے پوچھنا کہ تمھیں مرنے کے لیے چھوڑ کر کہاں گئے تھے...... اور ہاں۔'' وہ واپس جاتے ہوئے پلٹی۔ ''تھرماس میں یخنی ہے۔ چاہو تو پی لینا۔'' اب کی بار اس نے بھی سخت لہجے میں جواب دیا اور اس کا جواب سنے بغیر رحمت کا ہاتھ تھام کر باہر کی جانب بڑھ گئی۔

اسی اثنا باہر کسی کی آوازیں اُبھریں۔ رحمت ہاتھ چھڑا کر باہر لپکا۔ کچھ دیر بعد دونوں گھوڑے شہ سوار کندھے پر ایک شکار کیا ہوا ہرن لٹکائے اندر داخل ہوئے۔ اپنے دوست پر نگاہ پڑی تو ہرن زمین پر پٹخ وہ دوڑ کر اس کے نزدیک آئے۔

''او یارا! تم نے تو ہمیں ڈرا ہی دیا تھا حکمت شاہ! ایسے بھی کوئی بیمار ہوتا ہے؟ ہم تو بند راستے کی پرواہ کیے بغیر طبیب کو لینے نکل پڑے تھے مگر پیدل چلنے کا راستہ بھی نہیں ملا۔ اب ایک دو دن میں برف صاف ہونے کے بعد ہی جا سکیں گے۔''

''سفیر گل کی زندگی کی رسی دراز ہوتی جا رہی ہے۔'' وہ

شاید کچھ مزید گل فشانی کرتا کہ نگاہ زرین پر پڑ گئی اور وہ اچانک خاموش ہو گیا۔ شاید وہ زرین کے سامنے اپنے ذاتی معاملات کھولنا نہیں چاہتا تھا۔

''میں چلتی ہوں۔ اپنے دوست کو یخنی پلا دینا اور ہاں..... میں نے جو بوٹیوں کا مرہم بنایا ہے، وہ لگا کر پھر پٹی کر دینا۔'' وہ تیزی سے بولتی، چادر مضبوطی سے تھامے دوسرے ہاتھ میں خون آلود پٹیاں اُٹھائے باہر نکل آئی۔

شکار شدہ ہرن کے گوشت کے پارچے کر کے رسیوں پر ڈال کر سکھا دیے گئے تھے۔ زرین نے پہلی بار رحمت کو جھوٹ بولنے کی ترغیب دی۔ اسے سکھایا کہ اجنبیوں کے سامنے اپنے باپ کا یا باپ کے سامنے ان کا ذکر بالکل نہ کرے۔ بچے کو اگلے چند دن بہت سے جھوٹ بولنے تھے۔

☆☆☆

زرین کا بنایا گیا مرہم کام آیا اور تکلیف اس حد تک کم ہو گئی کہ اب وہ بآسانی چل پھر سکتا تھا مگر گھوڑے کی سواری اب بھی ایک دشوار امر تھا۔ زرین سے بات کرتے ہوئے حکمت شاہ کے لہجے میں اب وہ آنچ بھی مفقود تھی جو برسوں سے اس کے مزاج کا لازمہ ٹھہری تھی۔ اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کی زندگی بچانے کے لیے قدرت نے جس زرین نامی وسیلے کو چنا، اس نے اپنا کام پوری ذمہ داری سے انجام دیا تھا۔ اس کی زندگی بچانے میں اس عورت کی بے غرض اور بے لوث فطرت کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔

موسم کے تیزی سے بدلتے تیور جوں کے توں تھے۔ ایک دن کی دھوپ کے بعد اگلے دن پھر بادلوں نے برف کا بوجھ نہ سہارتے ہوئے اسے زمین پر اُگل دیا اور شدت اب کی بار پہلے سے زیادہ تھی۔ جس برف نے حکمت شاہ کو یہاں قید کر رکھا تھا، اسی برف نے سفیر گل کو بھی اس کی دست برد سے بچا رکھا تھا۔ زرین قدرت کی اس بوالعجبی پر پہلے حیران اور اب پریشان تھی۔ اسے علم نہیں تھا کہ اگر دونوں دشمن ایک میدان میں جمع ہو گئے تو کیا ہو گا؟ وہ بس ان کے یہاں سے جانے کی منتظر اور اس وقت تک سفیر کے واپس نہ آنے کے لیے دعا گو تھی۔

برف باری کا تیسرا دن تھا اور اجنبیوں کی آمد کا بھی۔ مویشیوں کے لیے جمع شدہ چارا ختم ہونے کے قریب تھا۔ اب تک اس کے تمام کام، پانی اور لکڑیاں لانے سے لے کر جانوروں کو چارا دینا اور دودھ دوہنا اجنبیوں نے اپنے ذمے لے رکھا تھا۔ اس لیے اس نے نئی ذمہ داری ان پر لادنے کے بجائے رائفل کندھے پر لادی اور رحمت کو گرم کپڑوں میں لپیٹ، باہر نکل آئی۔

دُور تک پھیلے سفید میدان کے پار چھوٹے ٹیلے موجود تھے جن پر گھنے درختوں کی موجودگی نے ابھی تک اندر موجود سبزے کو برف سے بچا رکھا تھا۔ وہ پھسلواں ڈھلان پر آگے بڑھ رہی تھی جب اچانک فائر کی آواز گونجی۔ دھماکے نے اسے بدحواس کر دیا۔ اس نے گھبرا کر نیچے بیٹھ جانا چاہا مگر پیروں کے نیچے سے برف پھسلتی چلی گئی۔ اس سے چند قدم کے فاصلے پر کھڑے رحمت اور زرین کی چیخ ایک ساتھ گونج اُٹھی۔ اس نے سہارے کے لیے ہاتھ لہرائے مگر ہوا کی گرفت اتنی مضبوط نہ تھی کہ اسے گرنے سے روک لیتی۔ وہ برف کے ساتھ ساتھ لڑھکتی چلی گئی اور عین چٹان کے دامن میں جا رُکی۔

☆☆☆

برف اور کیچڑ میں لت پت وہ پوری آنکھیں کھولے اپنے سر کے پاس کھڑے رحمت کو تک رہی تھی مگر وہاں ایک اور سر بھی موجود تھا۔ اس نے آنکھیں پھاڑ کر بغور دیکھنے کی کوشش کی۔ سر پر قراقلی ٹوپی پہنے ایک کندھے کے نیچے لاٹھی دبائے وہ حکمت تھا جو اس وقت جنگل کے اس حصے میں جانے کیوں موجود تھا۔ وہ جلدی سے دونوں ہاتھ زمین پر ٹکاتی اُٹھ بیٹھی۔ تب ہی اس کی نگاہ حکمت شاہ کے کندھے سے جھولتی بندوق پر پڑی۔ گولی یقیناً انھوں نے ہی چلائی تھی۔ وہ اس جگہ شکار کر رہے تھے۔ اچانک زرین کو عجیب سا احساس ہوا۔ وہ حکمت شاہ کی نظریں تھیں جو اس کے چہرے کے ایک ایک نقش کو جیسے حفظ کر رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر سر پر اوڑھنی کو گھسوں کر نا چاہا مگر وہ کہیں پیچھے ہی چٹان میں اٹکی رہ گئی تھی۔

''رحمت میری چادر لاؤ۔'' گھبراہٹ اور کھسیاہٹ کے زیر اثر اس کی آواز زیادہ ہی بلند ہو گئی۔ رحمت ڈر کر دوبارہ چٹان پر دوڑا۔ حکمت کو اپنی نامناسب حرکت کا احساس ہوا تو وہ رُخ موڑ کر کچھ دُور جا کھڑا ہوا۔

''کیا آپ ٹھیک ہیں؟ چوٹ تو نہیں آئی؟ مدد چاہیے تو بتائیں یا میں جاؤں؟'' اس نے مخصوص اکھڑا انداز میں یکے بعد دیگرے کئی سوال پوچھے تو جسم کو جلدی جلدی چادر میں لپیٹتی زرین کے تلوؤں سے لگی سر پر پہنچی۔

''میں خود چلی جاؤں گی۔ آپ جائیں۔'' نروٹھے پن سے بولتے ہوئے اس نے منہ پھیر لیا تو حکمت شاہ اپنے پیر پر وزن ڈالتا آہستہ آہستہ چلتا وہاں سے نکل گیا۔ وہ دل ہی دل میں تینوں مسافروں کو کوستی کھڑے ہونے کی کوشش میں دوبارہ زمین پر جا پڑی۔ پنڈلی میں اچانک ہی زور کا درد اُٹھا اور اس کی دلدوز چیخ نے حکمت کو پلٹ کر واپس آنے پر مجبور کر دیا۔ اور پھر ایک طرف رحمت اور دوسری طرف سے حکمت کے سہارے وہ بمشکل گھر تک پہنچی۔ اسے نہیں معلوم تھا رحمت نے انھیں کھانے کے متعلق کیا بتایا اور انھوں نے اس کا کیا بندوبست کیا؟ وہ بس خاموشی سے رحمت کو باورچی خانے سے مختلف چیزیں اُٹھا کر باہر لے جاتے دیکھتی رہی۔ ہانڈی، ماچس، دال، چمچ، پیالے، نمک اور مصالحے۔ آخر میں ان تمام لوازمات کا مجموعہ خوشبوؤں سے مہکتے ہرن کے گوشت کے شوربے کی صورت اس کے سامنے آیا۔ اس نے خاموشی سے پیالہ تھاما اور گھونٹ گھونٹ پینے لگی

☆☆☆

اسے مشکلات سے نبرد آزما ہوتے ہفتہ ہونے کو تھا۔ پاؤں کی چوٹ بھی ٹھیک ہو چکی تھی۔ دو دن سے مسلسل آسمان کا گھر اؤ کیے بادلوں نے سورج کی کرنوں کو راستہ دیا تو زرین بھی میلے کپڑوں کا ڈھیر لیے گھر کے عقب میں بہتے پہاڑی نالے پر پہنچ گئی۔ وہ کچھ دیر یونہی پتھر پر بیٹھی پانی میں گھلتی برف کی ڈلیوں کو دیکھتی رہی۔ اس بات سے قطعی بے خبر کہ کوئی اور بھی اس منظر میں موجود ہے جو اسی کی طرح جتلائے سحر ہے۔ فرق تھا تو بس اتنا کہ اس کے لیے حسن ولطافت کا مرکز خود زرین کی ذات تھی۔

دُور تیرتی ایک مچھلی پکڑنے کے لیے ہاتھ آگے بڑھاتے یونہی اس کی نگاہ بائیں جانب اُٹھی اور ایک برقی لہری جیسے جسم میں دوڑ گئی۔ وہ حکمت تھا جو گودام کے اندر کھڑا تھا۔ گودام کی ایک کھڑکی باہر نالے کی جانب کھلتی تھی۔ وہ جانے کب سے وہاں موجود تھا؟ زرین نے جلدی سے چادر سر پر ڈھلکائی اور ایک بڑا سا گھونگھٹ اوڑھ لیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایک چھلتی نگاہ کھڑکی پر ڈالی تو وہ خالی تھی۔

☆☆☆

وہ کافی دیر سے زمین پر چادروں اور گھاس پھوس کی مدد سے بنے اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ آٹھ سال پہلے کا وہ دن اس کے ذہن میں اپنی پوری جزئیات کے ساتھ تازہ تھا جب اس کی دنیا اچانک ہی طوفانوں کی زد میں آ گئی تھی۔

پشاور یونیورسٹی میں اس کا دوسرا سال تھا جب وہاں گاؤں سے حالات کی ابتری کی خبریں آنے لگیں۔ چھٹیوں میں گھر جانے کی خوشی پر گھر والوں کی فکر چھائی ہوئی تھی۔ روز روز دھماکوں اور حملوں کی خبریں۔ کچھ عجیب نوعیت کے حملے جو علاقے کے اندر ہی اندر لوگوں میں ہراس پھیلا رہے تھے مگر اپنا تعلیمی سال خراب کر کے وہاں جانے سے حالات میں بہتری آتی تو وہ سب کچھ ترک کیے وہاں پہنچ بھی جاتا۔ جہاں اس کا دادا اپنے دو بیٹوں کی آل اولاد کے ساتھ زندگی کی اتنی

بہاریں گزار چکا تھا اور اس طویل عمر میں اس نے کبھی اپنوں کو غیروں کے ساتھ مل کر اپنوں کا قتال کرتے نہیں دیکھا تھا۔ اس کا سادہ دماغ عالمی سیاست کے داؤ پیچ سمجھنے سے قاصر تھا۔

اسے حکمت کی باتوں پر غصہ آتا تھا جو اسے بزدلی کا سبق پڑھاتا اور کہتا تھا کہ محنت سے بنائی زمین و جائیداد چھوڑ کر یہاں سے نکل چلیں۔

حکمت شاہ نے امتحانوں کے بعد، پہلے ہی دن گاؤں کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔ دل میں سرسراتے اندیشوں کے ناگ کچلنے کا یہی طریقہ تھا کہ وہ وہاں جا کر اپنی آنکھوں سے سب کو بخیر دیکھ لیتا۔ دو جانب سے اُونچے پہاڑوں اور ایک طرف سے دریا کے کناروں کو چھوتا اس کا گاؤں چند سو گھروں پر مشتمل تھا جہاں اکثریت اس کے اپنے ہی خاندان کے افراد پر مشتمل تھی۔ کچھ گھر حال ہی میں پڑوسی ملک سے ہجرت کر کے آنے والے اور کچھ جنگ سے پریشان قبائلیوں کے تھے۔

گاڑی سے اُتر کر کئی فرلانگ کی مسافت کے بعد جب گاؤں کے شواہد نظر آئے تو وہ پُرجوش ہو کر دوڑتا ایک ٹیلے پر چڑھ گیا۔ رنگین وادی کے دامن میں اگر کچھ بے رنگ تھا تو وہ انسانی ہاتھوں سے بنے مکانات تھے۔ اس نے ٹیلے پر کھڑے ہو کر آواز لگائی اور ہاتھ بھی لہرایا۔

''ہلکا۔'' کھیتوں میں کام کرتے نوجوان نے پلٹ کر اسے دیکھا مگر تب ہی اس کی آواز کئی گنا زیادہ گرج کے ساتھ ہونے والے دھماکے کے شور میں دب گئی۔ مسلسل فائرنگ اور دھماکوں کے شور سے ماحول گونج اُٹھا۔ تھوڑی ہی دیر بعد پریوں کے دیس جیسا وہ گاؤں سیاہ گاڑھے دھوئیں میں لپٹا ہوا بدہیئت جن کے مانند نظر آنے لگا تھا۔

اس کے کان ابھی تک دھماکوں کے شور سے بھرے ہوئے تھے۔ دماغ بار بار یاد دلا رہا تھا کہ تم پر وہ قیامت ٹوٹ چکی جس کا خوف کئی روز سے بھوت بن کر تمہارے اعصاب

پر سوار تھا۔ اب اُٹھو اور جا کر اپنے پیاروں کے بکھرے جسم سمیٹو کہ شاید وہاں یہ کام کرنے والا اب تمہارے علاوہ کوئی نہ بچا ہو۔ اس نے ٹیلے سے اُترنے کے لیے قدم آگے بڑھایا جو بھربھری مٹی پر پڑا اور وہ آگے پھسلتا چلا گیا۔ اس کی نظر اسی جلتے منظر پر ٹکی رہی۔ اس نے دوڑنا چاہا مگر پیروں نے جسم کا بوجھ سہارنے سے انکار کر دیا۔ وہ گھٹنوں کے بل وہیں گر گیا اور بلا ارادہ ماں اور باپ کا نام پکارنے اور دادا کو آوازیں دینے لگا۔ اپنی آواز وہ خود بھی نہ پہچان پایا۔ سفری بیگ وہیں چھوڑے وہ وہاں سے نکلا تو ایک پیر میں جوتی اور دوسرا اس کے دامن کی طرح خالی تھا۔ بارُود کی بو گاؤں کے باہر ہی سے محسوس کی جا سکتی تھی۔

وہ پہاڑوں کا بیٹا تھا۔ بارُود کے سائے میں پلا تھا مگر وہ بارُود اپنے دفاع میں استعمال ہوتا تھا، کسی بے گناہ پر نہیں۔ وہ اس جگہ پہنچا جہاں کبھی اس کا گھر ہوا کرتا تھا۔ اب وہاں صرف دھواں اُگلتا ملبہ تھا۔ نہ صرف اس کا بلکہ چاچا کا گھر بھی صفحہء ہستی سے مٹ چکا تھا اور اس کے مکین؟؟

گاؤں کی بربادی کی وہ رات اس نے اپنے گھر کے ملبے پر بیٹھ کر روتے ہوئے گزاری۔ گھر میں لگی آگ تو بارش نے بجھا دی مگر دل میں لگی انتقام کی آگ کئی بارشیں دیکھنے کے باوجود نہ بجھ سکی۔ وہ بہت کوشش سے اس مخبر تک پہنچا تھا جس نے اس قیامت کو چند ٹکوں کے عوض ان کے گھر کا راستہ دکھایا تھا۔ وہ شاہین گل تھا۔

اس کے دادا نے اپنا دیس کئی برس قبل چھوڑ دیا تھا مگر دشمنیاں پالنے والے اسے نہیں بھولے تھے۔ بدلہ لینا وہاں کی روایت تھی۔ اپنے دو دوستوں کے ساتھ مل کر اس نے حملہ آوروں کو کھوجنا شروع کر دیا۔ وہ سرحد پار سے آئے تھے۔ انھیں تلاش کرنے کے لیے ایک اور عمر چاہیے تھی۔ لہٰذا اس نے ان سے بدلہ بعد پر رکھا اور پہلے شاہین کے خاندان کا کھرا نکالا اور یوں سفیر گل تک آ پہنچا جو پہلے ہی اس سے بچنے کی

خاطر بار بار رہائش بدلتا رہتا تھا۔

اب اپنے مقصد سے محض چند قدم کی دوری پر قدرت کی یہ رکاوٹ کھڑی ہو گئی تھی۔ اسے زرّین کا اتفاقیہ طور پر کھل جانے والا چہرہ یاد آیا اور پھر اپنی محویت، تو وہ ایک پل کو خجل سا ہو گیا۔ ایسی بے اختیاری تو اس پر تب بھی غالب نہ آئی تھی جب وہ ایک سے بڑھ کر ایک طرح دار حسیناؤں کے ساتھ یونی ورسٹی میں پڑھتا رہا تھا۔ اس کے متعلق سوچتے ہوئے دھیرے دھیرے خجالت کا احساس معدوم ہوا اور ایک اور نرم سا احساس حاوی ہونے لگا۔ اسے وہ لمس یاد آیا جب وہ اسے زخمی حالت میں گھر تک لایا تھا۔ وہ کسی پھول کی طرح نازک تھی مگر حد سے زیادہ گھبراہٹ میں مبتلا۔ وہ اس کی پریشانی سمجھ سکتا تھا۔

ایک محدود ماحول میں رہنے والے دو افراد مجبوراً ہی سہی، مگر ان حدود کو توڑ رہے تھے جو معاشرے کی جانب سے ان پر لاگو تھیں اور اب احساس جرم میں مبتلا تھے۔ مگر حکمت شاہ کے لیے اس احساس جرم میں بھی سرشاری کی کیفیت پیدا ہونے لگی۔ اس کے دل میں اس خاندان کا حصہ بننے کی ایک بے ساختہ خواہش بے دار ہوئی تو اسے زرّین کے نادیدہ شوہر پر طیش آنے لگا۔ اسے ڈر لگا کہ کہیں وہ اپنے ان دیکھے رقیب کو ہی قتل نہ کر بیٹھے۔ وہ انتقام کی اندھی راہوں کا مسافر تھا۔ شاید وہ اب کوئی نیا خاندان بنا ہی نہ پاتا۔ اس کی تمام عمر انتقام کی گھاٹیوں میں بھٹکتے ہوئے گزرنی تھی مگر زرّین کے روشن صبیح چہرے پر لہراتی سنہری لٹیں اور گالوں میں پڑتے بھنور اسے اُبھرنے کا موقع دینے کو تیار نہ تھے۔ وہ کھڑا کچھ دیر غائب دماغی کیفیت میں اپنے گھوڑے کو دیکھتا رہا اور پھر اس نے پاس رکھی بندوق کو ہاتھ میں لے کر تولا۔ درّے کی بنی بندوق اس کے باپ کی ملکیت تھی اور ابھی تک اسی طرح کارآمد۔

''لگتا ہے تمہیں بھی میری طرح زنگ لگ رہا ہے۔'' اس نے بندوق سے سرگوشی کی۔

اسے زرّین سے اپنی پہلی ملاقات یاد آئی۔ بلاشبہ وہ اس کم گو عورت کا احسان مند تھا۔ وہ نہ ہوتی تو آج وہ اپنے اناڑی دوستوں کی مہربانی سے زمین کے نیچے پہنچ چکا ہوتا۔ کسی لالچ کے بغیر وہ بے لوث سخت موسم میں اس کی تیمارداری کرتی رہی تھی۔ وہ چاہ کر بھی اس کا قرض نہیں اُتار سکتا تھا۔

اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ اس کے دوست ننھے رحمت کے ساتھ مل کر کپڑے کی گیند سے فٹبال کھیل رہے تھے۔

یہ دونوں لڑکے اس کے دوست ہی نہیں بلکہ رشتے دار بھی تھے جو پچھلے آٹھ سال سے محض اس کے انتقام کی خاندانی روایت کو پورا کرنے کے لیے اس کے ساتھ مارے مارے پھر رہے تھے۔ کھڑکی سے ہٹ کر باہر جاتے ہوئے اس کی نگاہ باڑے کے عقب میں بنی ایک روشندان نما کھڑکی پر پڑی جہاں سے کوئی رنگین پیرہن جھلک دکھلا رہا تھا۔ وہ بے خود سا ہو کر عین کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور جانے کب تک اس منظر کی اثر آفرینی کو آنکھوں میں جذب کرتا رہتا کہ اچانک اس دشمن دل و نگاہ کی نظر اس پر پڑ گئی۔ اس نے جھٹکے سے ایک پردہ سا اس کی بے باک نگاہ کے آگے کھینچا اور وہ جیسے ایکا ایکی ہوش میں آتے ہوئے اپنے انہماک اور اس کے ردِعمل پر پانی پانی ہوتا وہاں سے ہٹ گیا۔

اب یہاں رہنا نہ صرف اس کی محسنہ بلکہ اس کے اپنے لیے بھی برا ثابت ہوتا۔ یہاں سے جلد از جلد چلے جانا ہی بہتر تھا۔

☆☆☆

دروازے پر ہوئی زوردار دستک سے قہوہ چھانتا اس کا ہاتھ ایک پل کو لرز اُٹھا۔ اس نے آہستہ سے پیالہ لکڑی کے تختے پر رکھا اور دروازے پر آئی۔

''کون ہے؟'' اگر رحمت ہوتا تو اب تک دوسری دستک دے چکا ہوتا۔

''میں ہوں...... حکمت۔'' مدھم آواز میں جواب آیا۔
اس نے ایک پل سوچا اور کھڑکی کی جانب کھڑی ہوگئی۔
''جی بولیں۔ کچھ چاہیے کیا؟'' وہ دھیرے سے بولی۔
جواباً کچھ دیر خاموشی طاری رہی۔
"آج ہم بالائی گاؤں کی طرف نکل رہے ہیں۔ ممکن ہے کام مکمل ہونے کے بعد وہیں سے آگے بڑھ جائیں اور دوبارہ یہاں آنا نہ ہو۔ آپ کے احسانات کا بدلہ تو نہیں چکا سکتا مگر یہ چھوٹا سا تحفہ...... ایک ان چاہے مہمان کی جانب سے قبول کریں۔''

وہ بالوں سے بھری کوئی چیز تھی جیسے کوئی چوہا ہو۔ وہ اسے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کچھ جھجکی اور پھر اسے اچانک احساس ہوا۔ وہ مشک سے بھری ہرن کی ناف تھی۔ وہ اسے مشک دے رہا تھا۔ وہ اتنی قیمتی چیز تھی کہ اگر کسی کے ہاتھ لگ جاتی تو وہ اس کے لیے قتل کرنے سے بھی دریغ نہ کرتا اور وہ اسے چھوٹا سا تحفہ کہتے ہوئے عنایت کر رہا تھا۔
''اور ہاں......'' وہ جاتے جاتے پلٹا۔ ''مجھے نہیں معلوم اس کا نام کیا ہے؟ یہاں پہاڑوں میں نظر آیا تو توڑ لیا۔''
اس نے کھڑکی پر کچھ رکھا اور تیز قدموں سے چلتا ہوا چوبی پلیٹ فارم سے نیچے اُتر گیا۔ زرین نے ہاتھ بڑھا کر اسے اُٹھا لیا۔ وہ کھڑکی کی چوکھٹ پر رکھا ایک پھول تھا۔ سرخ آگ کی طرح دہکتا پہاڑی پھول۔ خوشبو سے محروم مگر بے انتہا خوبصورت۔ نہ جانے وہ اسے اس برف میں کہاں سے ڈھونڈ لایا؟ اور نہ صرف لے آیا بلکہ اسے دینے کی جرأت بھی کر بیٹھا۔

وہ پھول ہاتھ میں لیے بستر پر بیٹھی تھی جب اسے تین افراد پر مشتمل اس کارواں کے گزرنے کی آہٹیں سنائی دیں۔ گھوڑوں کے پھنکارنے کی آوازیں، ان کے ٹاپوں کی، شیرمت کے بولنے کی، ساتھ رحمت کی بلند آواز بھی تھی جو انھیں روکنے کے لیے درخواست کر رہا تھا۔ اس کا دل چاہا وہ اُٹھ کر باہر جا کھڑی ہو۔
آوازوں کا شور معدوم ہوا تو ڈھلتی سہ پہر کی ٹھنڈ میں وہ باہر گھومتے رحمت کو لانے باہر نکلی۔ وہ دُور پہاڑوں کی جانب جاتی پگڈنڈی پر کھڑا مسافروں کو ہاتھ ہلا ہلا کر الوداع کہہ رہا تھا۔ وہ پلٹ پلٹ کر جوابی ہاتھ ہلا رہے تھے۔ جلد ہی تینوں گھوڑے مکان کے عقب میں اوجھل ہو گئے۔ ساتھ ہی سورج بھی اپنے سائے سمیٹتا پہاڑوں کے پیچھے جا چھپا۔
مسافر جا چکے تھے۔ وہ ان کی چھوڑی ہوئی نشانیاں سمیٹ چکی تھی مگر ماحول میں در آنے والی اُداسی اور خاموشی کا مداوا اس کے بس سے باہر تھا۔ رات کے کھانے کے لیے پکائی گئی مکئی اور جوء کا دلیہ یونہی رکھے رہے۔ رحمت سر تا پا چادر میں چھپا پہلے روتا رہا اور پھر بھوکا ہی سو گیا۔ اسے معلوم تھا مسافر جو جا چکے وہ واپس آئیں گے اور ان کی آمد سے پہلے انھیں وہاں سے رخصت ہونا تھا۔ وہ بس سفیر گل کی منتظر تھی۔
اس نے آتشدان میں لکڑیاں جھونکیں اور بستر سے ٹیک لگالی۔ تین نو واردوں کا قیام اپنے خاوند سے پوشیدہ رکھنا ممکن نہ تھا۔ اسے سفیر کو حقیقت بتانا ہی تھی۔ اسے اُمید تھی حکمت کے اُوپر والے گاؤں تک پہنچنے سے پہلے ہی سفیر گل واپس آ جائے گا اور وہ مناسب الفاظ میں اسے سب کچھ بتا سکے گی۔ سوچوں کی اودھیڑ بنت کرتے وہ کب نیند کی آغوش میں پہنچ گئی، اسے احساس تک نہ ہوا۔

☆☆☆

وہ صبح عام صبحوں سے کچھ مختلف تھی۔ مطلع صاف ہو چکا تھا۔ زرین نے صبح ہی صبح صفائی پر کمر کس لی اور باقی ماندہ نشانیوں کو بھی صاف کر دیا جس سے مسافروں کے طویل قیام کا اشارہ ملتا تھا۔ سرد بے کیف دن تھا کہ ڈھلنے کو تیار ہی نہ تھا۔ خالی الذہنی کیفیت میں پلنگ پر بیٹھے ہوئے اس کی نگاہ سامنے لکڑی کی کارنس پر رکھے پانی کے کٹورے پر پڑی۔ پانی میں تیرتا پہاڑی پھول آج بھی ویسا ہی تروتازہ تھا۔

کمرے کی بے رنگ دیواروں اور لکڑی کے ہاتھ سے بنائے گئے فرنیچر کے سامنے وہ پھول، جیسے ایک الگ ہی حیثیت کا حامل تھا۔ نگاہ خودبخود جا کر اس پر رُک جاتی۔ اس نے سر جھٹکا اور کپڑے میں دھاگے کی مدد سے دلکش نقش ونگار کاڑھنے لگی۔
رحمت کافی دیر سے باڑے کے باہر لگے لکڑی کی باڑھ کو مصنوعی گھوڑے کی شکل دیے اسے خیالی دنیا میں دوڑا رہا تھا۔ وہ مستقل آتی آوازوں سے ہی اس کی خیریت کا اندازہ کر رہی تھی جب اچانک اس کی آواز کا آہنگ بدل گیا۔ وہ خوشی کی قلقاری سے مشابہ کوئی آواز تھی اور پھر یکدم یہ خوشی کے نعرے دُور جاتے ہوئے محسوس ہوئے۔ اسے کچھ الگ سا احساس ہوا۔ وہ کپڑا ایک جانب رکھتی اُٹھ کھڑی ہوئی۔
اس چھوٹی سی ڈھلان پر بنے مکان کے نیچے ایک بڑا سا چٹیل میدان تھا۔ میدان کے پار پھر پہاڑوں کی ایک سرحد تھی۔ اسی سرحد پر بنی تنگ سی راہداری اس وادی کو باقی علاقے سے جوڑتی تھی اور اسی پر اگر سفر جاری رکھا جاتا تو وہ بالائی گاؤں کی جانب چلی جاتی۔ اس راستے پر کوئی شہ سوار تھا جسے دیکھ کر رحمت پُرجوش ہوا تھا۔ اب وہ دوڑتا ہوا شہ سوار کے پاس پہنچ چکا تھا اور تھوڑی ہی دیر میں گھوڑے کی باگ تھامے کسی فاتح کی مانند واپس آتا ہوا نظر آیا۔ آخر کار پورے ایک ہفتے بعد اس کا باپ واپس لوٹ آیا تھا۔

☆☆☆

سفیر گل رات کے کھانے کے بعد آرام سے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ وہ حیران تھا کہ طویل سفر سے لوٹتے ہی اس کی اچھی بھلی سمجھدار بیوی نے دیوانوں کی طرح اپنے باپ کے گھر جانے کی رٹ لگادی تھی۔ یہ سوچے بغیر کہ وہ ایک لمبے سفر سے لوٹا ہے۔ ضد بھی ایسی کہ اسے صبح دوبارہ سفر پر نکلنے کا وعدہ کرنا ہی پڑا۔ اس سے پہلے وہ اسے اکثر تنہا چھوڑ کر جاتا رہا تھا۔ زرین نے کبھی تنہائی کی اس شدت سے شکایت نہیں کی تھی جیسی اس بار کر رہی تھی۔
وہ قہوے کی چھوٹی سی پیالی ہاتھ میں تھامے برتن سمیٹتی اپنی بیوی کے عجیب رویے کو سوچ رہا تھا۔ جب اسے باہر غیر معمولی چھل پہل سنائی دی۔ قبل اس کے، کہ وہ اُٹھ کر جائزہ لیتا...... دروازہ بجنے لگا۔ سورج غروب ہونے کے بعد کسی دشمن دار آدمی کے دروازے پر اس وقت دستک سنائی دینا کوئی اچھے آثار نہیں تھے۔
اس نے دروازے پر پہنچنے سے پہلے لپک کر بندوق اُتار لی۔
''کون ہے؟''
''دروازہ کھولو! ہم بہت دور سے آئے ہیں۔'' سپاٹ انداز میں جواب آیا تو اس نے جھجکتے ہوئے دروازہ تھوڑا سا کھول دیا۔ اگر وہ دشمن ہیں تو یہ معمولی دروازہ ان کی راہ نہیں روک سکتا۔ بہتر تھا ان کا سامنا کیا جاتا۔ اس نے دروازہ کھولا اور ایک پل کو اس کا چہرہ سپید پڑ گیا تھا۔
''کیسے ہو سفیر گل؟ عرف بخت یار! بہت دوڑایا یار!''
اس کا مخاطب سفیر گل تھا مگر تیز برچھی جیسی نگاہ باورچی خانے کے دروازے پر ہراساں کھڑی زرّین پر تھی۔ سفیر گل کا ہاتھ مضبوطی سے بندوق کے دستے پر جم گیا۔
''کس بخت یار کی بات کر رہے ہو حکمت شاہ؟ لگتا ہے اتنا عرصہ انتقام کے شعلوں نے تمہارے دماغ کو بھی جھلسا دیا ہے۔ میرا نام سفیر گل ہے۔'' سفیر گل نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔ ابتدائی صدمے کے بعد وہ اب سنبھل چکا تھا۔
''مجھے ''کسی'' نے بتایا یہ بخت یار کا گھر ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ زرین سمجھ نہیں پائی اس مسکراہٹ میں حزن تھا، غصہ یا پھر دونوں؟ اس کی نگاہ ایک پل کو بھی زرّین سے نہیں ہٹی تھی جو فق چہرے کے ساتھ باورچی خانے کے دروازے کا سہارا لیے کھڑی تھی۔
سفیر گل نے قہقہہ لگایا۔
''میرا کوئی خیرخواہ ہو گا یقیناً۔ جو نہیں چاہتا ہو گا کہ ایک

بے گناہ تمہارے اندھے انتقام کا نشانہ بن جائے۔ اب فضول باتیں چھوڑو حکمت شاہ اور جس کام کے لیے آئے ہو، وہ مکمل کرو لیکن یہاں میرے بیوی بچے کے سامنے نہیں۔ باہر مردوں کی طرح...... برابری کا مقابلہ کرو...... یہ ایک کے سامنے تین والا کام کوئی سید نہیں کرسکتا۔''

سفیر گل نے بندوق کندھے پر لٹکائی اور حکمت شاہ کو سامنے سے ہٹاتا باہر کی جانب قدم بڑھایا۔

''ٹھہرو سفیر گل! تمہارے اس خیر خواہ نے مجھے ایک اور بات بھی سکھائی تھی۔'' اب کی بار وہ کھل کر مسکرایا۔

''دشمن کے بُرے ارادے کو جان کر بھی اس کی مدد کرنا، دشمنی نکالنے سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ ہمیشہ کے لیے غلام بنالیتا ہے۔'' اس نے بات مکمل کی اور اپنا داہناں ہاتھ آگے بڑھادیا۔

''بدلے کے پیچھے بہت وقت برباد کردیا...... اب اور نہیں، سفیر گل!'' میں تم سے دشمنی ختم کرنے آیا ہوں۔ کر ارادہ تو دوستی کرنے کا تھا مگر ابھی تک اپنے گھر والوں کی لاشیں بھولا نہیں۔ جب بھول جاؤں گا تب دوستی کے لیے ہاتھ بڑھاؤں گا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہتے ہوئے بات مکمل کی۔

سفیر گل نے بے یقینی سے اسے دیکھا اور پھر اس کا آگے بڑھا ہوا ہاتھ جھٹکتے ہوئے اس کے گلے سے جالگا۔

''حکمت شاہ! تمہارے اندر واقعی سونے کا دل ہے۔ تم نے ثابت کیا کہ تمہارے اندر شاہوں کا خون ہے۔ تم دوستی کرو نہ کرو، میں آج سے تمہیں دوست ہی سمجھوں گا۔''

سفیر گل نے چمکتی آنکھوں سے حکمت شاہ کو دونوں بازوؤں میں دبوچے اپنی بات مکمل کی تو کافی دیر سے خود پر ضبط کے پہرے بٹھائے، فق چہرہ لیے، دہلیز کے سہارے کھڑی زرّین کے سینے سے ایک گہری سانس اور آنکھ کے کنارے اٹکا آنسو ایک ساتھ نکلے۔

اس نے کٹورے میں رکھے پھول کی جانب دیکھا تو جیسے مرجھایا ہوا پھول بھی دوبارہ سے کھل اُٹھا۔ تب ہی اس کی نگاہ حکمت شاہ پر پڑی۔

سفیر کے گلے سے لگا نیلی آنکھوں میں رنج سموئے اسی پھول کو دیکھ رہا تھا۔

☆☆☆

رزق حرام

''حرام کماتا ہے۔ تبھی تو دیکھو بیوی مسلسل بیمار ہے۔''

نسیم سیٹھ دکان پہ آئے ہوئے ایک جاننے والے کو اپنے رشتے دار کے متعلق بتا رہے تھے۔

''ہاں نسیم بھائی! صحیح کہہ رہے ہو۔ اتنی جلدی کون بھلا گھر بناتا ہے آج کل...... اور تو اور ساری بیٹیاں بھی نمٹادیں۔''

''ہاں بھئی اب جیسا کماؤ گے ویسے ہی نکلے گا۔''

''بالکل ٹھیک کہا۔''

''اچھا پھر میں چلتا ہوں آفس جانا ہے۔''

''آفس کون سے...... آپ ابھی تک ریٹائر نہیں ہوئے۔''

ارے صرف تنخواہ لینے جاتا ہوں مہینے میں ایک بار...... وہاں سیٹنگ کی ہوئی ہے اکاونٹنٹ اور مینیجر سے۔ انھیں ان کا حصہ پہنچادیتے ہیں اور ہماری حاضری لگ جاتی ہے۔ باقی دکان سے تو ''رزق حلال'' اپنا چل ہی رہا ہے......

اچھا میاں اب اجازت دیر ہورہی ہے۔''

(فیضان متین)

☆☆☆

شاپنگ!

یہ ایسا ہنر ہے جو ہر ایک کے بس کی بات نہیں

ڈاکٹر محمد وسیم اکبر شیخ

خریداری ہر شخص کے لیے دلچسپی کا باعث ہوتی ہے۔ خریداروں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے دکاندار اور اشتہاری کمپنیاں نت نئے طریقے اختیار کرتی ہیں۔ لوگ میڈیا پر اشتہار دیکھ کر مارکیٹ کا رُخ کرتے ہیں۔ آن لائن شاپنگ نے بھی خریداروں کے لیے بہت سی سہولیات فراہم کردی ہیں۔ لوگ گھر بیٹھے مطلوبہ اشیاء کی خریداری کرلیتے ہیں۔

بازار میں دکانیں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک وہ جہاں ہر شے کی قیمت مقرر ہوتی ہے اور لوگ بلاتردد اشیاء خرید لیتے ہیں، مثلاً میڈیسن، پولٹری، موبائل، سٹیشنری، کتب، پیزا شاپ اور کیش اینڈ کیری کی دکانیں۔ دوسری قسم وہ جہاں گاہک سے اصل قیمت چھپالی جاتی اور گاہک، دکاندار سے کافی بحث مباحثہ، جوڑ توڑ اور قیمتی وقت برباد کرنے کے بعد مطلوبہ چیز حاصل کرسکتا ہے۔ مثلاً کلاتھ ہاؤس، شوز سٹور، سپیئر پارٹس، ڈیکوریشن کا سامان اور فرنیچر وغیرہ کی دکانیں۔

بڑے شاپنگ مال پر تو یہ مسئلہ اتنا پیچیدہ نہیں لیکن چھوٹے شہروں کے چھوٹے دکاندار معصوم گاہکوں اور خواتین سے بہت زیادہ منافع کمالیتے ہیں، جس کی وجہ سے گاہک اور دکاندار میں تلخ کلامی بھی سامنے آتی ہے۔

ایک چینی کہاوت ہے کہ جو شخص خوش اخلاق نہیں اُسے دُکان نہیں کھولنی چاہیے، یعنی دکانداری کے لیے پہلی شرط گاہک سے حُسن سلوک اور شفقت آمیز رویہ ہے۔ غصیلے، چڑچڑے، طعنے باز اور کڑوی گفتگو کرنے والے دکاندار بہت جلد اپنا کاروبار ٹھپ کر بیٹھتے ہیں۔

ایک شہد فروخت کرنے والے کی بیوی نے دوسرے شہد فروخت کرنے والے کی بیوی سے پوچھا کہ آخر کیا وجہ ہے میرے خاوند کا شہد فروخت نہیں ہوتا جبکہ تیرے خاوند کا شہد بہت فروخت ہوتا ہے۔ دوسری جواب دیتی ہے کہ میٹھا شہد فروخت کرنے کے لیے میٹھی زبان کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ تیسرے خاوند کی کڑوی باتوں اور طنزیہ گفتگو کی وجہ سے میٹھا شہد بھی گاہکوں کو کڑوا لگتا ہے۔ تیرے خاوند کی بدمزاجی کی وجہ سے کاروبار ترقی نہیں کررہا۔ (حکایت شیخ سعدیؒ)

دکاندار کئی قسم کے ہوتے ہیں، چالاک و چرب زبان، سُست و کاہل، دھوکے باز، قسم اٹھانے والے جھوٹے، سخی اور کشادہ دل، خوش اخلاق اور مہربان، لٹیرے اور جعلساز، خاموش طبع۔ ہر دکاندار کا کام نفع کمانا ہے۔ دکاندار گاہک کی شخصیت، نفسیات اور حرکات سے اندازہ لگالیتے ہیں کہ یہ گاہک ''ونڈو شاپنگ'' کے لیے آیا ہے یا واقعی کچھ خریدنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ جو دکاندار دیانتداری سے تجارت نہیں کرتے وہ بہت جلد

بے برکتی کا شکار ہو کر کاروبار ختم کر جاتے اور جو محنت، دیانت اور خوش اخلاقی سے کام لیتے، اپنے مال پر زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، ان کے کام میں برکت پیدا ہوتی اور وہ چند سالوں میں کئی اور دکانیں بھی خرید لیتے ہیں۔ اکثر دکاندار ''خریدا ہوا مال واپس نہیں ہوگا'' کا بورڈ لگاتے ہیں، اس سے صاف ظاہر ہے کہ مال ناقص اور زیادہ قیمت پر فروخت کیا گیا، ورنہ غیر استعمال شدہ اور سیل لگے ہوئے سامان کو دنیا بھر میں رسید دکھا کر واپس کیا جاسکتا ہے۔

پاکستان میں بارگیننگ یعنی مول تول ایک بڑا مسئلہ ہے۔ دکاندار آٹھ سو کا جوڑا بالآخر مغز ماری کرنے کے بعد پانچ سو میں دے دیتا ہے۔ آخر کیوں؟ اس نامناسب رویے کی وجہ سے کئی شرمیلے گاہک لُٹ جاتے نیز یہ رویہ وقت ضائع کرتا ہے۔ دکاندار کو چاہیے کہ وہ مناسب منافع کے ساتھ ہر چیز کا ریٹ مقرر کر دے تاکہ اُسے اور گاہک، دونوں کو آسانی ہو۔ ایک دفعہ میں صبح دس بجے انارکلی بازار لاہور میں خریداری کر رہا تھا۔ میں نے ایک دُکاندار سے پوچھا کہ یہ بریف کیس کتنے کا ہے؟ اُس نے کہا: ''1600 روپے کا''۔ تھوڑی دیر میں کہنے لگا اچھا پندرہ سو دے دیں۔ میں خاموش کھڑا دوسرے بریف کیس دیکھ رہا تھا۔ نجانے دکاندار کو کیسی جلدی تھی۔ کہنے لگا اگر خریدنا ہے تو بارہ سو میں مل جائے گا اور یہ آخری ریٹ ہے۔ ابھی باقی دکانیں نہیں کھلی تھیں۔ میں نے کہا کہ ابھی مجھے دیگر اشیاء خریدنی ہیں۔ اگر آگے یہ مجھے 1200 روپے سے کم میں مل گیا تو لے لوں گا ورنہ واپسی پر ہی اُٹھا لوں گا۔ دکاندار بولا لیکن واپسی پر یہ آپ کو اس ریٹ پر نہیں ملے گا۔ لینا ہے تو ابھی 1200 دے جائیں۔ مجھے تو پہلے ہی دُکاندار پر شک تھا کہ اُس نے میرے اصرار کے بغیر ہی چار سو کی رعایت کر دی۔ میں نے وہاں سے نکلنے میں عافیت سمجھی۔ اگلی دکانوں پر وہی بریف کیس سات آٹھ سو میں مل رہا تھا۔ ایک دکاندار نے چھے سو روپے میں دے دیا۔ مقصد یہ ہے کہ دکانداروں کو لوٹ مار کا رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ صبح صبح بہت اہتمام سے کاروبار میں برکت کی غرض سے تلاوتِ کلام پاک کی کیسٹ بھی لگی ہوتی ہے اور ساتھ ہی جھوٹ کا کاروبار بھی زور و شور سے شروع ہو جاتا ہے۔

یہ ہمارے چھوٹے دکانداروں کا رویہ ہے جس سے روزانہ گاہکوں کو واسطہ پڑتا ہے۔ دوسری طرف غیر مسلم بڑی بڑی ملٹی نیشنل کمپنیاں نہایت دیانتداری سے کاروبار کرتی ہیں۔ ہر چیز سیل بند اور ان کی قیمت فکس ہوتی ہے۔ یہ منی بیک گارنٹی اور ایک سال کی وارنٹی پر فروخت کی جاتی ہیں۔ ٹیلی ویژن پر ان کے اشتہارات دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ استعمال شدہ چیزیں بھی واپس لے لیتے اور پسند نہ آنے کی صورت میں 15 دن کے اندر چیز تبدیل بھی کر دیتے ہیں۔ غرض اُن کا مقصد گاہک کی خوشنودی اور اعتماد حاصل کرنا جبکہ ہمارے ہاں مقصد گاہک کی جیب کُترنا ہوتا ہے۔ اُدھار کھاتا ہر دکاندار کی جان کا عذاب ہے۔ گاہک اُدھار لے جاتے اور دکاندار بے چارہ اس اُمید پر اُدھار دیتا کہ اگلے مہینے رقم مل جائے گی لیکن اکثر گاہک دوبارہ اُس دکان پر نہیں آتے۔ یہ ایک نامناسب رویہ ہی نہیں گاہک کی طرف سے حرام خوری کا فعل ہے کہ ایک تو دکاندار نے احسان کیا دوسرے اُس کی رقم ہضم کر لی گئی۔

بہت کم ایسی دکانیں ہوتی ہیں جہاں ''ایک دام ایک کلام'' کا بورڈ لگایا گیا ہو، کیونکہ دکانداروں کا کہنا ہے کہ اگر ہم صحیح دام بتائیں تو گاہک پھر بھی رعایت پر اصرار کرتے ہیں۔ یعنی صورت حال یہ ہے کہ دکاندار اور گاہک کے درمیان اعتماد کا رشتہ ختم ہو چکا۔ گلی گلی کراکری اور پلاسٹک کا سامان فروخت کرنے والے بھی گھریلو خواتین کو مہنگے داموں اشیاء فروخت کر جاتے ہیں۔

دکانداروں کو چاہیے کہ تجارت اور لین دین میں دیانتداری اپنائیں۔ جھوٹ اور دھوکا دہی سے گاہک کا اعتماد مجروح نہ کریں۔ ہر گاہک کے لیے قیمت ایک ہی ہونی چاہیے۔ غیر معیاری اور زائد المعیاد اشیاء کی فروخت سے گریز کرنا چاہیے۔ غیر استعمال شدہ چیزوں کی واپسی کو یقینی بنانا چاہیے۔ گاہک کا اعتماد ہی دکاندار کی کمائی ہے کیونکہ دُنیا میں صرف نیک نام لوگ ہی کامیاب ہوتے ہیں۔ ◆◆◆